ایلف شفق

چالیس چراغ عشق کے

کہانی جلال الدین رومی کی

The Forty Rules of Love

چالیس چراغ عشق کے

کہانی جلال الدین رومی کی

ایلف شفق

مترجم: ہما انور

جُمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

• نام کتاب۔ چالیس چراغ عشق کے • مصنف۔ ایلف شفق
• مترجم۔ ہما انور • اشاعت۔ 2017ء
• ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور • جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN:978-969-652-067-2

قیمت 880 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرون پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Chalees Charagh Ishq Ke

Jumhoori Publications
2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan
T: +92-42-36314140 F: +92-42-36283098
info@jumhooripublications.com
www.jumhooripublications.com

Elif Shafak

The Forty Rules of Love (Aşk)

Urdu Translation "Chalees Charagh Ishq Ke"
by Huma Anwar
Published by Jumhoori Publications - Pakistan
January 2017

Publisher : Farrukh Sohail Goindi

ایلف شفق

ایلف شفق (Elif Şafak) سٹراسبرگ، فرانس میں 1971ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کا شمار ترکی کے سرکردہ ادیبوں میں ہوتا ہے اور وہ اپنی کہانیوں میں پیش کردہ مشرق اور مغرب کے خوب صورت امتزاج کے باعث اب دنیا بھر میں معروف ہیں۔ ناقدین کے مطابق، وہ ہم عصر ترکی ادب اور عالمی ادب میں ایک جداگانہ آواز ہیں۔ ترکی اور انگریزی دونوں زبانوں کو ذریعۂ اظہار بنانے والی ایلف شفق، خبرترک (Haberturk)، گارڈین، وال سٹریٹ جرنل، نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن ٹائمز سمیت کئی جرائد اور اخبارات میں باقاعدگی سے مضامین بھی تحریر کرتی ہیں۔ وہ سیاسی تبصرہ نگار اور پبلک سپیکر بھی ہیں۔ 47 سے زائد ممالک میں ان کی کتابوں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی اب تک 15 کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے 10 ناول ہیں۔ مڈل ایسٹ یونیورسٹی سے انٹرنیشنل ریلیشنز میں گریجویشن کے بعد انہوں نے سیاسیات میں پی ایچ ڈی کی۔ وہ ترکی، انگلینڈ اور امریکہ کی مختلف درسگاہوں میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتی آرہی ہیں۔

ایلف شفق کے پہلے ناول "Pinhan" کو 1998ء میں رومی پرائز سے نوازا گیا، یہ انعام ترکی میں بہترین صوفیانہ ادب کی تخلیق پر دیا جاتا ہے۔ اپنے ناول "Mahrem" اور اس کے بعد خاص طور پر "The Forty Rules of Love" پر انہیں عالمی سطح پر شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی تحریروں کا موضوع خواتین، اقلیتیں، تارکین وطن اور ان کے مسائل، متنوع ثقافتیں، ثقافتی سیاست، تاریخ، فلسفہ اور خصوصاً صوفی ازم رہے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں حقوقِ نسواں، شناخت اور آزادیٔ اظہار کی داعی ہیں۔

''چالیس چراغ عشق کے'' ان کے ناول "The Forty Rules of Love" کا اردو ترجمہ ہے جو ترکی زبان میں "Aşk" کے نام سے لکھا گیا تھا۔ ناول کی کہانی صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی اور صوفی درویش شمس تبریز کے گرد گھومتی ہے۔ ایلف شفق کے ناول "Honour" کا اردو ترجمہ ''ناموس'' کے نام سے جمہوری پبلیکیشنز سے شائع ہو چکا ہے۔

The Forty Rules of Love,
Winner of Prix ALEF - Mention Spéciale Littérature Etrangère, France 2011

ظاہرا ور زیلڈا کے نام

اپنے بچپن میں، مَیں نے خدا کو دیکھا،
مجھے فرشتے دکھائی دئیے،
میں نے ارفع اور پست جہانوں کے اسرار کھلتے دیکھے۔
میں سمجھتا تھا کہ تمام انسان ہی یہ سب کچھ دیکھتے ہیں۔
لیکن آخرکار مجھے ادراک ہوا کہ سب انسان ایسی نگاہ نہیں رکھتے...

شمس تبریز

فہرست

ابتدائیہ

اپنی انگلیوں میں پتھر تھام کر آپ اُسے بہتے پانی میں پھینک دیتے ہیں۔اس کا اثر آسانی سے دکھائی نہیں دے گا۔پتھر جہاں پانی کی سطح سے ٹکراتا ہے، وہاں چھوٹی چھوٹی لہروں کے ہلکورے نمودار ہوں گے اور پھر چھپاکے کی آواز، دریا کے بہاؤ کا تیز شور جس کا دم گھونٹ دے گا۔اور بس! اُسی پتھر کو جھیل میں اُچھالیں، اس کا اثر نہ صرف دکھائی دے گا بلکہ کافی دیر تک باقی رہے گا۔پتھر ساکت پانیوں کو منتشر کر کے رکھ دے گا۔پتھر جہاں پانی سے ٹکرائے گا، وہاں ایک دائرہ بنے گا اور پھر لحظے بھر میں وہ دائرہ در دائرہ پھیلتا چلا جائے گا۔زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اس غڑاپ سے بننے والے ہلکورے پھیلتے چلے جائیں گے اور پھر وہ پانی کی سطح پر ہر جگہ محسوس کیے جاسکیں گے۔یہ دائرے ساحل سے ٹکرا کر ہی تھم سکیں گے اور ختم ہوں گے۔

اگر پتھر کسی دریا کی سطح سے ٹکراتا ہے تو دریا اپنے متلاطم بہاؤ میں اسے تند و تیز شور کا ہی حصہ سمجھتا ہے۔کچھ بھی غیر معمولی نہیں۔کچھ بھی بے مہار یا منہ زور اور سرکش نہیں۔لیکن اگر وہی پتھر جھیل کی سطح سے ٹکرائے تو جھیل کبھی بھی پہلے جیسی نہ رہے گی۔

چالیس برس تک ایلا روبن سٹین (Ella Rubinstein) کی زندگی ساکن پانیوں جیسی رہی تھی۔ عادتوں، ضروریات اور ترجیحات کا ایک لگا بندھا سلسلہ۔اگرچہ وہ زندگی کئی طرح سے یکسانیت بھری اور عام تھی مگر وہ اُسے تھکا دینے والی نہ لگتی تھی۔

پچھلے بیس برس سے ہر خواہش جو اُس نے کی، ہر شخص جسے اُس نے دوست بنایا اور ہر فیصلہ جو اُس نے کیا، وہ اُس کی شادی سے فلٹر ہو کر گزرا تھا۔اُس کا شوہر ڈیوڈ ایک کامیاب ڈینٹسٹ تھا جس نے بڑی محنت کی اور بہت دولت کمائی۔وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ ان کا رشتہ کسی گہری سطح پر گہری نوعیت کا نہیں تھا مگر پھر وہ سوچتی کہ ایسا جذباتی تعلق رکھنا شادی شدہ جوڑوں کی زندگی میں ترجیح ہوتا بھی نہیں، خصوصاً ایسے مرد اور عورت کے لیے جن کی شادی کو ایک عرصہ بیت چکا ہو۔شادی میں عشق اور محبت سے بڑھ کر اہم چیزیں ہوتی ہیں، جیسا کہ ذہنی ہم آہنگی، ایک دوسرے کا خیال رکھنا، الفت، دردمندی اور سب سے بڑھ

کر ایک ربانی عمل جو کوئی شخص کر سکتا ہے، یعنی معاف کرنا۔ محبت اِن سب میں ثانوی تھی۔ یعنی یہاں تک کہ کوئی ناولوں یا رومانوی فلموں کی دنیا میں بستا ہو جہاں بنیادی کردار ہمیشہ عام زندگی سے بڑھ چڑھ کر متاثر کن ہوتے تھے اور اُن کی محبت کسی داستانوی محبت سے کم نہیں ہوتی۔

ایلا کی ترجیحات کی فہرست میں اُس کے بچے سب سے اوپر تھے۔ اُن کی خوب صورت بیٹی جینٹ (Jeannette) کالج میں تھی اور جڑواں بچے اورلی (Orly) اور ایوی (Avi) ٹین ایجر تھے۔ ان کا بارہ سالہ سنہری شکاری کتا سپرٹ (Spirit) بھی تھا جو صبح کی سیر میں ایلا کا رفیق رہتا تھا اور اپنے بچپن سے ایلا کا زندہ دل دوست تھا۔ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا، اس کا وزن بڑھ چکا تھا، وہ بالکل بہرہ اور تقریباً نابینا تھا۔

سپرٹ کے رخصت ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا مگر ایلا یہ سوچنے کو ترجیح دیتی کہ وہ سدا اس کے ساتھ ہی رہے گا۔ پھر وہی سب، وہ ایسی ہی تھی۔ اس نے کبھی کسی بھی شے، چاہے وہ کوئی عادت تھی یا کوئی مرحلہ یا شادی، اس کے ختم ہونے یا وداع یا موت کا سامنا نہ کیا تھا، چاہے وہ انجام اُس کے بالمقابل ہی کھڑا ہوتا، سادہ اور ناگزیر انجام۔

روبن سٹین خاندان امریکی ریاست میساچوسٹس میں نارتھمپٹن میں ایک بڑے سے وکٹورین گھر میں رہتا تھا، جسے کچھ تزئین کی ضرورت تو تھی مگر پھر بھی وہ شاندار تھا۔ گھر میں پانچ بیڈ روم تھے اور تین باتھ روم، چمکتا چوبی فرش، تین گاڑیوں کے لیے کافی کشادہ گیراج، فرانسیسی دروازے اور سب سے بہترین، کھلی فضا میں جیکوزی (Jacuzzi)، ان کے پاس زندگی کا بیمہ، کار کا بیمہ، ریٹائرمنٹ کے منصوبے، کالج بچت منصوبے، مشترکہ بینک اکاؤنٹس اور جس گھر میں وہ رہ رہے تھے، اُس کے ساتھ ساتھ دو اعلیٰ درجے کے اپارٹمنٹس بھی تھے، ایک بوسٹن میں اور دوسرا رہوڈز جزیرے پر۔ اس سب کے لیے ڈیوڈ اور اُس نے شدید محنت کی تھی۔ بچوں، خوب صورت فرنیچر اور گھر کی بنی پائی کی فضا میں تیرتی مہک والا ایک بڑا اور چہل پہل بھرا گھر کچھ لوگوں کو ایک کلیشے، کوئی فرسودہ پٹی ہوئی بات لگے گا مگر اُن کے نزدیک یہ مثالی زندگی کی تصویر تھا۔ اُن کی شادی اس مشترکہ خواب کے گرد ہی پروان چڑھی تھی اور انہوں نے اگر سب نہیں تو اپنے بیشتر خوابوں کی تعبیر پالی تھی۔

گزشتہ ویلنٹائن ڈے پر اُس کے شوہر نے اُسے تحفے میں دل کی شکل والا ہیرے کا ہار اور ایک کارڈ دیا تھا جس پر تحریر تھا:

میری پیاری ایلا کے لیے،

خاموش انداز، کشادہ دل اور کسی درویش کے سے صبر والی عورت۔ میں جیسا ہوں ویسے ہی مجھے قبول کرنے کا شکریہ۔ میری بیوی بننے کا شکریہ۔

تمہارا

ڈیوڈ

ایلا نے ڈیوڈ کے سامنے کبھی بھی اس کا اعتراف نہ کیا لیکن اُس کا کارڈ پڑھتے ہوئے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی تعزیت نامہ پڑھ رہی ہو۔ میرے مرنے پر لوگ میرے بارے میں یہی کچھ لکھیں گے، اُس نے سوچا تھا۔ اور اگر وہ مخلص ہوئے تو مزید یہ اضافہ بھی کر سکتے تھے: اپنی تمام زندگی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ گزارتے ہوئے ایلا میں ایسی کوئی بچاؤ کی تکنیک نہ رہی تھی کہ وہ زندگی کی مشکلوں سے خود اپنے بل بوتے پر نمٹ سکے۔ وہ بے پرواہ قسم کی یا زندگی میں رسک لینے والی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ اپنی معمول کی کافی برانڈ بدلنے سے بھی اسے بڑا فرق پڑتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب ایلا نے 2008ء کے موسم خزاں میں اپنی شادی کے بیس سال بعد طلاق کے لیے رجوع کیا، تو ایلا سمیت کوئی بھی وضاحت نہ کر سکا کہ ہو کیا رہا تھا۔

☼

لیکن اس کا سبب موجود تھا: محبت۔

وہ ایک شہر میں نہیں رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک براعظم میں بھی نہیں۔ دونوں میں نہ صرف میلوں کا زمینی فاصلہ تھا بلکہ دن اور رات کا فرق بھی۔ اُن کے طرزِ زندگی اس قدر جدا تھے کہ ناممکن لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی موجودگی کو ہی برداشت کر پائیں، کہاں کہ محبت میں گرفتار ہو جانا۔ لیکن ایسا ہوا۔ اور یہ اس قدر تیز رفتاری سے ہوا، درحقیقت اتنی تیزی سے کہ ایلا کو یہ سمجھنے کا وقت ہی نہ مل سکا کہ ہو کیا رہا تھا اور یہ کہ وہ ہوشیار ہو جاتی، اگر محبت کے روبرو محتاط یا ہوشیار ہوا جا سکتا ہے تو۔ محبت ایلا پر اتنی اچانک اور منہ زوری سے طاری ہوئی جیسے نہ جانے کہاں سے کوئی پتھر یکایک اُس کی زندگی کے ساکن تالاب میں اُچھال دیا گیا ہو۔

ایلا

نارتھمپٹن، 17 مئی 2008ء

موسم بہار کے اس خنک دن اُس کے کچن کی کھڑکی کے باہر پرندے چہچہا رہے تھے۔ اس کے بعد ایلا نے وہ منظر اپنے ذہن میں اتنی بار دہرایا کہ یوں محسوس ہوا جیسے وہ ماضی کے کسی حصے کی بجائے ایک جاری لمحہ تھا جو ابھی بھی کائنات میں کہیں مسلسل رونما ہو رہا تھا۔

وہاں تھے وہ، ہفتے کی سہ پہر میز کے گرد بیٹھے، ذرا تاخیر سے دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے۔ اُس کا شوہر اپنی پسندیدہ فرائیڈ چکن لیگز سے اپنی پلیٹ بھر رہا تھا۔ ایوی کسی ڈرم سٹک کی طرح اپنے چمچ کانٹے سے کھیل رہا تھا جب کہ اُس کی جڑواں بہن اورلی یہ حساب لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کس کھانے کے کتنے لقمے کھا سکتی تھی تاکہ روزانہ کی 650 کیلوریز خوراک کے مطابق اس کی ڈائٹ برباد نہ ہو۔ جینٹ جو قریبی ماؤنٹ ہولیوک کالج (Mount Holyoke College) کی پہلے سال کی طالبہ تھی، بریڈ سلائس پر کریم چیز پھیلاتے ہوئے اپنے خیالوں میں مگن دکھائی دی۔ میز پر آنٹی ایستھر بھی موجود تھیں، جو اپنے مشہور ماربل کیک کے ساتھ آئی تھیں اور پھر دوپہر کے کھانے تک رک گئی تھیں۔ ایلا کو بعد میں کافی کام نمٹانے تھے مگر وہ ابھی میز سے اٹھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ کچھ عرصے سے ایسا اکثر نہیں ہوتا تھا کہ گھر بھر اکٹھا ہو کر کھانے کے لیے میز پر بیٹھے اور اُسے یہ سب کے مل بیٹھنے کا سنہری موقع لگا تھا۔

''ایستھر، کیا ایلا نے تمہیں خوش خبری سنائی؟'' ڈیوڈ نے اچانک پوچھا، ''اسے بڑی اچھی نوکری مل گئی ہے۔''

اگرچہ ایلا نے انگریزی ادب میں گریجویشن کی تھی اور اُسے فکشن بے حد پسند تھی، لیکن اُس نے کالج کے بعد اس میدان میں زیادہ کچھ نہ کیا تھا، سوائے خواتین کے میگزینوں کی چھوٹی موٹی تحریروں کی ادارت، چند بک کلبس میں شرکت اور کبھی کبھار مقامی اخباروں کے لیے کتابوں پر تبصرے لکھنے کے۔ بس۔ ایک وقت تھا کہ وہ کتابوں کی کوئی ممتاز نقاد بننا چاہتی تھی لیکن پھر اُس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ

زندگی اُسے تین بچوں کی ماں اور نہ ختم ہونے والی گھریلو ذمے داریوں کے ساتھ ایک محنتی سی خاتون خانہ میں بدلتے ہوئے، اسے کہیں اور لے آئی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ اُسے کوئی شکایت ہو۔ ایک ماں، ایک بیوی، پالتو کتے کے ہمراہ سیر کرنے والی اور گھر سنبھالنے والی خاتون کے طور پر وہ خاصی مصروف رہتی تھی۔ اگرچہ سمتھ کالج کی اُس کی کسی بھی حقوقِ نسواں کی حامی دوست کو اُس کا یہ انتخاب پسند نہ آیا تھا، مگر وہ گھر پر رہنے والی ماں کے طور پر خوش اور شکر گزار تھی کہ وہ اور اس کا شوہر اس کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس نے کتابوں سے اپنے عشق کو کبھی ترک نہ کیا تھا اور اب بھی خود کو ایک شوقین قاری سمجھتی تھی۔

چند برس پہلے، حالات بدلنے لگے۔ بچے بڑے ہو رہے تھے اور انہوں نے واضح کر دیا کہ انہیں اب ماں کی ویسی ضرورت نہ تھی جیسی کبھی ہوا کرتی تھی۔ یہ جان کر کہ اب اُس کے پاس خاصا فارغ وقت تھا اور ایسا کوئی نہ تھا جس کے ساتھ وہ اسے بانٹ سکتی، ایلا نے سوچا تھا کہ کوئی نوکری ڈھونڈنا خوب رہے گا۔ ڈیوڈ نے اُس کی حوصلہ افزائی کی تھی مگر اگرچہ وہ اس بارے میں باتیں کرتے رہے، اُس نے اپنی راہ میں آنے والے مواقع سے کم ہی فائدہ اٹھایا اور جب ایسا کیا بھی تو ممکنہ ملازمت دینے والے ہمیشہ کسی نوجوان یا پھر زیادہ تجربہ کار ملازم کی تلاش میں ہوتے تھے۔ بار بار مسترد ہونے سے خائف ہو کر اُس نے اس موضوع کو ہی ترک کر دیا۔

اس کے باوجود، ان برسوں میں اُس کی نوکری کی تلاش میں جو بھی رکاوٹ حائل رہی تھی، وہ مئی 2008ء میں ختم ہو گئی۔ اپنی چالیسویں سالگرہ سے دو ہفتے پہلے اُس نے خود کو بوسٹن کی ایک لٹریری ایجنسی کے لیے کام کرتے پایا۔ اس کے لیے یہ نوکری اُس کے شوہر نے اپنے کسی کلائنٹ کے ذریعے تلاش کی تھی ... یا شاید اپنی کسی محبوبہ کے ذریعے۔

''اوہ، یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' ایلا نے اب جلدی سے وضاحت کی۔ ''میں ایک لٹریری ایجنٹ کی جز وقتی ریڈر رہوں بس۔''

لیکن ڈیوڈ پُرعزم دکھائی دیا کہ وہ اپنی نئی نوکری کو کمتر نہ سمجھے۔ ''چھوڑو بھی، انہیں بتاؤ کہ وہ ایک معروف ایجنسی ہے۔'' اُس نے اُسے ٹہوکا دیتے ہوئے اکسایا اور جب ایلا نے اس کی بات کی تعمیل نہ کی تو اُس نے بہ خوشی اپنی بات سے خود ہی اتفاق کیا۔ ''وہ ایک باوقار مشہور جگہ ہے ایستھر۔ تمہیں دوسرے اسسٹنٹ سے بھی ملنا چاہیے! بہترین کالجوں سے تازہ تازہ نکلے لڑکے اور لڑکیاں۔ ایلا واحد ہے جو برسوں ہاؤس وائف رہنے کے بعد دوبارہ کام کے لیے جا رہی ہے۔ اب بتاؤ، کیا یہ بات خاص نہیں؟''

ایلا کو حیرت ہوئی کہ آیا اپنے اندر گہرائی میں اُس کا شوہر اسے کیریئر بنانے سے دور رکھنے پر احساسِ جرم کا شکار تھا یا پھر اُس سے بے وفائی کرنے پر.... یہی دو وضاحتیں ہو سکتی تھیں جو وہ سوچ سکی کہ وہ اب اتنے جوش و خروش سے کیوں بھرا ہوا تھا۔

ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے بات ختم کی،'' یہی ہے جسے میں جرأت مندی کہتا ہوں۔ ہم سب کو اس پر فخر ہے۔''

''یہ تو ایک نعمت ہے۔ ہمیشہ سے تھی۔'' آنٹی ایستھر نے ایسے جذباتی لہجے میں کہا کہ یوں لگا جیسے ایلا میز پر موجود نہ تھی اور دنیا سے گزر چکی تھی۔

اُن سب نے اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ حتیٰ کہ ایوی نے بھی کوئی منہ پھٹ تبصرہ نہ کیا اور اورلی پہلی بار اپنی Looks کے سوا کسی شے کی پرواہ کرتی دکھائی دی۔ ایلا نے خود پر جبر کیا کہ وہ اس مہربانی بھرے لمحے کی قدر کرے مگر اُسے خود پر تھکن طاری ہوتی محسوس ہوئی جس کا تجربہ اُسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُس نے چپکے سے دعا کی کہ کوئی اس موضوع کو بدل دے۔

اُس کی بڑی بیٹی جینیٹ نے ضرور اس کے دل سے نکلتی یہ بات سن لی ہو گی کیوں کہ وہ اچانک چہک کر بولی،'' میرے پاس بھی ایک خوش خبری ہے۔''

کسی امید سے چمکتے سب چہروں کا رخ اُس کی طرف گھوم گیا۔

''سکاٹ اور میں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔'' جینیٹ نے اعلان کیا۔'' اوہ، مجھے معلوم ہے کہ آپ سب کیا کہیں گے! یہ کہ ابھی ہمارا کالج مکمل نہیں ہوا اور یہی کچھ۔ لیکن آپ کو سمجھنا ہو گا، ہم دونوں یہ بڑا قدم اٹھانے کے لیے خود کو تیار محسوس کرتے ہیں۔''

وہ گرم جوشی جو لمحہ بھر پہلے اُن پر سایہ فگن تھی، اُس کے تحلیل ہوتے ہی کچن کی میز پر ایک بے ڈھنگی سی خاموشی اتر آئی۔ اورلی اور ایوی نے ایک دوسرے کو خالی نگاہوں سے دیکھا اور آنٹی ایستھر سیب کے جوس کے گلاس کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیے جیسے جم کر رہ گئیں۔ ڈیوڈ نے کانٹا پرے رکھ دیا جیسے اُسے بالکل بھوک نہ رہی تھی اور ہلکی بھوری آنکھیں سکیڑ کر جینیٹ کی طرف دیکھا جن کے گوشوں پر مسکراتے رہنے سے لکیریں سی پڑ چکی تھیں۔ تاہم، اس وقت وہ بہرحال مسکرا نہیں رہا تھا۔ اُس کا منہ یوں بسورا ہوا تھا جیسے اُس نے ابھی ابھی ترش سرکے کا گھونٹ بھر لیا ہو۔

''بہت خوب! مجھے آپ سے توقع تھی کہ میری خوشی بانٹیں گے مگر اس کی بجائے مجھے یہ سرد رویہ مل رہا ہے۔'' جینیٹ نے شکایت کی۔

''تم نے ابھی کہا کہ تم شادی کرنے جا رہی ہو۔'' ڈیوڈ نے یوں کہا جیسے جینیٹ نہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہہ چکی تھی اور اب اُسے مطلع کرنے کی ضرورت تھی۔

''ڈیڈ، میں جانتی ہوں کہ یہ ذرا جلدی لگتی ہے لیکن گزشتہ روز سکاٹ نے مجھے شادی کی پیشکش کی تھی اور میں پہلے ہی ہاں کہہ چکی ہوں۔''

''لیکن کیوں؟'' ایلا نے پوچھا۔

جس طرح سے اُس نے ایلا کو دیکھا، ایلا سمجھ گئی کہ اُس کی بیٹی کو اس قسم کے سوال کی توقع نہ

تھی۔ اس کی بجائے وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ پوچھا جائے: ''کب؟'' اور ''کیسے؟'' بہرصورت اس کا مطلب ہوتا کہ وہ اپنے عروسی لباس کی خریداری شروع کر سکتی تھی۔ ''کیوں؟'' کا سوال ایک بالکل مختلف معاملہ تھا اور اس نے اُسے مکمل طور پر حیرت زدہ کر دیا تھا۔

''کیوں کہ مجھے اُس سے محبت ہے۔ میرا خیال ہے۔'' جینٹ کا لہجہ ذرا دھیما تھا۔

''ہنی، میرا مطلب یہ تھا کہ اتنی جلدی کیوں ہے؟'' ایلا نے اصرار کیا۔ ''کیا تم حاملہ ہو یا ایسا کچھ؟''

آنٹی ایستھر نے اپنی کرسی پر پہلو بدلا، ان کا چہرہ درشت تھا، ان کی بے چینی واضح تھی۔ انہوں نے اپنی جیب سے Antacid (تیزابیت کم کرنے والی دوا) گولی نکالی اور اُسے چبانے لگیں۔

''میں ماموں بننے والا ہوں۔'' ایوی دبی دبی ہنسی ہنستے بولا۔

ایلا نے جینٹ کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے ہولے سے دبایا۔ ''تم ہمیں ہمیشہ سچ بتا سکتی ہو۔ تم جانتی ہو ناں؟ کچھ بھی ہو، ہم سب تمہارے ساتھ کھڑے ہوں گے۔''

''مام، برائے مہربانی کیا آپ بس کریں گی؟'' جینٹ تلملائی اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ''اس کا حمل سے کچھ لینا دینا نہیں۔ آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔''

''میں بس مدد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' ایلا نے سکون سے جواب دیا۔ سکون وہ حالت تھی جس میں تھوڑے عرصے سے رہنا مشکل تر ہو چلا تھا۔

''آپ کا مطلب ہے، میری بے عزتی کر کے۔ بہ ظاہر میرے اور سکاٹ کے شادی کرنے کی واحد وجہ جو آپ کو نظر آتی ہے، یہ ہے کہ میں حاملہ ہو چکی ہوں! کیا آپ کو کبھی خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے... ہو سکتا ہے میں اُس لڑکے سے اس لیے شادی کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے اُس سے محبت ہے؟ ڈیٹنگ کرتے ہوئے ہمیں اب آٹھ ماہ ہو چکے ہیں۔''

اس پر ایلا تمسخر سے بولی، ''اوہ، ہاں، یوں جیسے تم آٹھ ماہ میں کسی مرد کے کردار کا پتا کر سکتی ہو۔ تمہارے باپ اور میری شادی کو تقریباً بیس سال ہو چکے ہیں اور ہم بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ آٹھ ماہ کسی رشتے میں کوئی مدت نہیں!''

''خدا کو یہ پوری کائنات تخلیق کرنے میں صرف چھ روز لگے تھے۔'' ایوی مسکراتے ہوئے بولا مگر میز پر موجود سب لوگوں کی سرد نگاہوں نے اُسے دوبارہ خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔

بڑھتے ہوئے تناؤ کو محسوس کر کے ڈیوڈ جس کی نگاہیں اپنی بڑی بیٹی پر جمی تھیں اور اس کی پیشانی پر کسی خیال پر لکیریں نمودار ہو چکی تھیں، اس نے مداخلت کی، ''ہنی، تمہاری ماں یہ کہنے کی کوشش کر رہی ہے کہ ڈیٹنگ اور بات ہے اور شادی بالکل مختلف چیز۔''

''لیکن ڈیڈ آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم ہمیشہ ڈیٹ ہی کرتے رہیں گے؟'' جینٹ نے پوچھا۔

گہری سانس بھرتے ہوئے ایلا بولی، ''بالکل صاف گوئی سے کہوں تو ہمیں تم سے کسی بہتر انتخاب کی توقع تھی۔ تم ابھی اتنی نوعمر ہو کہ کسی سنجیدہ بندھن میں بندھنے کے قابل نہیں۔''

''آپ کو پتا ہے میں کیا سوچ رہی ہو مام؟'' جینٹ نے اتنے سپاٹ لہجے میں کہا جو پہچاننا مشکل تھا۔ ''مجھے لگ رہا ہے جیسے آپ اپنے اضطراب کو مجھ پر تھوپ رہی ہوں۔ لیکن صرف اس لیے کہ آپ نے نوعمری میں شادی کی اور جب آپ میری عمر کی تھیں تو آپ کی گود میں بچہ آ گیا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بھی وہی غلطی کروں گی۔''

ایلا کا چہرہ یوں سرخ ہو گیا جیسے کسی نے اُسے تھپڑ دے مارا ہو۔ اپنے دل میں کہیں اُسے وہ مشکل حمل یاد تھا جس کے نتیجے میں جینٹ کی وقت سے پہلے پیدائش ہوئی تھی۔ اُس کی بیٹی نے اپنے بچپن میں اُس کی ساری توانائی نچوڑ لی تھی اور یہی وجہ تھی کہ دوبارہ حاملہ ہونے سے پہلے اُس نے چھ سال انتظار کیا تھا۔

''سویٹ ہارٹ، ہم تمہارے لیے خوش تھے جب تم نے سکاٹ سے میل ملاپ شروع کیا۔'' ڈیوڈ نے محتاط انداز میں ایک مختلف حکمتِ عملی آزمانے کی کوشش کرتے کہا، ''وہ اچھا لڑکا ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کہ گریجویشن کے بعد تم کیا سوچو؟ حالات تب بہت مختلف ہو سکتے ہیں۔''

جینٹ نے ہولے سے سر ہلایا جس میں مصنوعی رضامندی کا شائبہ سا تھا۔ پھر وہ بولی، ''کیا اس لیے کہ سکاٹ یہودی نہیں ہے؟''

ڈیوڈ نے بے یقینی کے عالم میں آنکھیں گھمائیں۔ نسل، مذہب یا صنف کے متعلق گھر میں کوئی منفی رائے دینے سے گریز کرنے پر اُسے اپنے کشادہ دل اور مہذب باپ ہونے پر ہمیشہ فخر رہا تھا۔

تاہم، جینٹ درشت دکھائی دی۔ اپنی ماں کی طرف مڑتے ہوئے اُس نے پوچھا، ''کیا آپ میری آنکھوں میں دیکھ کر یہ بتا سکتی ہیں کہ اگر سکاٹ، آرون نامی کوئی نوجوان یہودی ہوتا تو تب بھی آپ یہی اعتراضات کر رہی ہوتیں؟''

جینٹ کے لہجے میں طنز اور تلخی پروئے ہوئے تھے اور ایلا کو خدشہ تھا کہ اس کی بیٹی کے اندر اس کے لہجے سے زیادہ تلخی اور طنز بھر رہے تھے۔

''سویٹ ہارٹ، میں تم سے پوری ایمان داری سے بات کروں گی، چاہے یہ تمہیں پسند نہ آئے۔ میں جانتی ہو کہ نوجوان ہونا اور محبت میں گرفتار ہونا کیسا شان دار محسوس ہوتا ہے۔ میرا یقین کرو، میں سمجھتی ہوں۔ لیکن کسی مختلف پس منظر کے شخص سے شادی کرنا ایک بڑا جوا ہے۔ اور تمہارے ماں باپ کی حیثیت سے ہم یقین دہانی چاہتے ہیں کہ جو کچھ تم کرنے جا رہی ہو، وہ ٹھیک ہو۔''

''اور آپ کو کیسے پتا ہے کہ جو آپ کے نزدیک ٹھیک ہے، وہ میرے لیے ٹھیک ہو گا؟''

اس سوال نے ایلا کو ذرا بجھا دیا۔ اس نے آہ بھری اور اپنی پیشانی کو مسلا، یوں جیسے سر درد

شروع ہونے کو ہو۔

''مجھے اُس سے محبت ہے مام۔ کیا اس بات کی آپ کے نزدیک کوئی اہمیت ہے؟ کیا آپ کو یہ لفظ کہیں سے یاد آتا ہے؟ اُس کی وجہ سے میرا دل تیز تیز دھڑکتا ہے۔ میں اُس کے بغیر جی نہیں سکتی۔''

ایلا نے خود کو بے ساختہ ہنستے سنا۔ اُس کا اپنی بیٹی کے جذبات کا مذاق اڑانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، بالکل بھی نہیں، لیکن شاید اُس کو اُس کے یوں ہنسنے سے ایسا ہی لگا۔ کسی سبب سے جو خود اُس کے لیے نامعلوم تھا، اُسے بے حد گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ جینٹ سے پہلے بھی اس کے جھگڑے ہوئے تھے، سینکڑوں بار، مگر آج ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور سے کسی بڑی بات پر تکرار کر رہی تھی۔

''مام، کیا آپ نے کبھی محبت نہیں کی؟'' جینٹ نے جلدی سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تحقیر کا شائبہ سا تھا۔

''اوہ، چھوڑو بھی! جاگتے میں خواب دیکھنا بند کرو اور حقیقت کی دنیا میں آؤ، سنا؟ تم بہت....''
ایلا کی نظریں کسی ڈرامائی لفظ کی تلاش میں کھڑکی پر جمی رہیں، یہاں تک آخرکار وہ اُسے مل ہی گیا۔
''...بہت رومانٹک ہو رہی ہو!''

''رومانٹک ہونے میں کیا برائی ہے؟'' جینٹ نے پوچھا۔ اُسے جیسے ٹھیس پہنچی تھی۔

واقعی، رومانٹک ہونے میں کیا برائی ہے؟ ایلا نے سوچا۔ وہ رومان پسندی کے بارے میں کب سے اتنی برہم ہونے لگی تھی؟ اپنے دماغ کو پریشان کرتے ان سوالوں کے جواب دینے میں ناقابل، اُس نے بات جاری رکھی، ''چھوڑو بھی ہنی۔ تم کس صدی میں جی رہی ہو؟ اپنے دماغ میں یہ بات بٹھا لو، عورتیں اُن مردوں سے شادی نہیں کرتیں جن سے وہ محبت میں گرفتار ہوں۔ وقت آنے پر وہ ایسے لڑکے کا انتخاب کرتی ہیں جو اچھا باپ اور قابل بھروسا شوہر بنے۔ محبت بس ایک خوش گوار اور شیریں احساس ہے جو طاری ہوتا اور پھر تیزی سے گزرتے زائل ہو جاتا ہے۔''

بات ختم کر کے ایلا اپنے شوہر کی طرف مڑی۔ ڈیوڈ نے اپنے ہاتھ آہستگی سے جیسے پانی پر سے ہوتے ہوئے اپنے سامنے ملا لیے تھے اور اب اُسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ پہلے کبھی اُسے دکھائی نہ دی تھی۔

''میں جانتی ہوں آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟'' جینٹ بولی، ''آپ میری خوشی اور جوانی کی حاسد ہیں۔ آپ مجھے ایک ناخوش ہاؤس وائف بنانا چاہتی ہیں۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ جیسی بن جاؤں، مام۔''

ایلا کو اپنے پیٹ میں ایک عجیب، بیٹھتا ہوا سا احساس ہوا، یوں جیسے وہاں کوئی بھاری پتھر رکھا تھا۔ کیا وہ ایک ناخوش ہاؤس وائف تھی؟ ایک ناکام ہوتی شادی میں پھنسی درمیانی عمر کی ماں؟ کیا اُس کے بچے اُسے ایسا دیکھتے تھے اور اُس کا شوہر، وہ بھی؟ دوست اور ہمسائے کیا سمجھتے تھے؟ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اُس کے آس پاس ہر کوئی اُس پر ترس کھاتا تھا اور یہ شک اس قدر تکلیف دہ تھا کہ وہ ہانپ کر رہ گئی۔

''تمہیں اپنی ماں سے معافی مانگنی چاہیے۔'' ڈیوڈ اپنے چہرے پر تیوری چڑھائے جینٹ کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے کسی معافی کی توقع نہیں۔'' ایلا نے شکستہ دلی سے کہا۔ جینٹ نے اپنی ماں کو استہزائیہ ترچھی نگاہ سے دیکھا۔ اور اسی طرح اُس نے اپنی کرسی پیچھے دھکیلی، نیپکن ایک طرف پھینکا اور کچن سے باہر نکل گئی۔ ایک منٹ بعد اورلی اور ایوی بھی نکل گئے، اپنی بڑی بہن سے خیر سگالی کے غیر معمولی اظہار میں یا پھر اس لیے کہ وہ بڑوں کی اس ساری گفتگو سے بیزار ہو گئے تھے۔ اس کے بعد آنٹی ایستھر جو شدت سے اپنی آخری Antacid گولی چبا رہی تھیں، زیر لب کوئی بودا سا عذر بیان کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

میز پر ڈیوڈ اور ایلا تنہا رہ گئے اور ان کے درمیان فضا میں معلق ایک بے ہنگم سی پریشانی۔ اس پریشانی کا سامنا کرنے پر ایلا کو تکلیف ہوئی جو کہ وہ دونوں جانتے تھے کہ اس کا جینٹ یا اُن کے کسی بچے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

ڈیوڈ نے کانٹا اٹھایا جو پہلے اُس نے ایک طرف رکھ دیا تھا اور کچھ دیر اُس کا جائزہ لیا۔ ''سو کیا مجھے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ تمہیں جس آدمی سے محبت تھی، تم نے اُس سے شادی نہیں کی؟''

''اوہ، پلیز، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''پھر تمہارا کیا مطلب تھا؟'' ڈیوڈ نے اب بھی کانٹے سے بات کرتے ہوئے کہا، ''میں سمجھتا تھا کہ جب ہم نے شادی کی، تمہیں مجھ سے محبت تھی۔''

''میں تمہاری محبت میں گرفتار تھی۔'' ایلا نے کہا مگر پھر وہ مزید یہ کہنے سے رک نہ پائی۔ ''تب۔''

''سو تم نے مجھ سے محبت کرنا کب چھوڑی؟'' جذبات سے عاری لہجے میں ڈیوڈ نے پوچھا۔

ایلا نے اپنے شوہر کو تعجب سے دیکھا، کسی ایسے شخص کی طرح جس نے اپنا عکس پہلے کبھی نہ دیکھا ہو اور اب اُس کے چہرے کے سامنے آئینہ ہو۔

کیا اس نے اس سے محبت کرنا چھوڑ دی تھی؟ یہ وہ سوال تھا جو اُس نے پہلے کبھی خود سے نہ پوچھا تھا۔ وہ جواب دینا چاہتی تھی مگر اُس کے پاس ارادے سے زیادہ الفاظ کی کمی تھی۔ اندر کہیں گہرائی میں اُسے معلوم تھا کہ ان دونوں کو اپنے بچوں کی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی پرواہ ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اس کی بجائے وہ دونوں وہی کچھ کر رہے تھے جو وہ اچھا کر سکتے تھے: دن گزارتے جانا، جو ایک معمول سا بن جاتے ہیں اور وقت اپنی ناگزیر بے حسی کی راہ چلتا ہے۔

وہ اپنی اُس مسلسل اداسی کو روکنے میں ناکام ہو کر آنسو بہانے لگی جو اُس کے علم میں آئے بغیر اُس کی ذات کا حصہ بن چکی تھی۔ ڈیوڈ نے اپنے کوفت سے بھرے چہرے کا رخ موڑ لیا۔ وہ دونوں جانتے

تھے کہ اُسے اُس کو روتا دیکھنا اتنا ہی ناپسند تھا جتنا اُسے اُس کے سامنے رونا۔ خوش قسمتی سے، انہیں بچانے کو اُسی وقت فون بجنے لگا۔

فون ڈیوڈ نے اٹھایا۔ ''ہیلو... جی ہاں یہیں ہیں۔ ہولڈ کیجیے پلیز۔''

ایلا نے خود کو مجتمع کیا اور پوری کوشش کرتے ہوئے کہ وہ خوش باش سنائی دے، بولی، ''جی، ایلا بات کر رہی ہوں۔''

''ہائے، میں مشیل ہوں۔ چھٹی کے روز آپ کو زحمت دینے پر معذرت۔'' ایک نوجوان لڑکی کی چہکتی آواز سنائی دی۔ ''ابھی کل ہی سٹیو نے مجھے آپ سے رابطہ کرنے کا کہا تھا مگر میں بھول گئی۔ کیا آپ کو مسودے پر کام شروع کرنے کا موقع ملا؟''

''اوہ۔'' ایلا نے گہری سانس بھری۔ اُسے ابھی یاد آیا تھا کہ یہ کام اُس کا منتظر تھا۔

لٹریری ایجنسی کی جانب سے اُسے پہلی اسائنمنٹ کے طور پر کسی غیر معروف یورپی ادیب کا ناول پڑھنے کے لیے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اُسے ناول پر تفصیلی رپورٹ لکھ کر دینا تھی۔

''انہیں کہیں کہ فکر مت کریں، میں اُسے پڑھنا شروع کر چکی ہوں۔'' ایلا نے جھوٹ بولا۔

پُرعزم اور خودرائے مشیل ایسی شخص نہیں تھی جسے وہ اپنی پہلی ہی اسائنمنٹ پر پریشان کرنا چاہتی۔

''اوہ، اچھی بات ہے! کیسا ہے ناول؟''

اس الجھن میں کہ کیا کہے، ایلا نے توقف کیا۔ اُسے مسودے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا، سوائے اس کے کہ وہ مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومی کی زندگی کا احاطہ کرتا ایک تاریخی ناول تھا، جس کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ انہیں ''اسلامی دنیا کا شیکسپیئر'' کہا جاتا تھا۔

''اوہ، یہ بہت... صوفیانہ ہے۔'' ایلا اس امید میں ہنس کر بولی کہ وہ ہنسی مذاق میں بات سنبھال لے گی۔

لیکن مشیل کو صرف کام کی بات کرنا تھی۔ ''ٹھیک۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا، ''میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ مکمل کرنا ہوگا۔ اس قسم کے ناول پر رپورٹ لکھنے میں آپ کی توقع سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے...''

مشیل کی آواز مدھم ہونے پر فون پر دور کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ ایلا نے اُسے تصور میں ایک ہی وقت میں کئی کاموں سے نمٹتے دیکھا... ای میل چیک کرتے، اپنے مصنفوں میں سے کسی ایک پر کیا گیا تبصرہ پڑھتے ہوئے، اپنے ٹونا سلاد سینڈوچ کا لقمہ لیتے ہوئے اور اپنے ناخنوں کو چمکاتے... سب کچھ فون پر بات کرنے کے دوران۔

''کیا آپ لائن پر ہیں؟'' مشیل نے ایک منٹ بعد پوچھا۔

''جی۔''

''اچھی بات۔ سنیں، یہاں بہت کام ہیں۔ مجھے جانا ہوگا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ ڈیڈ لائن تین ہفتے میں ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' ایلا نے پُرعزم سنائی دینے کی کوشش کرتے فوراً کہا۔ ''میں ڈیڈ لائن سے پہلے یہ کام مکمل کرلوں گی۔''

سچ یہ تھا کہ ایلا کو یقین نہ تھا کہ وہ اس مسودہ کا تجزیہ کرنا بھی چاہتی تھی یا نہیں۔ شروع میں وہ بڑی مشتاق اور پُراعتماد تھی۔ اسے بڑا جوش وخروش محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک اجنبی ادیب کا غیر شائع شدہ ناول پڑھنے والی پہلی شخص تھی اور یوں اُس کے مقدر میں چاہے چھوٹا سہی ایک کردار ادا کرے گی۔ لیکن اب اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی زندگی سے غیر متعلق صوفی ازم جیسے موضوع پر اپنی توجہ مرکوز کر بھی پائے گی اور تیرہویں صدی جیتنا دُور دراز زمانہ۔

مشیل نے اُس کی ہچکچاہٹ کا سراغ پالیا ہوگا۔ ''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' اُس نے پوچھا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ مُصر ہوگئی۔ ''سنیں، آپ مجھ پر بھروسا کرسکتی ہیں۔''

ذرا دیر خاموشی کے بعد ایلا نے اُسے سچائی بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

''بات صرف یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ آیا ان دنوں میں کسی تاریخی ناول پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے صحیح ذہنی حالت میں ہوں۔ مجھے رومی اور اس سب میں دلچسپی تو ہے مگر پھر بھی یہ موضوع میرے لیے اجنبی ہے۔ شاید آپ مجھے کوئی دوسرا ناول دے سکیں... آپ جانتی ہیں، کچھ ایسا جسے میں آسانی سے پڑھ کر بیان کرسکوں۔''

''یہ تو بہت غیر مناسب نقطۂ نظر ہے۔'' مشیل نے کہا، ''آپ کا خیال ہے کہ آپ جن کتابوں کے متعلق کچھ جانتی ہیں، انہی پر بہتر کام کرسکتی ہیں؟ بالکل بھی نہیں! صرف اس لیے کہ آپ اس ریاست میں رہتی ہیں، آپ صرف اُن ناولوں کی ادارت کریں گے جن کا پس منظر میساچوسٹس ہو، ایسا ہے؟''

''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا...'' ایلا نے کہا اور فوراً ہی اُسے ادراک ہوا کہ یہ جملہ اُس نے اِس سہ پہر بہت مرتبہ بولا تھا۔ اُس نے اپنے شوہر پر یہ دیکھنے کو نظر ڈالی کہ کیا اُس نے بھی یہ نوٹس کیا تھا لیکن ڈیوڈ کے تاثرات کو سمجھنا مشکل تھا۔

''بیشتر وقت ہم ایسی کتابیں پڑھتے ہیں جن کا ہماری زندگیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے کام کا، نوکری کا حصہ ہے۔ ابھی اس ہفتے میں نے ایک ایرانی خاتون کی کتاب پر کام مکمل کیا ہے جو تہران میں ایک قحبہ خانہ چلاتی تھی اور اسے ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ کیا مجھے اُسے کہنا چاہیے تھا کہ وہ مسودہ کسی ایرانی ایجنسی کو بھیجے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' خود کو احمق اور قصوروار محسوس کرتے ایلا منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''دُور دراز زمینوں اور ثقافتوں کے لوگوں سے ربط قائم کرنا ہی کیا اچھے ادب کی خوبیوں میں

سے ایک نہیں؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ سنیے، بھول جائیں جو میں نے کہا۔ ڈیڈ لائن سے پہلے رپورٹ آپ کی میز پر ہوگی۔'' ایلا نے سر تسلیم خم کر دیا، مشیل سے نفرت کرتے جس نے اُس سے یوں سلوک کیا تھا جیسے وہ سب سے غبی اور کاہل انسان تھی اور خود سے نفرت کرتے کہ اُس نے ایسا ہونے دیا۔

''شان دار، یہی جذبہ ہونا چاہیے!'' مشیل نے اپنی چہکتی آواز میں بات ختم کی۔ ''مجھے غلط مت سمجھیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ایسے درجنوں لوگ موجود ہیں جو یہ نوکری کرنا پسند کریں گے۔ اور اُس میں سے بیشتر کی عمر آپ سے آدھی ہے۔ یہ بات آپ کو کام کی تحریک دیتی رہے گی۔''

فون رکھنے کے بعد ایلا نے ڈیوڈ کو اپنی طرف دیکھتے پایا، اُس کے چہرے پر سنجیدہ اور نپا تلا تاثر تھا۔ وہ منتظر دکھائی دیتا تھا کہ انہوں نے بات جہاں روکی تھی، وہیں سے شروع کریں۔ لیکن اُس کا جی نہ چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے مستقبل پر مزید غور و فکر کرے، اگر انہیں جس بات کی فکر تھی، وہ یہی تھی تو۔

☼

اُسی روز بعد میں وہ پورچ میں اپنی پسندیدہ جھولنے والی کرسی پر اکیلی بیٹھی نارتھمپٹن کا سرخی مائل نارنجی غروبِ آفتاب دیکھ رہی تھی۔ آسمان اس قدر قریب اور کشادہ دکھائی دیا کہ آپ ہاتھ بڑھا کر اُسے تقریباً چھو ہی سکتے تھے۔ اُس کا دماغ یوں جیسے اپنے اندر گھومتے تمام تر شور سے عاجز آ کر خاموش ہو چکا تھا۔ اس مہینے کی کریڈٹ کارڈ کی ادائیگیاں اور اورلی کی کھانے کی بری عادتیں، ایوی کے برے سکول گریڈ، آنٹی ایستھر اور اُن کے اداسی بھرے کیک، اُس کے کتے سپرٹ کی گرتی صحت، جینٹ کے شادی کے منصوبے، اُس کے شوہر کے چوری چھپے معاشقے، خود اُس کی زندگی میں محبت کی کمی ... ایک ایک کر کے اُس نے اُن کو چھوٹے چھوٹے ذہنی ڈبوں میں مقفل کر دیا۔

اِس ذہنی کیفیت میں ایلا نے مسودے کو اس کے لفافے سے نکالا اور یوں جیسے اس کا وزن تولتے ہوئے اپنے ہاتھ میں اچھالا۔ اس کے سرورق پر ناول کا نام نیلی روشنائی میں لکھا تھا:

''دلکش کفر''

ایلا کو بتایا گیا تھا کہ مصنف کے بارے میں کوئی بھی زیادہ نہیں جانتا تھا... کوئی اے ظہارا (A-Zahara) جو ہالینڈ میں رہتا تھا۔ یہ مسودہ لفافے میں ایک پوسٹ کارڈ کے ہمراہ لٹریری ایجنسی کو ایمسٹرڈیم سے بھیجا گیا تھا۔ پوسٹ کارڈ پر سامنے گلابی، زرد اور سوسنی گلِ لالہ کے خیرہ کن کھیتوں کی تصویر تھی اور اس کی پشت پر نفیس تحریر میں لکھا تھا:

محترم/محترمہ،

ایمسٹرڈیم سے سلام۔ کہانی جو اس کے ہمراہ میں آپ کو بھیج رہا ہوں، ایشیائے کوچک میں

تیرہویں صدی کے قونیہ میں وقوع پذیر ہوئی۔لیکن میرا دل سے یقین ہے کہ یہ کہانی ملکوں، ثقافتوں اور صدیوں کی حدود سے ماورا ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ کو بہترین شاعر رومی اور تاریخ اسلام کے انتہائی محترم روحانی رہنما شمس تبریز جو رسوائیوں اور حیرانیوں بھرے ایک گم نام، غیر روایتی درویش تھے، کے درمیان غیر معمولی تعلق پر یہ تاریخی، صوفیانہ ناول ''دلکش کفر'' پڑھنے کا وقت میسر ہو سکے گا۔

خدا کرے، محبت ہمیشہ آپ کی ہمراہی ہو اور آپ ہمیشہ محبت میں گھرے رہیں۔

اے زی ظہارا

ایلا جان گئی کہ پوسٹ کارڈ سے لٹریری ایجنٹ کے تجسس کو ہوا ملی ہو گی۔لیکن سٹیو ایسا شخص نہ تھا جس کے پاس کسی نو آموز مصنف کی تحریر پڑھنے کا وقت ہوتا۔سو اُس نے وہ پلندا اپنی اسسٹنٹ مشیل کے حوالے کر دیا جس نے اُسے اپنی نئی اسسٹنٹ کے سپرد کیا۔یوں ''دلکش کفر'' اب ایلا کے ہاتھوں میں تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ صرف کوئی کتاب نہ ہو گی بلکہ ایک ایسی کتاب جو اس کی زندگی بدل کر رکھ دے گی۔یہ کہ جس دوران وہ اسے پڑھ رہی تھی، اس کی زندگی دوبارہ تحریر کی جائے گی۔

ایلا نے پہلا صفحہ پلٹا۔مصنف کے بارے میں ایک تحریر تھی۔

''اے زی ظہارا جب دنیا کا سفر نہ کر رہے ہوں تو ایمسٹرڈیم میں اپنی کتابوں، بلیوں اور کچھوؤں کے ہمراہ رہتے ہیں۔دلکش کفر اُن کا پہلا اور غالباً آخری ناول ہے۔اُن کا ناول نگار بننے کا کوئی ارادہ نہیں اور انہوں نے یہ کتاب خالصتاً صوفی اور شاعر رومی اور اُن کے محبوب شمس تبریز کی محبت اور تحسین میں لکھی ہے۔''

اُس کی نگاہیں صفحے پر نیچے پھسلیں اور وہاں ایلا نے کچھ ایسا پڑھا جو اسے عجیب طور پر بے حد مانوس لگا:

''باوجود اس کے کہ جو کچھ لوگوں کا کہنا ہے، محبت صرف وہ شیریں احساس نہیں ہے جسے طاری ہونا ہی ہوتا ہے اور پھر وہ تیزی سے گزرتے زائل ہو جاتا ہے۔''

جب اُسے ادراک ہوا کہ یہ بالکل اُس جملے کا متضاد تھا جو اُس نے اس صبح کچن میں اپنی بیٹی سے کہا تھا، اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔وہ لمحے بھر کو ساکت رہ گئی، اس سوچ پر ہراساں کہ کائنات کی کوئی پُراسرار طاقت یا پھر یہ مصنف ہی جو کوئی بھی وہ تھا، اس کی جاسوسی کر رہا تھا۔شاید اُس نے یہ کتاب پہلے سے یہ جان کر لکھی تھی کہ کس قسم کا شخص اسے پڑھے گا۔اس لکھاری کے دماغ میں قاری کے طور پر وہ ہی تھی۔کسی وجہ سے جو اُسے معلوم نہ تھی، ایلا کو یہ خیال پریشان کن اور سنسنی خیز دونوں ہی لگا۔

''کئی طرح سے بیسویں صدی تیرہویں صدی سے زیادہ مختلف نہیں۔دونوں تاریخ میں بے مثال مذہبی تصادم، ثقافتی غلط فہمیوں اور دوسروں سے خوف زدہ ہونے اور ایک عمومی احساسِ عدم تحفظ

کے ادوار کے طور پر قلم بند کیے جائیں گے۔ اِن جیسے زمانوں میں محبت کی ضرورت ہمیشہ سے کہیں زیادہ ہے۔''

اچانک اُس کی سمت خنک اور تیز ہوا کا جھونکا آیا جس نے پورچ میں پتے بکھیر دیے۔ غروبِ آفتاب کا حُسن مغربی افق کی سمت تیر گیا تھا اور فضا بے کیف اور بے لطف محسوس ہونے لگی تھی۔

''کیوں کہ محبت ہی زندگی کا جوہر اور مقصد ہے۔ جیسا کہ رومی نے ہمیں یاد دلایا، یہ ہر کسی پر وار کرتی ہے، اُن پر بھی جو محبت سے گریزاں ہوتے ہیں... حتیٰ کہ ان پر بھی جو''رومان پسند'' کے الفاظ کو ناپسندیدگی کی نشانی سمجھتے ہیں۔''

ایلا دم بخود رہ گئی یوں جیسے اُس نے وہاں پڑھ لیا تھا، ''محبت سب پر وار کرتی ہے، حتیٰ کہ نارتھمپٹن میں بسنے والی درمیانی عمر کی ایلا روبن سٹین نامی ہاؤس وائف پر بھی۔''

اُس کے وجدان نے اُسے مسوّدہ ایک طرف رکھنے، گھر میں جانے، مشیل کو فون کرنے اور یہ بتانے کا کہا کہ وہ کسی صورت بھی اس ناول پر رپورٹ نہیں لکھ سکتی۔ لیکن اس کی بجائے اُس نے گہری سانس بھری، صفحہ پلٹا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

دلکش کفر

(Sweet Blasphemy)

(ناول)

اے زی ظہارا

صوفیا کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کا بھید سورۃ فاتحہ میں ہے

اور سورۃ فاتحہ کا خفی راز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں

اور بسم اللہ کا لب لباب ہے، حرف ب،

اور اس حرف کے نیچے ایک نقطہ ہے...

ب کا نچلا نقطہ کائنات کی تجسیم ہے...

ب

مثنوی کا آغاز "ب" سے ہوتا ہے،

بالکل اِس ناول کے تمام ابواب کی طرح...

پیش لفظ

بارھویں صدی کی طرح تیرہویں صدی بھی، اناطولیہ میں مذہبی تصادم، سیاسی تنازعوں اور طاقت واختیار کے حصول کی خاطر لامتناہی کھینچا تانی کے حصار میں ایک ہنگامہ خیز دَور تھا۔ مغرب میں صلیبیوں نے یروشلم کے راستے میں قسطنطنیہ پر قبضہ کیا اور اسے غارت کیا، جس کا نتیجہ بازنطینی سلطنت کی تقسیم کی صورت میں نکلا۔ مشرق میں انتہائی منظم منگول سپاہ نے عسکری ذہانت کے حامل چنگیز خان کی قیادت میں تیزی سے وسعت حاصل کی۔ اس دوران مختلف ترک قبائل باہمی لڑائیوں میں معروف رہے اور بازنطینی اپنی کھوئی ہوئی سرزمین، دولت اور طاقت واقتدار واپس لینے کی تگ ودو کرتے رہے۔

وہ بے مثال انتشار کا دَور تھا جب عیسائی عیسائیوں سے، مسلمانوں سے عیسائی اور مسلمان مسلمانوں سے دست وگریباں رہے۔ کوئی بھی جس طرف کا بھی رخ کرتا، عداوت اور اذیت واضطراب اور شدید خوف تھا کہ آئندہ کیا ہوگا۔ اس سارے انتشار کے درمیان ایک ممتاز مسلمان عالم رہتے تھے جنہیں سب جلال الدین رومی کے نام سے جانتے تھے۔ ان کی عرفیت تھی، مولانا... ''ہمارے استاد...'' جو انہیں بہت سے لوگ کہتے تھے، پورے علاقے میں اور اس سے باہر بھی اُن کے ہزاروں شاگرد اور عقیدت مند تھے اور انہیں سب مسلمانوں کے لیے منارۂ نور سمجھا جاتا تھا۔

1244ء میں مولانا رومی کی ملاقات شمس تبریز سے ہوئی... غیر روایتی انداز واطوار اور ملحدانہ دعووں والے ایک سرگرداں درویش۔ ان کی اتفاقی ملاقات نے دونوں کی زندگیاں بدل دیں۔ ایک ہی وقت میں، یہ آغاز تھا ایک مضبوط اور منفرد دوستی کا، جسے آنے والی صدیوں میں صوفیا نے دو بحر کے ملاپ سے تشبیہ دینا تھی۔ اس غیر معمولی رفیق سے ملنے پر مولانا رومی تمام رسمی اصولوں اور پابندیوں سے آزاد ہونے کی جرأت کرتے ہوئے، ایک مرکزی دھارے کے عالم سے ایک مخلص صوفی، جذبۂ شوق سے سرشار شاعر، محبت کے وکیل اور صوفی درویشوں کے وارفتہ رقص کے بانی بن گئے۔ گہرائی میں جے تعصب اور تصادم کے دَور میں وہ اپنے دروازے تمام پس منظر کے لوگوں کے لیے کھولتے ہوئے آفاقی روحانیت کے

لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ظاہری جہاد کی بجائے، جسے ''کافروں کے خلاف جنگ'' کے طور پر بیان کیا جاتا ہے اور جس پر اُن دنوں کی طرح آج بھی بہت سے لوگ عمل کرتے ہیں... رومی باطنی جہاد کے لیے اٹھے جس کا مقصد اپنی انا، نفس کے خلاف لڑنا اور آخر اس پر غلبہ پانا تھا۔تاہم اِن خیالات کا خیر مقدم ہر کسی نے نہ کیا، بالکل جیسے سب لوگ محبت کے لیے اپنے دروازے وا نہیں کرتے۔شمس تبریز اور مولانا رومی کے درمیان مضبوط روحانی تعلق افواہوں، بہتان اور اعتراض کا ہدف بن گیا۔وہ غلط فہمی کا نشانہ بنے، ان سے حسد کیا گیا، انہیں رسوا کیا گیا اور آخر میں اُن کے قریب ترین لوگوں نے اُن سے دغا کیا۔اپنی ملاقات کے تین سال بعد وہ المیہ انداز میں جدا ہو گئے۔

لیکن داستان یہیں ختم نہیں ہوئی۔

سچ یہ ہے کہ اس داستان کا کوئی انجام کبھی نہیں تھا۔تقریباً آٹھ سو سال بیت چکے ہیں لیکن شمس تبریز اور مولانا رومی کی روحیں آج بھی زندہ ہیں، ہمارے درمیان کہیں رقصاں...

قاتل

سکندریہ، نومبر 1252ء

بلاشک کنویں کے تاریک پانیوں کی تہ میں، وہ اب مُردہ ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں میں جاؤں، اُس کی آنکھیں میرا پیچھا کرتی ہیں، روشن اور مرعوب کن آنکھیں، اوپر آسمان پر بدشگونی سے معلق دو ستاروں کی طرح۔ میں سکندریہ آ گیا، اس امید میں کہ اگر میں دُور دراز سفر کر جاؤں تو میں ان چبھتی یادوں سے فرار ہو سکتا تھا اور میرے دماغ میں گونجتی وہ آہ و زاری رک سکتی تھی، وہ آخری چیخ جو اُس کے چہرے کے خون میں بھیگنے، اُس کی آنکھیں باہر ابلنے اور اس کا گلا ایک نا تمام سانس میں بند ہونے سے پہلے اُس کے حلق سے نکلی تھی، خنجر گھونپے گئے، زخم کھائے آدمی کا الوداع۔ پھندے میں پھنسے بھیڑیے کی دردناک چیخ۔

جب آپ کسی کی جان لیتے ہیں تو اُس شخص کی کوئی چیز آپ میں منتقل ہو جاتی ہے... آہ، خوشبو یا کوئی انداز۔ میں اسے ''ستم رسیدہ کی بد دعا'' کہتا ہوں۔ یہ آپ کے بدن سے چمٹ جاتی ہے، آپ کی جلد میں گھس کر سیدھی دل کا رخ کرتی ہے اور یوں آپ کے اندر رہنے بسنے لگتی ہے۔ وہ لوگ جو مجھے سڑک پر چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، کسی طور یہ نہیں جانتے لیکن میرے اندر ان تمام آدمیوں کے نشانات یا سراغ زندہ ہیں جن کی جانیں میں نے لیں۔ میں کسی نادیدہ ہار کی طرح انہیں اپنی گردن میں پہنتا ہوں، ان کی موجودگی اپنے بدن پر محسوس کرتے ہوئے، کسی ہوئی اور بوجھل۔ اگرچہ یہ تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے مگر میں اس بوجھ کے ساتھ جینے کا عادی ہو چکا ہوں اور اسے اپنے کام کے حصے کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ جب سے قابیل نے ہابیل کا قتل کیا ہے، ہر قاتل میں وہ آدمی سانس لیتا ہے جسے اُس نے قتل کیا، اتنا میں جانتا ہوں۔ مجھے اس پر پریشانی نہیں ہوتی۔ اب مزید نہیں۔ لیکن پھر، پچھلے واقعے کے بعد میں اس قدر بری طرح گڑبڑا کیوں گیا تھا؟

اس بار شروع سے ہی سب کچھ مختلف تھا۔ مثال کے طور پر یہ لے لیں کہ مجھے ذمے داری کیسے

ملی۔ یا مجھے اس کی بجائے کہنا چاہیے کہ ذمہ داری نے مجھے کیسے تلاش کیا؟ 1248ء کے موسم بہار کی ابتدا میں
میں قونیہ میں ایک قحبہ خانے کے مالک کے لیے کام کر رہا تھا، وہ جنیہ خواجہ سرا جو اپنے غصے اور غضب کے
لیے مشہور تھا۔ میری ذمہ داری تھی طوائفوں کو قابو کرنے میں اُس کی مدد کرنا اور جو گاہک آپے سے باہر
ہو جاتے تھے انہیں دھمکانا۔

مجھے وہ دن واضح طور پر یاد ہے۔ میں ایک طوائف کی تلاش میں تھا جو خدا کی تلاش و جستجو میں
قحبہ خانہ سے فرار ہو گئی تھی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی جس نے ایک طرح سے میرا دل توڑا تھا کیوں کہ
جب میں اُسے پکڑ لیتا تو میں اُس کا چہرہ اس بری طرح مسخ کرنے والا تھا کہ کوئی بھی مرد اُس پر کبھی دوسری
نظر نہ ڈالنا چاہتا۔ میں اُس بے وقوف عورت کو پکڑنے کے قریب ہی تھا جب مجھے اپنی دہلیز پر ایک پُراسرار
خط ملا۔ میں نے لکھنا پڑھنا کبھی نہ سیکھا تھا سو میں اُسے مدرسہ لے گیا جہاں میں نے خط پڑھنے کے لیے ایک
طالب علم کو ادائیگی کی۔

کھلا یہ کہ وہ ایک گم نام خط تھا جس کے آخر میں درج تھا: ''چند سچے مسلمان۔''

''ہمیں مستند ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تم کہاں سے ہو اور تم اصل میں کون ہو۔'' خط میں لکھا
تھا۔ ''حشاشین کے پرانے رکن! ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حسن بن صباح کی موت اور تمہارے رہنماؤں کے
حراست میں لیے جانے کے بعد تنظیم ویسی نہیں رہی جیسی کبھی ہوا کرتی تھی۔ تم سزا سے بچنے کے لیے قونیہ
آئے ہو اور تب سے تم بھیس میں ہو۔''

خط میں لکھا تھا کہ ایک بڑے اہم معاملے میں میری خدمات کی فوری ضرورت تھی۔ اس میں
یقین دہانی کروائی گئی کہ معاوضہ اطمینان بخش ہوگا۔ اگر مجھے دلچسپی تھی تو مجھے ایک مشہور مے خانے میں اُسی
شام تاریکی پھیلنے کے بعد پہنچنا تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے کھڑکی کے قریب ترین میز پر، دروازے کی طرف
پشت کر کے، سر جھکا کر اور اپنی نگاہیں فرش پر جما کر بیٹھ جانا تھا۔ جلد ہی میرے پاس وہ ایک یا ایک سے
زیادہ آدمی پہنچ جاتے جنہیں میری خدمات حاصل کرنی تھیں۔ وہ مجھے وہ تمام معلومات دیتے جن کی مجھے
ضرورت تھی۔ ان کے آنے، ان کے جانے اور گفتگو کے درمیان کسی موقع پر بھی میں اپنے سر کو اٹھا کر ان
کے چہروں کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

وہ ایک عجیب خط تھا۔ لیکن پھر میں گاہکوں کے خبطی پن کا عادی تھا۔ برسوں میں میری خدمات
ہر طرح کے لوگوں نے حاصل کی تھیں اور ان میں سے بیشتر اپنے نام خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ تجربہ نے مجھے یہ
سکھایا تھا کہ اکثر و بیشتر جو گاہک زیادہ سختی سے اپنی شناخت چھپانا چاہتا، وہ اپنے شکار کے اُسی قدر قریب
ہوتا تھا لیکن یہ میرا سر درد نہیں تھا۔ میرا کام تھا قتل کرنا۔ اپنی ذمے داری کے عقب میں موجود اسباب کی
تفتیش کرنا میرا کام نہ تھا۔ برسوں پہلے جب سے قلعہ الموت کو چھوڑا تھا، میں نے اپنے لیے اسی زندگی کا
انتخاب کیا تھا۔

میں بہرحال سوال شاذونادر ہی کرتا ہوں۔ میں سوال کروں بھی کیوں؟ جن لوگوں کو میں جانتا ہوں، اُن میں سے بیشتر کم سے کم کسی ایک شخص سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ وہ اس بارے میں کچھ کرتے نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قتل کرنے کی خواہش سے مامون ہیں۔ درحقیقت ہر کوئی کسی نہ کسی کی جان لینا چاہتا ہے۔ لوگ اس بات کو تب تک نہیں سمجھتے، جب تک یہ خود ان کے ساتھ پیش نہیں آتا۔ وہ خود کو قتل کے ناقابل سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ صرف اتفاق کا معاملہ ہے۔ بعض اوقات ان کے غصے کو ہوا دینے کے لیے ایک اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ کوئی بار ادہ غلط فہمی، کسی ذرا سی بات پر جھڑپ یا پھر بس کسی غلط وقت پر کسی غلط جگہ موجود ہونے پر ایسے لوگوں میں ایک تباہ کن لہر اُبھر آتی ہے، جو دوسری صورت میں شائستہ اور نفیس لوگ ہوتے ہیں۔ قتل کوئی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن کسی اجنبی کو بے حسی سے ہر کوئی قتل نہیں کرسکتا۔ یہی مقام ہے جہاں منظر میں میں داخل ہوتا ہوں۔

میں نے دوسروں کے حصے کا گندا کام کیا۔ حتیٰ کہ خدا نے بھی اپنی مقدس حکمت میں میرے جیسے کسی شخص کی ضرورت کو تسلیم کیا جب اُس نے موت کے فرشتے کے طور پر عزرائیلؑ کو لوگوں کی زندگیاں ختم کرنے کی ذمے داری پر مامور کیا۔ اس صورت میں انسان اس فرشتے سے خوف کھاتے، اسے بددعا دیتے اور اسی سے نفرت کرتے جب کہ خدا کے ہاتھ صاف اور اُس کا نام بے داغ رہتا۔ یہ فرشتے کے ساتھ انصاف نہ تھا۔ لیکن پھر، یہ دنیا اپنے انصاف کے باعث نہیں پہچانی جاتی، ہے ناں؟

جب تاریکی پوری طرح پھیل گئی، میں مے خانے میں پہنچا۔ کھڑکی کے ساتھ والی میز پر چہرے پر زخم کا نشان لیے ایک شخص بیٹھا تھا جو گہری نیند میں لگتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اُسے جگا دوں اور کہیں اور جانے کا کہوں لیکن شرابیوں کے متعلق آپ کبھی نہیں جانتے کہ وہ کیا ردعمل دیں اور مجھے محتاط رہنا تھا کہ دوسروں کی زیادہ توجہ مجھ پر نہ ہو۔ سو میں کھڑکی کے سامنے اگلی خالی میز پر بیٹھ گیا۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ دو آدمی آئے۔ وہ میرے برابر میں دونوں اطراف بیٹھ گئے تاکہ ان کے چہرے نہ دیکھے جا سکیں۔ اگرچہ مجھے یہ جاننے کے لیے کہ وہ کتنے نوجوان تھے اور اس اقدام کے لیے کس قدر عدم تیار تھے جو وہ کرنے والے تھے، اُن کے چہرے دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

''تمہاری سب سے زیادہ سفارش کی گئی تھی۔'' ان میں سے ایک بولا۔ اُس کا لہجہ محتاط ہونے سے زیادہ خائف اور تشویش بھرا تھا۔ ''ہمیں بتایا گیا تھا کہ تم بہترین ہو۔''

جس انداز سے اُس نے یہ سب کہا، یہ بات مزاحیہ محسوس ہوئی مگر میں نے اپنی مسکراہٹ دبا لی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے خائف تھے جو کہ اچھی بات تھی۔ اگر وہ خاصے خوف زدہ تھے تو وہ میرے ساتھ کچھ غلط کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔

سو میں نے کہا، ''ہاں، میں بہترین ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ مجھے گیدڑ سر عیار کہتے ہیں۔ میں نے اپنے گاہکوں کو کبھی مایوس نہیں کیا، چاہے میرا کام کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔''

''اچھی بات ہے۔'' اس نے گہری سانس بھری۔ ''کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ آسان کام نہ ہو۔''
اب دوسرا آدمی بولا، ''دیکھو، ایک آدمی ہے جس نے اپنے بہت سے دشمن بنا لیے ہیں۔ وہ جب سے اس شہر میں آیا ہے، مصیبت کے سوا کچھ نہیں لایا۔ ہم اُسے کئی بار تنبیہ کر چکے ہیں مگر وہ ہماری بات پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اگر کوئی فرق پڑا ہے تو یہ کہ وہ زیادہ جھگڑالو ہو گیا ہے۔ اس نے ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں چھوڑا۔''

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ ہر بار معاملہ طے کرنے سے پہلے گاہک اپنی وضاحت دینے کی کوشش کرتے تھے، یوں جیسے میری اجازت اس اقدام کی سنگینی کو کم کر سکتی تھی جو وہ کرنے والے تھے۔

''میں جانتا ہوں تمہارا کیا مطلب ہے۔ مجھے بتاؤ، یہ آدمی کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ نام بتانے میں ہچکچاہٹ کا شکار دکھائی دیے، اس کی بجائے مبہم سی تفصیل بتانے لگے۔
''وہ ایک ملحد ہے جس کا اسلام سے کچھ لینا دینا نہیں۔ بے حرمتی اور گستاخی بھرا ایک غیر مہذب آدمی۔ کوئی درویش سے منحرف۔''

جیسے ہی میں نے آخری الفاظ سنے، میرے بازوؤں میں کپکپاہٹ کا احساس رینگ گیا۔
میرا دماغ دوڑنے لگا۔ میں نے ہر قسم کے لوگ قتل کیے تھے، نوجوان اور بوڑھے، مرد اور عورتیں، لیکن درویش، کوئی ایمان والا شخص، ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ میری اپنی توہمات تھیں اور میں خدا کے غضب کو بلاوا نہیں دینا چاہتا تھا کہ سب کچھ کے باوجود میں خدا پر یقین رکھتا تھا۔
''مجھے خدشہ ہے کہ مجھے انکار کرنا ہوگا۔ میرا نہیں خیال کہ میں کسی درویش کی جان لے سکتا ہوں۔ کسی اور کو تلاش کرلو۔''
یہ کہہ کر میں رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن ان میں سے ایک آدمی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور التجا کی، ''ٹھہرو، برائے مہربانی۔ تمہارا معاوضہ تمہاری کوشش کے موافق ہوگا۔ تمہارا جو بھی معاوضہ ہے، ہم اس سے دگنا دینے کو تیار ہیں۔''
''تین گنا کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' میں نے اس بارے میں قائل ہو کر پوچھا کہ وہ اتنی زیادہ رقم نہیں دے پائیں گے۔

لیکن مجھے حیرت ہوئی جب ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ دونوں راضی ہو گئے۔ میں سراسیمہ ہو کر واپس بیٹھ گیا۔ اتنی رقم کے ساتھ میں آخرکار آسانی سے اپنے لیے دلہن حاصل کر کے شادی کر سکتا تھا اور گزر بسر کیسے ہو، اس پر فکر مند ہونا چھوڑ سکتا تھا۔ کوئی درویش تھا یا نہیں، اس رقم کے عوض تو کوئی بھی قتل کا مستحق تھا۔

اُس لمحے میں کیسے جان سکتا تھا کہ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرنے جا رہا تھا اور باقی عمر اس پر پچھتانے میں گزار دیتا؟ میں کیسے جان سکتا تھا کہ کسی درویش کا قتل اس قدر مشکل ہوگا اور یہ کہ

اُس کی موت کے عرصہ بعد بھی اُس کی کسی خنجر جیسی تیز نگاہ ہر جگہ میرا پیچھا کرے گی؟

تب سے چار برس گزر چکے ہیں جب میں نے اُس صحن میں اُسے چھرا گھونپا تھا اور اس کی لاش ٹھکانے لگانے کو کنویں میں گرائی تھی، ایک چھپاکے کے انتظار میں جو کبھی سنائی نہ دیا۔ کوئی ہلکی سی آواز تک نہیں سنائی دی۔ یوں تھا جیسے وہ نیچے پانی میں گرنے کی بجائے اوپر افلاک میں گر گیا تھا۔ مجھے اب بھی سوتے میں ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں اور اگر میں پانی کو دیکھتا ہوں، چند لمحے سے زیادہ کسی بھی طرح کے پانی کو... تو ایک سرد دہشت میرے پورے بدن کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور مجھے ابکائی سی آجاتی ہے۔

حصہ اوّل

خاک

اشیا جو ٹھوس اور ساکت و جامد ہیں



شمس

سمرقند کے باہر ایک کارواں سرائے، مارچ 1242ء

بے کلی سے لکڑی کی شکستہ میز پر بیٹھے، میری آنکھوں کے سامنے موم کی شمعوں کی لویں تھرتھرائیں۔ اس شام مجھے جو کشف اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا، وہ بے حد روشن اور واضح تھا۔

کھلے ہوئے زرد گلابوں سے بھرے صحن والا ایک بڑا سا گھر اور اس صحن کے درمیان دنیا کے خنک ترین پانی والا کنواں۔ وہ اواخر خزاں کی ایک پرسکون شب ماہ تھی۔ پس منظر میں چند شب خیز جانوروں کا شور اور بھونکنا تھا۔ ذرا دیر میں مہربان چہرے، چوڑے شانوں اور بادامی رنگ کی گہری آنکھوں والا ایک درمیانی عمر کا شخص میری تلاش میں گھر سے باہر نکلا۔ اس کے تاثرات آزردہ تھے اور اس کی آنکھیں بے پناہ اداس تھیں۔

''شمس، شمس، آپ کہاں ہیں؟'' وہ دائیں اور بائیں طرف منہ کر کے چلایا۔

ہوا تیز چلنے لگی اور چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا، یوں جیسے جو کچھ ہونے کو تھا، وہ اس کا گواہ نہ بننا چاہتا تھا۔ الوؤں کی ہو ہو بند ہوگئی، چمگادڑوں نے اپنے پر پھڑپھڑانے بند کیے اور حتیٰ کہ گھر کے اندر آتش دان کی آگ تک نہ چٹخی۔ دنیا پر ایک کامل سناٹا چھا گیا۔

آدمی آہستہ آہستہ کنویں کے قریب پہنچا، جھکا اور اندر جھانکا۔ ''شمس، مجی۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''کیا آپ یہاں ہیں؟''

میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر میرے لبوں سے کوئی آواز نہ نکلی۔

وہ آدمی مزید آگے جھکا اور ایک بار پھر کنویں میں جھانکا۔ پہلے تو اُسے پانی کی تاریکی کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دے سکا۔ لیکن پھر، گہرائی میں، کنویں کی تہ میں، اُسے کسی شدید طوفان کے بعد پانی پر ہلکورے لیتے کسی شکستہ بیڑے کی طرح بے مقصد سا تیرتا میرا ہاتھ دکھائی دے گیا۔ اس کے بعد اُس نے آنکھیں پہچان لیں... دو چمکتے سیاہ پتھر، پورے چاند کو گھورتے ہوئے جو اَب گہرے سیاہ بادلوں کے

عقب سے نکل رہا تھا۔ میری آنکھیں چاند پر یوں جمی ہوئی تھیں جیسے آسمانوں سے اپنے قتل کی وضاحت کی منتظر ہوں۔

آہ وزاری اور سینہ کوبی کرتے ہوئے وہ آدمی اپنے گھٹنوں کے بل گر گیا۔ ''انہوں نے اُسے مار ڈالا! اُنہوں نے میرے شمس کو مار ڈالا!'' وہ چلایا۔

تبھی ایک سائے نے تیزی سے جھاڑیوں کے پیچھے حرکت کی اور تیز مگر دبے قدموں سے وہ کسی جنگلی بلی کی طرح باغ کی دیوار پر چڑھ گیا۔ لیکن آدمی نے قاتل کو نہ دیکھا۔ شدید کرب واذیت کے عالم میں وہ چیختا اور چنگھاڑتا رہا، یہاں تک کہ اُس کی آواز کسی شیشے کی طرح کرچی کرچی ہو گئی اور چھوٹے چھوٹے نوکیلے ٹکڑوں کی صورت رات میں بکھر گئی۔

''ارے تم! کسی دیوانے کی طرح چیخنا بند کرو۔''

''..........''

''یہ ناگوار شور بند کرو یا پھر میں تمہیں باہر نکال دوں گا!''

''..........''

''میں نے کہا منہ بند کرو! تم نے سنا نہیں؟ بکواس بند کرو!''

بلند لہجے میں یہ الفاظ ادا کرنے والی آواز مردانہ تھی، جو دھمکانے والے انداز میں قریب آتی جا رہی تھی۔ ذرا مزید دیر کو اپنے اُس تصور کے اندر ہی رہنے کو ترجیح دیتے ہوئے میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں نے اُسے سنا ہی نہیں۔ میں اپنی موت کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا۔ میں ان رنجیدہ ترین آنکھوں والے شخص کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ کون تھا وہ؟ اُس کا مجھ سے کیا تعلق تھا اور وہ خزاں کی رات میں اتنی شدت سے مجھے کیوں تلاش کر رہا تھا؟

لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے کشف پر ایک اور نگاہ ڈال پاتا، کسی نے کسی اور جہت سے میرے بازو کو تھاما اور مجھے اتنی شدت سے جھنجھوڑا کہ مجھے اپنے منہ میں اپنے دانت بجتے محسوس ہوئے۔ وہ مجھے دوبارہ اِسی دنیا میں کھینچ لے آیا۔

آہستگی سے، متذبذب، میں نے آنکھیں کھولیں اور اپنے برابر میں کھڑے آدمی کو دیکھا۔ وہ کھچڑی ڈاڑھی اور گھنی مونچھوں والا ایک دراز قد، فربہ شخص تھا۔ میں اُسے سرائے کے مالک کی حیثیت سے پہچان گیا۔ تقریباً فوراً ہی میں نے اُس کے بارے میں دو چیزوں پر توجہ کی: یہ کہ وہ سخت بات چیت اور تشدد سے لوگوں کو دھمکانے والا آدمی تھا۔ اور یہ کہ اس وقت وہ مشتعل تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا، ''تم میرا بازو کیوں کھینچ رہے ہو؟''

''میں کیا چاہتا ہوں؟'' سرائے کا مالک ماتھے پر بل ڈال کر گرجا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم گھڑ دوڑ والوں کے لیے چیخنا بند کر دو، یہ چاہتا ہوں میں۔ تم میرے گاہکوں کو ڈرا کر بھگا رہے ہو۔''

''واقعی؟ کیا میں چیخ رہا ہوں؟'' خود کو اُس کی گرفت سے آزاد کرواتے ہوئے میں زیرلب بڑبڑایا۔

''تم شرط لگا لو کہ تم چیخ رہے تھے۔ تم کسی ایسے ریچھ کی طرح چیخ چلا رہے تھے جس کے پنجے میں کوئی کانٹا گڑ گیا ہو۔ تمہیں ہوا کیا تھا؟ کیا تم رات کا کھانا کھاتے اونگھ گئے تھے؟ تم نے ضرور کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا۔''

میں جانتا تھا کہ یہ واحد معقول وضاحت تھی اور اگر میں نے یہی کہہ دیا تو سرائے کا مالک مطمئن ہو جائے گا اور مجھے تنہا چھوڑ دے گا۔ پھر بھی میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا۔

''نہیں برادر، میں خوابیدہ تھا نہ ہی میں نے برا خواب دیکھا تھا۔'' میں نے کہا، ''درحقیقت مجھے کبھی خواب دکھائی نہیں دیتے۔''

''پھر تم اس سب چیخنے چلانے کا کیا سبب بیان کرو گے؟'' سرائے کا مالک جاننا چاہتا تھا۔

''مجھے الہام ہوا تھا۔ وہ بہت مختلف بات ہے۔''

اس نے مجھے ہکا بکا تاثر کے ساتھ دیکھا اور کچھ دیر اپنی مونچھوں کے سرے چباتا رہا۔ آخر وہ بولا، ''تم درویش، باورچی خانے کے چوہوں جیسے دیوانے ہوتے ہو۔ خصوصاً سرگرداں قسم کے درویش۔ سارا دن تم روزہ رکھتے اور نماز پڑھتے اور جھلساتے سورج تلے چلتے ہو۔ کوئی حیرت نہیں کہ تمہیں اب بھی واہمے دکھائی دے رہے ہوں... تمہارا دماغ جھلس چکا ہے!''

میں مسکرا دیا۔ وہ درست بھی ہو سکتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی راہ میں خود کو گم کرنے اور اپنے حواس گم کرنے میں کم ہی فرق ہے۔

تبھی طباق سے بھرا ایک بڑا سا طشت اٹھائے ہوئے دو خدمت گار لڑکے نمودار ہوئے: تازہ بھنی بکری، خشک نمکین مچھلی، مرچ مصالحے والا بکرے کا گوشت، گندم کی روٹی، کوفتوں کے ساتھ چنے اور دال کا شوربہ، دنبے کی دُم کی چربی کے ساتھ۔ فضا کو پیاز، لہسن اور مصالحوں کی خوشبو سے معطر کرتے ہوئے وہ دالان میں گھوم کر وہ سب تقسیم کرنے لگے۔ جب وہ میری میز پر رکے تو میں نے بھاپ اڑاتے شوربے کا پیالہ اور کچھ روٹی لے لی۔

''کیا تمہارے پاس اِس کی ادائیگی کی رقم ہے؟'' سرائے کے مالک نے ذرا اخلاق سے پوچھا۔

''نہیں، میرے پاس نہیں۔'' میں نے کہا، ''لیکن مجھے اس کے بدلے کچھ دینے کی اجازت دو۔ کھانے اور کمرے کے بدلے میں تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا سکتا ہوں۔''

اس بات کا جواب اُس نے کولہوں پر ہاتھ رکھ کے حقارت سے ناک چڑھا کر دیا۔ ''تم نے ابھی مجھے بتایا کہ تمہیں کبھی خواب دکھائی نہیں دیتے۔''

"یہ درست ہے۔ میں خوابوں کا ایسا تعبیر بیان کرنے والا ہوں جو خود کوئی خواب نہیں دیکھتا۔"

"مجھے تمہیں یہاں سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ جیسا کہ میں نے کہا، تم درویش دیوانے ہوتے ہو۔" سرائے کا مالک لفظوں کو جیسے تھوکتے ہوئے بولا، "تمہارے لیے ایک نصیحت ہے: مجھے معلوم نہیں کہ تمہاری عمر کیا ہے مگر میرا خیال ہے کہ تم نے دونوں جہانوں کے لیے خاصی عبادت کر لی ہے۔ کوئی اچھی عورت تلاش کرو اور گھر بساؤ۔ بچے پیدا کرو۔ اس سے تمہیں حقیقت کی دنیا میں قدم جمانے میں مدد ملے گی۔ کیا تک ہے دنیا بھر میں گھومنے پھرنے کی جب ہر طرف خواری اور مصیبت ہی ہے؟ میری بات کا بھروسا کرو۔ دنیا میں کچھ نیا نہیں۔ میرے پاس دنیا کے دُور دراز گوشوں سے بھی گاہک آتے ہیں، شراب کے چند جام کے بعد، میں اُن سب سے ایک سی ہی کہانیاں سنتا ہوں۔ ہر جگہ کے مرد ایک سے ہیں۔ وہی کھانا، وہی پانی، وہی پرانی باتیں۔"

"میں کسی مختلف شے کی تلاش میں نہیں۔ میں خدا کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔" میں نے کہا، "میری جستجو خدا کے لیے جستجو ہے۔"

"پھر تم اُسے غلط جگہ ڈھونڈ رہے ہو۔" اس نے یکا یک گمبھیر آواز میں ترکی بہ ترکی جواب دیا، "خدا یہ جگہ چھوڑ کر جا چکا ہے! ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کب واپس آئے گا۔"

یہ سن کر میرا دل بے قابو ہو کر میرے سینے میں تیز تیز دھڑکنے لگا۔ "جب کوئی خدا کو برا کہتا ہے تو وہ دراصل خود کو برا کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

سرائے کے مالک کے چہرے پر ایک عجیب سی ترچھی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس کے چہرے پر مجھے تلخی اور برہمی دکھائی دی اور کچھ ایسا جو بچگانہ سی تکلیف سے مشابہ تھا۔

"کیا خدا نے کہا نہیں کہ میں تمہاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہوں؟" میں نے پوچھا، "خدا کہیں دُور افلاک پر نہیں بستا۔ وہ ہمارے اندر موجود ہے، ہم میں سے ہر کسی کے اندر۔ اسی وجہ سے وہ کبھی ہمیں تنہا نہیں چھوڑتا۔ وہ خود اپنے آپ کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟"

"لیکن وہ واقعی تنہا چھوڑ دیتا ہے۔" سرائے کے مالک نے اپنی سرد اور سرکش نگاہوں کے ساتھ تبصرہ کیا۔ "اگر خدا موجود ہے لیکن ہماری تکلیف پر وہ انگلی تک نہیں ہلاتا تو یہ بات اُس کے بارے میں ہمیں کیا بتاتی ہے؟"

"یہ پہلا اصول ہے برادر۔" میں نے کہا، "ہم خدا کو کیسے دیکھتے ہیں، یہ اس بات کا براہِ راست عکس ہے کہ ہم خود کو کیسے دیکھتے ہیں۔ اگر خدا کے نام پر ہمارے ذہن میں خوف اور ملامت ہی آتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے اندر بہت خوف و ملامت جمع ہو چکے ہیں۔ اگر ہم خدا کو محبت اور رحم سے بھرا دیکھتے ہیں تو ہم بھی ایسے ہی ہیں۔"

سرائے کے مالک نے فوراً اعتراض کیا لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ میرے الفاظ نے اُسے حیران ضرور کر دیا تھا۔ ''یہ اس بات سے کیسے مختلف ہے کہ خدا ہمارے تخیل کی پیداوار ہے؟ میں سمجھ نہیں پایا۔''

لیکن میرے جواب میں وہ ہلچل مخل ہوئی جو اندر دالان میں اٹھی تھی۔ جب ہم اُس سمت میں مڑے تو ہمیں دکھائی دیا کہ دو غیر مہذب سے آدمی نشے کے عالم میں ہذیان بک رہے تھے۔ وہ سرکش ڈھٹائی کے ساتھ دوسرے گاہکوں کو دھمکا رہے تھے، ان کے پیالوں سے کھانا چھین رہے تھے، ان کے پیالوں سے پی رہے تھے اور اگر کوئی احتجاج کرتا تو مکتب کے دو شرارتی لڑکوں کی طرح اُن کا مذاق اڑا رہے تھے۔

''کسی کو ان فسادیوں سے نمٹنا چاہیے، تم کیا کہتے ہو؟'' سرائے کا مالک اپنے دانتوں کو بھینچ کر پھنکارا۔ ''اب، مجھے دیکھو!''

ایک لمحے میں وہ دالان کے آخری سرے پر پہنچا، ایک نشے میں چور گاہک کو اُس کی نشست سے اٹھایا اور اُس کے چہرے پر مکا دے مارا۔ وہ آدمی ضرور اس سب کی توقع نہ کر رہا ہو گا کیوں کہ وہ کسی خالی بوری کی طرح فرش پر گر گیا۔ اُس کے ہونٹوں سے ہلکی سی آہ نکلی جو بہ مشکل سنائی دی اور اس کے سوا اُس نے کوئی شور نہ کیا۔

دوسرا آدمی نسبتاً طاقت ور ثابت ہوا اور اُس نے پوری شدت سے لڑائی کی لیکن سرائے کے مالک کو اُسے بھی ہرانے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اُس نے اپنے غیر مہذب گاہک کی پسلیوں میں لات ماری اور پھر اُس کے ہاتھ پر پیر رکھ کر اُسے اپنے بھاری جوتوں سے کچلا۔ ہمیں انگلیاں چٹخنے کی آواز سنائی دی یا کچھ اس سے زیادہ۔

''رک جاؤ!'' میں بے ساختہ بولا، ''تم اسے جان سے مار دو گے۔ کیا تم یہی چاہتے ہو؟''

ایک صوفی کے طور پر میں نے زندگی کی حفاظت کرنے اور کسی کو نقصان نہ پہنچانے کا حلف اٹھایا تھا۔ اس فریب خیال بھری دنیا میں بہت سے لوگ بغیر کسی سبب کے بلا مقصد لڑنے کے لیے تیار تھے اور بہت سے ایسے تھے جو کسی سبب سے لڑتے تھے۔ لیکن صوفی ایک ایسا شخص تھا جو کسی سبب کے ہوتے ہوئے بھی نہ لڑتا۔ کوئی صورت نہ تھی کہ میں خود تشدد کی راہ اپناتا۔ مگر میں خود کو سرائے کے مالک اور اُس کے گاہکوں کے درمیان کسی نرم کمبل کی طرح گھسا سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے دُور رہیں۔

''تم ان سب سے پرے رہو درویش یا پھر میں تمہارا ابھی مار مار کر حشر کر دوں گا!'' سرائے کا مالک چلایا۔ مگر ہم دونوں جانتے تھے کہ وہ ایسا کچھ نہ کرتا۔

چند ثانیے بعد جب خدمت گار لڑکوں نے دونوں گاہکوں کو اٹھایا تو ایک کی انگلیاں ٹوٹ چکی تھیں جب کہ دوسرے کی ناک اور ہر طرف خون پھیلا ہوا تھا۔ دالان میں ایک خائف سی خاموشی اتر آئی۔ اپنے اس رعب پر متفاخر، جو اُس نے سب پر طاری کیا تھا، سرائے کے مالک نے ایک ترچھی نگاہ مجھ پر

ڈالی۔ جب وہ دوبارہ بولا تو یوں لگا جیسے وہ آس پاس ہر کسی سے مخاطب تھا، اُس کی آواز بلند اور سرکش تھی، کھلے آسمان میں چلاتے کسی حملہ آور پرندے کی طرح۔

''تم نے دیکھا درویش، ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ تشدد میرا عنصر نہیں تھا مگر اب ہے۔ جب خدا یہاں نیچے موجود ہم لوگوں کو فراموش کر دیتا ہے تو ہمیں سخت بنانے اور انصاف بحال کرنے کو یہ عنصر ہم عام لوگوں پر مسلط ہو جاتا ہے۔ سو اگلی مرتبہ جب خدا سے بات کرو تو اُسے یہ بتا دینا۔ اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ اپنی بھیڑوں کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ عاجزی سے ذبح کیے جانے کی منتظر نہیں رہیں گی۔ وہ بھیڑیوں میں بدل جائیں گی۔''

میں نے دروازے کی طرف جاتے کندھے اچکائے۔ ''تم غلطی پر ہو۔''

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں کہ میں کبھی بھیڑ تھا جو اب بھیڑیا بن گیا؟''

''نہیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں بلاشبہ دیکھ سکتا ہوں کہ تم بھیڑیے بن چکے ہو۔ لیکن تم یہ غلط کہہ رہے ہو کہ جو تم کر رہے ہو، وہ ''انصاف'' ہے۔''

''رکو، میری تم سے بات ابھی ختم نہیں ہوئی!'' میری پشت پر سرائے کا مالک چلایا، ''تم میرے مقروض ہو۔ کھانے اور بستر کے بدلے تمہیں میرے خوابوں کی تعبیر بتانا تھی۔''

''میں اس سے بہتر کچھ کروں گا۔'' میں نے مشورہ دیا، ''میں تمہارا ہاتھ دیکھوں گا۔''

اُس کی جلتی آنکھوں میں دیکھتے میں مڑ کر اُس کی طرف واپس آیا۔ جبلی طور پر، بے اعتباری سے وہ جھجک کر پیچھے ہوا۔ پھر بھی میں نے اُس کا دایاں ہاتھ گرفت میں لیا اور ہتھیلی سیدھی کی، اُس نے مجھے پرے نہ دھکیلا۔ میں نے لکیروں کا جائزہ لیا اور انہیں گہرے، چٹخنے ہوئے اور غیر ہموار راستے پایا۔ ذرا ذرا کر کے اُس کی شخصیت کے ہالے کے رنگ مجھ پر آشکار ہوئے: خاکستری بھورا اور نیلا، اس قدر ہلکا کہ وہ تقریباً سرمئی تھا۔ اُس کی روحانی توانائی کھوکھلی ہو چکی تھی، کنارے ہلکے کمزور تھے، یوں جیسے اُس میں بیرونی دنیا سے اپنے دفاع کے لیے مزید سکت نہ رہی تھی۔ اپنے باطن میں وہ شخص کسی مرجھاتے پودے سے زیادہ زندہ نہ تھا۔ اپنی روحانی توانائی کے نقصان کو پورا کرنے کے لیے اُس نے اپنی جسمانی طاقت بڑھائی تھی جسے وہ حد سے زیادہ استعمال کرتا تھا۔

میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا کیوں کہ مجھے کچھ دکھائی دینا شروع ہو چکا تھا۔ پہلے دھندلا سا، یوں جیسے پردے کے پیچھے پھر بڑھتی ہوئی وضاحت کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے ایک منظر نمودار ہوا۔

ہلکے بھورے بالوں والی ایک لڑکی، گودے ہوئے سیاہ نقش والے عریاں پیر اور اُس کے شانوں پر پھیلی کشیدہ کاری والی سرخ شال۔

''تم نے اپنی محبوب کو کھو دیا ہے۔'' میں نے کہا اور اُس کی بائیں ہتھیلی تھام لی۔

اُس کی دودھ سے بھری چھاتیاں اور اُس کا پیٹ اس قدر پھولا ہوا جیسے پھٹ جائے گا۔ وہ

آگ میں گھرے جھونپڑے میں پھنسی ہے۔ گھر کے گرد جنگجو ہیں، نقرئی زردوزی زین والے گھوڑوں پر سوار۔ سوکھے چارے اور انسانی گوشت کے جلنے کی بوجھل بُو۔ منگول گھڑسوار، ان کی چپٹی اور پھیلی ہوئی ناکیں، موٹی اور اندر کو گھسی گردنیں اور پتھروں جیسے سخت دل۔ چنگیز خان کی طاقت ور فوج۔

''تم نے اپنے دو پیاروں کو کھویا ہے۔'' میں نے اپنی تصحیح کی، ''تمہاری بیوی تمہارے پہلے بچے سے حاملہ تھی۔''

اُس کی تنی بھنویں سیدھی ہو گئیں، اُس کی آنکھیں اپنے چمڑے کے جوتوں پر جم گئیں اور اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ سرائے کے مالک کے چہرے پر کسی پڑھنے کے ناقابل نقشے جیسی لکیریں پڑ گئیں۔ اچانک وہ اپنی عمر سے برسوں بڑا دکھائی دینے لگا۔

''مجھے ادراک ہے کہ تمہیں اس سے کوئی دلاسا نہ ملے گا مگر میرا خیال ہے کہ کچھ ہے جو تمہیں جاننا چاہیے۔'' میں نے کہا، ''اُس کی جان آگ کے دھوئیں نے نہیں لی تھی۔ اُس کے سر پر چھت کی لکڑی کا ایک تختہ آ گرا تھا۔ وہ فوراً ہی مر گئی تھی، بغیر کسی تکلیف کے۔ تم نے ہمیشہ خیال کیا کہ اُسے بڑی اذیت ہوئی ہوگی لیکن حقیقت میں اُسے ذرہ برابر تکلیف نہ ہوئی تھی۔''

سرائے کے مالک نے کسی ایسے بوجھ سے جھکے جسے صرف وہی سمجھ سکتا تھا، اپنی بھنویں اچکالیں۔ اُس کا لہجہ یہ پوچھتے چڑچڑا سا ہو گیا۔ ''تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟''

میں نے سوال نظر انداز کر دیا۔ ''تم اُس کی مناسب تدفین نہ کرنے پر خود کو الزام دیتے رہے ہو۔ تم اُسے اب بھی اپنے خوابوں میں، رینگ کر اُس گڑھے سے نکلتے ہوئے دیکھتے ہو، جہاں وہ دفن کی گئی تھی۔ لیکن تمہارا دماغ تمہارے ساتھ کھیل رہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ تمہاری بیوی اور بیٹا دونوں ٹھیک ہیں، ابدیت میں سفر کرتے، روشنی کے کسی دھبے کی طرح آزاد۔''

میں نے پھر ہر لفظ کو ناپتے تولتے مزید کہا، ''تم دوبارہ بھیڑ بن سکتے ہو کیوں کہ وہ ابھی بھی تمہارے اندر موجود ہے۔''

یہ سن کر سرائے کے مالک نے اپنا ہاتھ یوں پرے کھینچ لیا جیسے اُس نے کسی گرم برتن کو چھو لیا ہو۔ ''میں تمہیں پسند نہیں کرتا درویش۔'' وہ بولا، ''میں تمہیں آج رات یہاں قیام کرنے دوں گا۔ لیکن یاد رکھو، صبح ہوتے ہی چلے جانا۔ میں تمہاری صورت دوبارہ یہاں نہیں دیکھنا چاہتا۔''

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب آپ سچ بولتے تو لوگ آپ سے نفرت کرنے لگتے تھے۔ آپ جتنا محبت کے بارے میں بات کریں گے، لوگ اتنی ہی آپ سے نفرت کریں گے۔

ایلا

نارتھمپٹن، 18 مئی 2008ء

ڈیوڈ اور جینٹ کے ساتھ ہونے والی بحث کے بعد تناؤ سے پریشان ایلا اس قدر تھک چکی تھی کہ اُسے تھوڑی دیر کو دلکش کفر کا مطالعہ ترک کرنا پڑا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے کسی ابلتے برتن کا ڈھکن اچانک اٹھا دیا گیا ہو جس سے پرانے تنازعے اور نئی ناراضیاں بھاپ کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ بدقسمتی سے وہ ڈھکن اٹھانے والا کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود ہی تھی۔ اور ایسا اُس نے سکاٹ کا نمبر ملا کر اور اُسے اپنی بیٹی سے شادی کرنے سے منع کر کے کیا تھا۔

اپنی آنے والی زندگی میں اسے فون پر کی گئی اُس گفتگو کے دوران اپنی کہی گئی ہر بات پر گہرا تاسف ہوتا۔ لیکن مئی کے اُس روز اُسے خود پر اور اپنے پیروں تلے زمین پر اس قدر یقین اور بھروسا تھا کہ وہ اس دخل در معقولات کے سنگین نتائج کا اندازہ تک نہ کر سکی۔

''ہیلو سکاٹ، میں جینٹ کی مام، ایلا ہوں۔'' اُس نے خوش مزاج نظر آنے کی کوشش کرتے یوں کہا جیسے اپنی بیٹی کے بوائے فرینڈ سے فون پر بات کرنا اُس کا معمول تھا۔ ''کیا تم مجھ سے ذرا دیر بات کر سکتے ہو؟''

''مسز روبن سٹین، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' حیران مگر ہمیشہ سے زیادہ تمیز دار سکاٹ ہکلا کر بولا۔

اور اتنے ہی مہذب لہجے میں ایلا نے اُسے بتایا کہ اگرچہ وہ ذاتی طور پر اُس کے خلاف نہ تھی مگر وہ اُس کی بیٹی سے شادی کے لیے بے حد نوعمر اور ناتجربہ کار تھا۔ اب جیسا کہ اس فون کال پر وہ پریشان ہوتا، ایلا نے مزید کہا کہ کسی روز مستقبل قریب میں وہ اس کی بات سمجھ جائے گا اور اُسے بروقت متنبہ کرنے پر اُس کا شکریہ ادا کرے گا۔ تب تک اُس نے اُسے برائے مہربانی شادی کا موضوع ترک کرنے اور فون پر کی گئی اس گفتگو کو خود تک محدود رکھنے کا کہا۔

ایک بوجھل کثیف خاموشی تھی۔

''مسز روبن سٹین، میرا نہیں خیال کہ آپ بات کو سمجھتی ہیں۔'' جب بالآخر سکاٹ کچھ کہنے کے قابل ہوا تو بولا، ''جینٹ اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

پھر وہی بات! لوگ اِس قدر احمق کیسے ہو سکتے ہیں کہ توقع کریں کہ محبت ان کے لیے ہر دروازہ کھول دے گی، ہر مشکل آسان کر دے گی؟ وہ محبت کو یوں دیکھتے تھے جیسے وہ جادو کی چھڑی ہو جو اپنے معجزانہ لمس سے سب کچھ ٹھیک کر سکتی تھی۔

لیکن ایلا نے یہ سب نہ کہا۔ اس کی بجائے وہ بولی، ''میں سمجھتی ہوں کہ تم کیا محسوس کرتے ہو، میرا یقین کرو میں جانتی ہوں۔ لیکن تم بے حد نوعمر ہو اور زندگی طویل ہے۔ کون جانتا ہے؟ کل تم کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو سکتے ہو۔''

''مسز روبن سٹین، میں گستاخی نہیں کرنا چاہتا لیکن کیا آپ نہیں سمجھتی ہیں کہ یہی اصول پھر سب کے لیے ہے، بشمول آپ کے؟ کون جانتا ہے؟ کل کو آپ بھی کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو سکتی ہیں۔''

ایلا بے ساختہ ہنس پڑی، اپنے ارادے سے اونچی آواز میں اور دیر تک وہ ہنستی رہی۔

''میں شادی شدہ عورت ہوں۔ میں زندگی بھر کے لیے انتخاب کر چکی ہوں۔ اسی طرح میرا شوہر بھی۔ اور یہی میرا نکتہ ہے۔ شادی ایک سنجیدہ فیصلہ ہے جس پر بے حد احتیاط سے غور کرنا چاہیے۔''

''کیا آپ مجھے بتا رہی ہیں کہ میں آپ کی بیٹی سے شادی نہ کروں جس سے میں محبت کرتا ہوں کیوں کہ کسی غیر قطعی مستقبل میں مَیں کسی نامعلوم دوسری لڑکی سے محبت کر سکتا ہوں؟'' سکاٹ نے جواب طلب کیا۔

گفتگو یہاں سے آگے مایوسی اور نا امیدی کی طرف مائل ہو گئی۔ جب آخرکار ایلا نے فون رکھا تو وہ کچن میں چلی گئی اور وہی کیا جو وہ ہمیشہ جذباتی طور پر مضطرب ہو کر کیا کرتی تھی: وہ کھانا پکانے لگی۔

☼

آدھے گھنٹے بعد اُسے اپنے شوہر کی فون کال موصول ہوئی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم نے سکاٹ کو فون کر کے اُسے ہماری بیٹی سے شادی سے منع کیا ہے۔ کہہ دو کہ تم نے ایسا نہیں کیا۔''

ایلا نے گہری سانس بھری۔ ''واہ، لفظ کتنی تیزی سے سفر کرتے ہیں۔ ہنی، مجھے وضاحت تو کرنے دو۔''

لیکن ڈیوڈ نے بے چینی سے اُس کی بات کاٹ دی، ''وضاحت کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔ تم نے جو کیا، غلط کیا۔ سکاٹ نے جینٹ کو بتا دیا اور اب وہ بہت پریشان ہے۔ وہ چند روز اپنے دوستوں کے پاس ٹھہرے گی۔ وہ ابھی تم سے ملنا نہیں چاہتی۔'' وہ ذرا دیر کو رکا۔ ''اور میں اُسے الزام نہیں دیتا۔''

اُس شام صرف جینٹ ہی نہیں تھی جو گھر واپس نہ آئی۔ ڈیوڈ نے ایلا کو ایک ٹیکسٹ میسج کے ذریعے اطلاع دی کہ اچانک کوئی ایمرجینسی ہو گئی تھی۔ ایمرجینسی کس نوعیت کی تھی، اس کی کوئی وضاحت اُس نے نہ کی تھی۔

ایسا کرنا اُس کی عادت نہ تھی اور اُن کی شادی میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ ایک کے بعد دوسری عورت سے فلرٹ کر سکتا تھا، اُن سے قربت رکھ سکتا تھا اور اپنا پیسہ اُن پر لٹا سکتا تھا، یہ سب وہ جانتی تھی مگر ہر شام وہ گھر آ کر میز پر اپنی جگہ ضرور سنبھالتا تھا۔ ان کے درمیان دراڑ کس قدر بھی گہری ہوتی، وہ ہمیشہ کھانا پکاتی اور جو کچھ بھی وہ اُس کی پلیٹ میں ڈال دیتی تھی، وہ ہمیشہ خوشی سے اور شکر گزاری سے کھاتا۔ ہر ڈنر کے آخر میں ڈیوڈ اُس کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولتا۔ ایک پُر خلوص شکریہ جسے وہ ہمیشہ اُس کی بے وفائیوں پر ایک ڈھکی چھپی معذرت کے طور پر لیتی۔ اُس نے ڈیوڈ کو معاف کر دیا۔ وہ ہمیشہ معاف کر دیتی تھی۔

یہ پہلی مرتبہ تھی کہ اُس کے شوہر نے اِس قدر اکھڑپن کا مظاہرہ کیا تھا اور ایلا نے اس تبدیلی پر خود کو مورد الزام ٹھہرایا۔ لیکن پھر ''احساسِ جرم'' ایلا روبن سٹین کا دوسرا نام تھا۔

☼

جب ایلا اپنے جڑواں بچوں کے ہمراہ میز پر بیٹھی تو اُس کا احساسِ جرم پژمردگی میں بدل گیا۔ اُس نے اوی کی پیزا آرڈر کرنے کی التجا اور اورلی کی کچھ بھی نہ کھانے کی کوششوں کا مقابلہ کیا اور انہیں سبز مٹر والے جنگلی چاول (Zizania) اور رائی والے بھنے ہوئے بیف کو کھانے پر مجبور کیا۔ اور اگرچہ بہ ظاہر وہ وہی فکر مندسی ماں تھی، اُسے اپنے اندر مایوسی کی ایک لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی اور اپنے منہ میں بائل جیسا تلخ، ایک تیز ذائقہ۔

ڈنر ختم ہونے کے بعد ایلا اپنے اردگرد موجود سکوت کو بوجھل اور پریشان کن محسوس کرتے ہوئے کچن کی میز پر اکیلی بیٹھی رہی۔ اچانک گھنٹوں کی محنت کا نتیجہ، وہ کھانا جو اُس نے پکایا تھا، وہ اُسے نہ صرف بے کیف اور بیزار کن بلکہ ایسا لگنے لگا جس کی جگہ آسانی سے لی جا سکتی تھی۔ اُسے اپنے لیے افسوس و ترحم محسوس ہوا۔ قابلِ ترس بات تھی کہ تقریباً چالیس برس کی عمر میں بھی وہ اپنی زندگی کا کچھ نہ کر پائی تھی۔ اُس کے پاس دینے کو بہت محبت تھی لیکن پھر بھی کوئی اس کا متقاضی نہ تھا۔

اُس کی سوچوں کا رخ دلکش کفر کی طرف چلا گیا۔ اُسے شمس تبریز کے کردار میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

''ایسے کسی شخص کا آس پاس ہونا خوب ہو سکتا ہے۔'' اُس نے خود سے مذاق میں کہا، ''ایسے شخص کے ہمراہ تو کوئی دن بے کیف نہ ہو گا!''

اور کسی طور اُس کے ذہن میں ابھرنے والا تصور ایک طویل قامت، گہری رنگت کے پُراسرار شخص کا تھا جو چمڑے کی پتلون اور موٹر سائیکل جیکٹ پہنے تھا اور اُس کے کندھوں تک گرتے سیاہ بال

تھے، جو چمکتی ہوئی سرخ ہارلے ڈیوڈسن پر سوار تھا، جس کے ہینڈل سے کئی رنگوں کے پھندنے سے لٹک رہے تھے۔ وہ اس تصویر پر مسکرا دی۔ ایک وجیہہ، پرکشش، صوفی موٹر سائیکل سوار خالی ہائی وے پر تیز رفتاری سے گامزن! اس قسم کے شخص سے مفت لفٹ لے کر سفر کرنا کیا خوب نہ ہوتا؟

پھر ایلا نے سوچا کہ اگر شمس تبریز اُس کے ہاتھ کی لکیریں پڑھتے تو وہ کیا دیکھتے۔ کیا وہ بتا پاتے کہ اُس کا دماغ کیوں وقتاً فوقتاً تاریک سوچوں کی آسیبی آماج گاہ بن جاتا ہے؟ یا اتنا بھرا پُرا محبت کرنے والا خاندان ہونے کے باوجود وہ اس قدر تنہائی کیوں محسوس کرتی تھی؟ اس کی شخصیت کے گرد ہالے کے رنگ کیسے تھے؟ کیا وہ شوخ اور کھلتے ہوئے رنگ تھے؟ کیا اُس کی زندگی میں کبھی کچھ شوخ اور کھلتا ہوا رہا تھا؟ کبھی بھی؟

وہیں کچن کی میز پر تنہا بیٹھے جہاں صرف اوون سے نکلتی مدھم سی روشنی کی جھلک تھی، ایلا کو ادراک ہوا کہ اپنے بلند آہنگ لفظوں میں اس کی نفی کرنے اور باوجود اپنے ہونٹ بھینچے رکھنے کی صلاحیت کے، اندر کہیں گہرائی میں، اُسے محبت کی چاہ تھی۔

شمس

سمرقند کے باہر ایک کارواں سرائے، مارچ 1242ء

برہنہ پیروں اور ہاتھوں پر سے پھلانگتا ہوا میں اپنے خالی بستر تک پہنچا جس سے پسینے اور پھپھوندی کی بُو آ رہی تھی۔ سرائے میں درجن بھر سے زائد مسافر اپنے خوابوں میں گم، اپنی تنہائی کے بوجھ تلے، محوِ خواب تھے۔ دن بھر کے واقعات پر غور کرتے اور اُن الہامی نشانیوں کے بارے سوچتے ہوئے جو شاید میں نے دیکھی تھیں لیکن اپنی عجلت یا بے خبری میں مَیں اُن سے محظوظ ہونے میں ناکام رہا تھا، میں وہاں تاریکی میں لیٹا رہا۔

لڑکپن سے مجھے کشف ہوتا تھا اور آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ میں ہمیشہ خدا سے محوِ کلام ہوا اور اُس نے ہمیشہ جواب دیا۔ کسی روز میں کسی سرگوشی کی طرح ہلکا پھلکا ہو کر ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ پھر میں مٹی کی مہک میں بھیگا ہوا، زمین کے گہرے ترین گڑھوں میں، پاتال میں جا اترا، کسی عظیم برگد یا اخروٹ کے درختوں تلے دفن پتھر کی طرح نہاں۔ ہر بار کھانے کے لیے میری اشتہا ختم ہو جاتی اور میں کئی کئی روز کچھ کھائے پیے بغیر زندہ رہتا۔ اس میں سے کسی بات نے مجھے کبھی خوف زدہ نہ کیا، اگرچہ وقت کے ساتھ میں نے سیکھ لیا تھا کہ اس کا ذکر دوسروں سے نہ کروں۔ انسان جس بات کو سمجھ نہ سکیں، اُس کی تحقیر کرنے لگتے ہیں۔ میں نے یہ بات کسی کے سمجھائے بغیر بلاواسطہ جان لی تھی۔

میرے کشف و الہام کو غلط سمجھنے والا پہلا شخص میرا باپ تھا۔ میں دس برس کا رہا ہوں گا جب مجھے اپنا محافظ فرشتہ روزانہ دکھائی دینے لگا اور میں اس قدر سادہ تھا کہ میں نے سوچا کہ باقی سب کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہوگا۔ ایک روز جب میرے بابا مجھے سکھا رہے تھے کہ دیودار کی لکڑی سے صندوق کیسے بنایا جائے تاکہ میں بھی اُن کی طرح بڑھئی بن سکوں تو میں نے انہیں اپنے محافظ فرشتے کے بارے میں بتایا۔

''تمہارا تخیل بے لگام ہے بیٹے۔'' میرے بابا نے خشک لہجے میں کہا، ''اور بہتر ہو کہ تم یہ بات خود اپنے تک رکھو۔ ہم دیہاتیوں کو دوبارہ پریشان نہیں کرنا چاہتے۔''

چند روز قبل ہمسایوں نے میرے ماں باپ سے میری شکایت کی تھی، انہوں نے الزام لگایا کہ میرا رویہ عجیب تھا اور میں اُن کے بچوں کو ڈرا دیتا تھا۔

''مجھے تمہارے طور طریقے سمجھ نہیں آتے میرے بیٹے۔ تم یہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ تم اپنے ماں باپ سے زیادہ غیر معمولی نہیں ہو؟'' میرے بابا نے پوچھا، ''ہر بچہ اپنے ماں اور باپ جیسا ہوتا ہے۔ سو تم بھی ایسے ہی ہو۔''

تب ہی مجھے ادراک ہوا کہ اگر چہ مجھے اپنے والدین سے محبت تھی اور میں اُن کی محبت چاہتا تھا، وہ میرے لیے اجنبی تھے۔

''بابا، میں آپ کے دوسرے بچوں سے مختلف ہوں۔ مجھے بطخ کا وہ بچہ سمجھیں جسے مرغیوں نے پروان چڑھایا ہو۔ میں کوئی پالتو پرندہ نہیں ہوں جس کا نصیب مرغیوں کے ڈربے میں زندگی گزار دینا ہو۔ وہ پانی جو آپ کو دہشت زدہ کرتا ہے، مجھے نئے سرے سے زندگی دیتا ہے۔ کیوں کہ آپ کے برعکس میں تیر سکتا ہوں اور تیروں گا۔ سمندر میرا وطن ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ ہیں تو سمندر کی طرف چلیں۔ اگر نہیں تو میرے معاملے میں دخل اندازی چھوڑ دیں اور مرغیوں کے ڈربے میں واپس چلے جائیں۔''

میرے بابا کی آنکھیں پھیل گئیں، پھر سکڑیں اور سرد ہو گئیں۔ ''اگر تم اپنے باپ سے اب اس طرح بات کرتے ہو۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا، ''تو مجھے حیرت ہے کہ جب تم بڑے ہو گے تو اپنے دشمنوں سے کیسے بات کرو گے۔''

میرے بڑے ہونے پر مجھے ہونے والے کشف ختم نہ ہوئے تو میرے ماں باپ کو جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اس کے برعکس وہ زیادہ پُر شدت اور زیادہ پُر تجسس ہو گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میرے والدین میری وجہ سے گھبرا گئے تھے اور مجھے انہیں پریشان کرنے پر احساسِ خطا بھی ہوتا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ ان کشف کو میں ختم کیسے کرتا اور میں جانتا بھی تو میرا نہیں خیال کہ میں ایسا کرتا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ میں نے اپنے گھر کو چھوڑ دیا۔ تب سے تبریز ایک صاف و شیریں لفظ بن چکا ہے، اس قدر نفیس اور نازک کہ وہ میری زبان پر پگھل جائے۔ اس مقام کی یادوں کا ساتھ تین خوشبوئیں دیتی ہیں، کٹی ہوئی لکڑی کی خوشبو، خشخاش کی روٹی کی اور برف کی نرم سوختہ مہک۔

تب سے میں ایک سرگرداں درویش ہوں، میں کبھی ایک مقام پر دوسری بار نہیں سویا، کبھی ایک ہی پیالے سے متواتر دو بار نہیں کھایا، ہر روز اپنے گرد مختلف چہرے دیکھتے ہوئے سفر میں رہا۔ جب بھوک لگے تو میں خوابوں کی تعبیر بتا کر چند سکے کما لیتا ہوں۔ اس حالت میں میں مشرق اور مغرب میں گھومتا ہوں، ہر جگہ خدا کی جستجو میں سرگرداں۔ ہر جگہ میں جینے کے قابل زندگی اور جاننے کے قابل علم تلاش کرتا ہوں۔ چوں کہ میری جڑیں کہیں نہیں، اس لیے جانے کو میرے پاس ہر جگہ ہے۔

اپنے سفر کے دوران میں نے ہر قسم کے راستوں پر سفر کیا ہے، مشہور تجارتی راستوں سے لے

کر فراموش شدہ راہوں تک جہاں کئی کئی روز تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیتا۔ بحیرۂ اسود کے ساحلوں سے فارس کے شہروں تک، مشرقِ وسطیٰ کے وسیع سبزہ زاروں سے عرب کے ریت کے ٹیلوں تک، میں گھنے جنگلوں سے گزرا؛ مسطح گیاہ زاروں سے اور صحراؤں سے؛ میں نے کارواں سرائے اور مسافر خانوں میں وقتی قیام کیا؛ قدیم کتب خانوں میں صاحب علم لوگوں سے بات چیت کی؛ مکتبوں میں ننھے بچوں کو پڑھاتے اساتذہ کو سنا؛ مدرسوں کے طلبا سے تفسیر اور منطق پر بحث کی؛ معبدوں، درگاہوں اور خانقاہوں پر گیا؛ گوشہ نشینوں کے ہمراہ اُن کی خانقاہوں میں مراقبہ کیا؛ درویشوں کے ہمراہ ذکر میں شریک ہوا؛ نیکوکاروں کے ہمراہ روزے رکھے اور کافروں کے ساتھ کھانا کھایا؛ پورے چاند تلے شامانوں کے ساتھ رقص کیا؛ ہر عقیدے، دَور اور پیشے کے لوگوں کو جانا اور آفتوں اور معجزوں کا یکساں شاہد بنا۔

میں نے غربت زدہ گاؤں، آگ سے سیاہ پڑے کھیت اور غارت شدہ شہر دیکھے، جہاں دریا لہو سے سرخ ہو گئے تھے اور دس برس سے زیادہ عمر کا کوئی لڑکا یا مرد زندہ نہ بچا تھا۔ میں نے انسانیت کو اس کے اسفل اور اعلیٰ ترین عالم میں دیکھا ہے۔ اب کوئی بات مجھے حیرت زدہ نہیں کرتی۔

اِن تمام تجربات سے گزرتے میں نے ایک فہرست ترتیب دینا شروع کی جو کسی کتاب میں نہیں لکھی تھی بس میری روح پر تحریر تھی۔ یہ فہرست جسے میں ''سرگرداں یا قلندری مسلمان صوفیوں کے بنیادی اصول'' کہتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ قوانین فطرت کی طرح آفاقی، قابل بھروسا اور اٹل تھے۔ یہ مل کر مذہب عشق کے چالیس اصول بناتے تھے جن کی تکمیل صرف اور صرف محبت کے ذریعے ممکن ہو سکتی تھی۔ اور ان میں سے ایک اصول کے مطابق ''سچائی کا راستہ دماغ کی نہیں، دل کی متواتر مشقت ہے۔ دماغ کو نہیں بلکہ اپنے دل کو اپنا رہنما، اپنا مرشد بنالو! اپنے نفس سے ملو، اسے للکارو اور بالآخر دل کے ذریعے اس پر غالب آجاؤ۔ یہ جانتے ہوئے کہ تمہاری ذات کی معرفت خدا کی معرفت کی طرف تمہاری رہنمائی کرے گی۔''

اور ان اصولوں پر کام مکمل کرنے میں مجھے برسوں لگ گئے۔ ان تمام چالیس اصولوں پر۔ اور جب کہ میں یہ کام مکمل کر چکا تھا، میں جانتا تھا کہ میں اس دنیا میں اپنے آخری مرحلے کے قریب تھا۔ کچھ عرصے سے مجھے اس رخ پر بہت سے کشف ہوتے رہے تھے۔ مجھے فکر میں مبتلا کرنے والی شے موت نہیں کیوں کہ میں اسے اختتام کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ فکر مندی کی بات تھی اپنے پیچھے کوئی وراثت چھوڑے بغیر مرنا۔ میرے سینے میں الفاظ کے ڈھیر جمع تھے، کہنے کو منتظر کہانیاں۔ میں یہ سارا علم کسی دوسرے شخص کو سونپنا چاہتا تھا، کوئی استاد نہ ہی شاگرد۔ مجھے کسی ہمسر کی تلاش تھی ... کوئی رفیق۔

''اے خدا!'' میں نے تاریک اور حبس زدہ کمرے میں سرگوشی کی، ''تا عمر میں نے دنیا جہاں کا سفر کیا اور تیری راہ کی پیروی کی۔ میں نے ہر شخص کو ایک کھلی کتاب کی طرح، کسی چلتے پھرتے قرآن کی صورت دیکھا۔ میں علما کے مرمریں منبروں سے دُور رہا اور بے خانماں، دربدر اور جلاوطن لوگوں کے ساتھ

وقت گزارنے کو ترجیح دی۔ اب میرا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ میری مدد فرما کہ میں تیرا دیا علم کسی صحیح شخص کو منتقل کر سکوں۔ پھر جو تو چاہے میرے ساتھ کر سکتا ہے۔''

میری آنکھوں کے سامنے کمرا اس قدر روشنی میں نہا گیا کہ اپنے بستروں میں دراز مسافروں کے چہرے پر وحشت ناک حد تک مردنی چھا گئی۔ اندر موجود ہوا تازہ اور حیات بخش ہو گئی، یوں جیسے تمام کھڑکیاں کھول دی گئی ہوں اور کوئی طوفانی ہوا دور دراز کے باغات سے نرگس اور یاسمین کی خوشبو سمیٹ لائی ہو۔

''بغداد چلے جاؤ۔'' میرے محافظ فرشتے نے سریلی گنگناتی آواز میں کہا۔

''بغداد میں کیا شے میری منتظر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے ایک رفیق کے لیے دعا کی تھی اور ایک رفیق تمہیں عطا کیا جائے گا۔ بغداد میں تمہیں ایک مرشد ملے گا، جو درست سمت میں تمہارے لیے نشان دہی کرے گا۔''

میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو بھر آئے۔ اب میں جان گیا کہ میرے کشف میں موجود آدمی میرے روحانی ساتھی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ جلد یا بدیر، ہمارے نصیب میں ملنا تھا، اور جب ہم ملتے تو میں جان لیتا کہ اُس کہ مہربان بادامی آنکھوں میں ابدی اداسی کیوں تھی اور آغاز بہار کی ایک شب میرا قتل کیسے ہونا تھا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 19 مئی 2008ء

سورج کے غروب ہونے اور بچوں کے گھر واپس لوٹنے سے پہلے ایلا نے مسودے میں بک مارک رکھا اور ''دلکش کفر'' کو ایک طرف رکھ دیا۔ ناول لکھنے والے آدمی کے بارے میں متجسس ہو کر وہ آن لائن ہوئی اور یہ سوچتے اور حیران ہوتے کہ تلاش میں کیا نکلے گا مگر زیادہ توقع نہ کرتے ہوئے گوگل پر A.Z. Zahara کا نام تلاش کیا۔

اُسے حیرت ہوئی جب تلاش میں اُسے ایک پرسنل بلاگ مل گیا۔ صفحے کے غالب رنگ بنفشی اور سبزی مائل فیروزی تھے اور صفحے کے عین اوپر کسی آدمی کی تصویر لمبا سفید لبادہ پہنے دھیرے دھیرے گھوم رہی تھی۔ ایلا نے پہلے کبھی رقصاں درویش نہ دیکھا تھا، سو اُس نے غور سے تصویر کو دیکھا۔ بلاگ کا نام تھا: An Eggshell Named Life (زندگی نامی انڈے کا خول) اور اس کے نیچے اسی عنوان کی ایک نظم تحریر تھی:

''آؤ، ہم ایک دوسرے کو رفیق چن لیں!
آؤ، ہم ایک دوسرے کے قدموں میں بیٹھ جائیں!
باطنی طور پر ہم میں بہت ہم آہنگی ہے....
مت سوچو کہ ہم بس وہی ہیں جو ہم دیکھتے ہیں۔''

بلاگ، دنیا بھر کے شہروں اور مقامات کے پوسٹ کارڈز سے بھرا ہوا تھا۔ ہر پوسٹ کارڈ کے نیچے اس مخصوص جگہ کے بارے میں تبصرے تھے۔ انہیں پڑھتے ہوئے ایلا کو تین ایسی باتیں معلوم ہوئیں جنھوں نے فوری اُس کی توجہ حاصل کر لی: پہلی یہ کہ اے زی ظہارا میں اے عزیز کا مخفف تھا۔ دوسری یہ کہ عزیز خود کو صوفی کہتا تھا۔ تیسری یہ کہ اس وقت وہ گوئٹے مالا میں کہیں سفر کر رہا تھا۔

ایک اور سیکشن میں اُس کی لی گئی تصویروں میں سے کچھ پوسٹ کی گئی تھیں۔ زیادہ تر ہر رنگ و

نسل کے لوگوں کی پورٹریٹس تھیں۔ اپنے یکسر فرق کے باوجود ایک پُرتجسس انداز میں وہ سب ایک دوسرے سے مشابہ تھے: تمام پورٹریٹس میں سب لوگوں میں واضح طور پر کچھ کمی تھی۔ کچھ میں عام سی چیزیں جیسا کہ ائیر رنگ، کوئی جوتا یا کوئی بٹن غائب تھیں جب کہ دوسروں میں زیادہ اہم جیسا کہ کسی کا دانت، کسی کی انگلی یا کسی کی ٹانگ غائب تھے۔ تصویروں کے نیچے لکھا تھا:

''ہم چاہے جو کوئی بھی ہیں اور جہاں کہیں ہیں، اپنے اندر کہیں ہم سب خود کو نامکمل محسوس کرتے ہیں۔ یوں جیسے ہم نے کچھ کھو دیا ہے اور سب واپس حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بس یہ کہ ہم میں سے بیشتر کبھی نہیں جان پاتے کہ وہ کیا شے ہے جو کھو گئی ہے۔ اور وہ جو جان لیتے ہیں، اُن میں سے بھی بہت کم ہیں جو اُس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔''

ایلا نے اُس پیج کا جائزہ لیا، ہر پوسٹ کارڈ پر کلک کر کے اُسے بڑا کر کے دیکھا اور عزیز کے کیے گئے ہر تبصرے کو پڑھا۔ پیج کے نچلے حصے پر ایک ای میل ایڈریس درج تھا جو اُس نے نوٹ کر لیا AzizZzahara@gmail.com۔ اس کے برابر میں اُسے مولانا رومی کی ایک نظم ملی:

''محبت کا انتخاب کرو، محبوب!
محبت کی شیریں زندگی کے بغیر، جینا ایک بوجھ ہے...
جیسا کہ تم دیکھ ہی چکے ہو۔''

یہ پڑھتے ہوئے اُس کے ذہن میں ایک انتہائی عجیب خیال کا جھماکا سا ہوا۔ لمحے بھر کو اُسے محسوس ہوا کہ جیسے اپنے ذاتی بلاگ پر اے زی ظہارا نے جو کچھ لکھا یا شامل کیا تھا... تصویریں، تبصرے، اقتباسات اور نظمیں... وہ صرف اُس کی نگاہوں کے لیے لکھے گئے تھے۔ وہ ایک عجیب اور قدرے نخوت بھرا خیال تھا مگر ایسا خیال جو اُس کے لیے معانی رکھتا تھا۔

☼

اُس سہ پہر ایلا کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی، اُسے ذرا تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ تیز دھوپ کی طرف اُس کی پشت تھی اور کچن میں فضا اُن براؤنیز کی مہک سے بوجھل تھی جو وہ تیار کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے سامنے Sweet Blasphemy کھول رکھی تھی لیکن اُس کے دماغ پر خیالوں کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ مسودے پر اپنی توجہ مرکوز نہ کر پا رہی تھی۔ اُسے خیال آیا کہ اُسے بھی اپنے بنیادی اصول لکھنے چاہئیں۔ وہ انہیں انتہائی لگی بندھی زندگی والی فطری گھریلو خاتون کے چالیس اصول کا نام دے سکتی تھی۔

''اصول نمبر ایک۔'' وہ زیرِ لب بولی، ''محبت کی تلاش چھوڑ دو! ناممکن خوابوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو۔ ایک شادی شدہ عورت جو چالیس برس کی ہونے کو ہے، اُس کے پاس زندگی میں کرنے کو یقیناً زیادہ اہم کام ہیں۔''

لیکن اُس کے اپنے ہی اس لطیفے نے ایلا کو ہلکا سا بے آرام کر دیا، اُسے زیادہ بڑی فکروں کی

یاد دلائی۔ خود کو روکنے میں ناکام ہو کر اُس نے اپنی بڑی بیٹی کو فون کیا اور آنسرنگ مشین پر اس کے لیے پیغام چھوڑا۔

''جینٹ ڈیئر، میں جانتی ہوں کہ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے سکاٹ کو فون کیا۔ لیکن میری نیت بری نہ تھی۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ...''

پچھتاتے ہوئے کہ اُس نے یہ پیغام پہلے سے سوچ کر تیار نہ کیا تھا، وہ رک گئی۔ پس منظر میں وہ پیغام ریکارڈ کرتی مشین کی ہلکی سی سرسراہٹ سن سکتی تھی۔ اسے یہ سوچ کر گھبراہٹ ہوئی کہ ٹیپ چل رہی تھی اور وقت کم ہوتا جا رہا تھا۔

''جینٹ، جو کچھ میں نے کیا، مجھے اس پر افسوس ہے۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے اس قدر نعمتیں ملی ہیں کہ مجھے شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن بات بس یہ ہے کہ میں بے حد... ناخوش ہوں...''

کلک۔ آنسرنگ مشین رک گئی۔ ایک صدمے کے عالم میں ایلا کا دل یکدم سکڑ کر پھیلا۔ جو کچھ اُس نے ابھی کہا تھا، اس پر کیا خیال غالب آیا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ناخوش تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ افسردہ ہوتی اور خود اسے خبر نہ ہوتی؟ عجیب بات تھی کہ اُسے اپنی ناخوشی کے اعتراف پر کوئی ناخوشی نہ ہوئی تھی۔ آج کل وہ کچھ بھی محسوس نہ کر پا رہی تھی۔

اُس کی نگاہ پھسل کر کاغذ کے اُس پرزے تک گئی جس پر اُس نے عزیز زی ظہارا کا ای میل ایڈریس لکھا تھا۔ وہ پتہ سادہ، منکسر سا اور کسی طور پر پُرکشش لگتا تھا۔ زیادہ سوچے بغیر وہ اپنے کمپیوٹر کی طرف بڑھی اور ایک ای میل لکھنے لگی:

ڈیئر عزیز زی ظہارا،

میرا نام ایلا ہے۔ میں لٹریری ایجنسی کے لیے ایک قاری کی حیثیت سے آپ کا ناول ''دلکش کفر'' پڑھ رہی ہوں۔ میں نے ابھی اسے شروع ہی کیا ہے اور اس سے بے حد لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ تاہم یہ میری ذاتی رائے ہے اور میرے باس کے خیالات کی عکاس نہیں۔ مجھے آپ کا ناول پسند آئے یا نہیں، میں اس حتمی فیصلے پر بہ مشکل ہی اثر انداز ہوں گی کہ آیا ہم آپ کو ایک کلائنٹ کے طور پر لیں گے یا نہیں۔

یوں لگتا ہے کہ جیسے آپ کا خیال ہے کہ محبت زندگی کا جوہر ہے اور یہ کہ باقی کسی شے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس معاملے پر آپ سے کسی لاحاصل بحث میں الجھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ میں مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتی۔ لیکن میں جو آپ کو ای میل لکھ رہی ہوں، اس کی یہ وجہ نہیں۔

میں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ ''دلکش کفر'' کے مطالعے کا وقت اس سے زیادہ منفرد نہ ہو سکتا تھا۔ ابھی ان ہی دنوں میں اپنی بڑی بیٹی کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اتنی کم عمری میں شادی نہ کرے۔ اگلے روز میں نے اُس کے بوائے فرینڈ کو اپنے شادی کے منصوبے کو منسوخ کرنے کا کہا تھا۔ اب میری بیٹی مجھ سے نفرت کرتی ہے اور مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ

دونوں محبت پر خاصے ایک سے خیالات رکھتے ہیں۔

معذرت خواہ ہوں کہ میں نے اپنے ذاتی کتے آپ کو سنا ڈالے۔ میرا ایسا ارادہ نہ تھا۔ آپ کا ذاتی بلاگ (جہاں سے مجھے آپ کا ای میل ایڈریس ملا ہے) بتاتا ہے کہ آپ گوئٹے مالا میں ہیں۔ دنیا جہاں کا سفر کرنا خاصا ہیجان خیز ہوگا۔ آپ کا اگر کبھی بوسٹن آنا ہو تو شاید ہم ذاتی طور پر مل سکیں اور کافی کے کپ پر بات چیت کر سکیں۔

خیر اندیش

ایلا

عزیز کو اس کی پہلی ای میل کسی خط سے زیادہ ایک دعوت نامہ تھی، جیسے کسی مدد کی پکار۔ لیکن کوئی صورت نہ تھی کہ تب ایلا یہ جانتی جب وہ ابھی اپنے کچن کی میز پر خاموشی سے بیٹھے ایک نامعلوم لکھاری کو ایک تحریر لکھ رہی تھی جس سے ملنے کی اسے آج یا مستقبل میں کوئی توقع نہ تھی۔

آفندی

بغداد، اپریل 1242ء

بغداد نے شمس تبریزی کی آمد پر کوئی توجہ کی لیکن میں اُس روز کو کبھی فراموش نہ کروں گا جب وہ ہماری معمولی سی درویش خانقاہ میں تشریف لائے۔ اُس سہ پہر ہمارے ہاں اہم مہمانوں کی آمد متوقع تھی۔ قاضی القضاۃ اپنے مصاحبوں کے ہمراہ آئے اور مجھے شبہ تھا کہ ان کی اس آمد کے پس پردہ تپاک کے سوا بھی کچھ تھا۔ صوفی ازم کے لیے اپنی ناپسندیدگی کے لیے مشہور قاضی مجھے یاددہانی کروانا چاہتے تھے کہ وہ مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے تھے، بالکل جیسے وہ علاقے کے تمام صوفیوں کو نظر میں رکھتے تھے۔

قاضی ایک پُرعزم شخصیت تھے۔ اُن کا چہرا چوڑا، پیٹ لٹکا ہوا اور چھوٹی اور موٹی انگلیاں تھیں جن میں سے ہر ایک میں بیش قیمت انگوٹھی تھی۔ انہیں زیادہ کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا لیکن میرا خیال تھا کہ کسی میں حتیٰ کہ طبیب میں بھی یہ جرأت نہ تھی کہ انہیں ایسا کوئی مشورہ دے پاتا۔ مذہبی علما کا ایک طویل نسبی سلسلہ رکھنے کے باعث وہ علاقے کے انتہائی بارسوخ لوگوں میں سے تھے۔ اپنے ایک فیصلے سے وہ کسی بھی آدمی کو پھانسی گھاٹ پر پہنچا سکتے تھے یا وہ اتنی ہی آسانی سے کسی سزا یافتہ کے جرائم معاف کر کے اُسے تاریک ترین زندانوں سے نکال سکتے تھے۔ ہمیشہ سمور کے چغے اور قیمتی ملبوسات پہنے وہ کسی ایسے شخص کے سے جاہ و جلال سے چلتے تھے جو اپنے اختیارات سے بہ خوبی آگاہ ہو۔ میں اُن کی اس انا پرستی کو پسند نہ کرتا تھا مگر اپنی خانقاہ کی بہتری کے لیے میں نے اس بارسوخ آدمی کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کی اپنی سی پوری کوشش کی تھی۔

''ہم دنیا کے عالی شان ترین شہر میں رہتے ہیں۔'' قاضی نے اپنے منہ میں انجیر ڈالتے ہوئے حتمی انداز میں کہا، ''آج بغداد منگول افواج سے بھاگتے پناہ گزینوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہم انہیں محفوظ پناہ گاہ فراہم کرتے ہیں۔ یہ دنیا کا مرکز ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں بابا زمان؟''

''یہ شہر ایک نگینہ ہے بے شک۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا، ''لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے

کہ شہر انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں، بچپن اور لڑکپن گزارتے ہیں، وہ بوڑھے ہوتے ہیں اور آخرکار مر جاتے ہیں۔ وقت کے اس لمحے میں بغداد اپنی نوجوانی کے آخری حصے میں ہے۔ ہم اتنے امیر نہیں رہے جتنے ہم خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں ہوا کرتے تھے، اگرچہ ہم اب بھی تجارت، صنعت گری اور شاعری کا مرکز ہونے پر کسی قدر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن کون جانے کہ اب سے ہزار برس بعد شہر کیسا دکھائی دے گا؟ سب کچھ بالکل مختلف ہو سکتا ہے۔''

''اس قدر قنوطیت!'' قاضی نے ایک اور پیالے کی طرف ہاتھ بڑھاتے اور کھجور اٹھاتے ہوئے اپنا سر ہلایا۔ ''عباسی حکومت جاری رہے گی اور ہم ترقی کریں گے۔ یعنی یقیناً اگر ہمارے درمیان موجود غدار بدستور صورت حال کو تہ و بالا نہ کر دیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو خود کو مسلمان کہتے ہیں مگر اُن کی اسلام کی تعبیر کافروں کے خطرے سے زیادہ خطرناک ہے۔''

میں نے خاموش رہنا مناسب جانا۔ یہ کوئی ڈھکا چھپا راز نہ تھا کہ قاضی کے خیال میں اسلام کی اپنی انفرادیت پسند اور تخیلی تعبیر کے باعث صوفیا فسادی لوگ تھے۔ اس نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم شرعی قوانین پر کان نہ دھرتے تھے اور یوں صاحبان اقتدار کی توہین کرتے تھے... اُس جیسے لوگوں کی۔ مجھے کبھی کبھار احساس سا ہوتا کہ وہ سب صوفیوں کو بغداد سے باہر نکال پھینکے گا۔

''آپ کی برادری بے ضرر ہے۔ لیکن کیا آپ کو نہیں لگتا کہ کچھ صوفی حد سے باہر ہیں؟'' قاضی نے اپنی ڈاڑھی سہلاتے ہوئے پوچھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا کیسے جواب دوں۔ شکر خدا کا کہ اُسی وقت مجھے دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ اڑے اڑے سنہری بالوں والا نومرید شاگرد تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور میرے کان میں سرگوشی کی کہ کوئی مہمان آیا تھا، ایک سرگرداں درویش جو مجھ سے ملنے پر مصر تھا اور اُس نے کسی اور سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

عام طور پر میں شاگرد کو اس نووارد کو کسی پُرسکون خیر مقدمی کمرے میں لے جانے، اُسے گرما گرم کھانا کھلانے اور مہمانوں کے رخصت ہونے تک انتظار کرنے کا کہتا۔ لیکن چوں کہ قاضی مجھے مشکل میں ڈال رہا تھا، مجھے خیال ہوا کہ سرگرداں درویش دُور دراز سرزمینوں کی رنگ برنگی کہانیاں سنا کر کمرے میں پھیلے تناؤ کو زائل کر دیتا۔ سو میں نے نومرید شاگرد کو اُس آدمی کو یہیں لانے کا کہہ دیا۔

چند ساعت بعد دروازہ کھلا اور سر تا پیر سیاہ رنگ میں ملبوس ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ دبلا پتلا اور لاغر سا جس کی عمر کا اندازہ مشکل تھا، اس کی ناک تیکھی تھی، آنکھیں گھور سیاہ اور سیاہ ہی بال جو گھنگھرالی زلفوں کی صورت اُس کی آنکھوں میں پڑ رہے تھے۔ اُس نے ایک لمبی سی ٹوپی والی چادر اوڑھ رکھی تھی، لباس اُونی اور جوتے بھیڑ کی کھال کے تھے۔ اُس کی گردن میں کئی تعویز لٹکے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں لکڑی کا کشکول تھا، اُس قسم کا جو درویش گدا اپنی ذات کے تکبر اور زعم پر غالب آنے کے لیے تھامتے

ہیں کہ دوسروں سے خیرات قبول کر سکیں۔ میں جان گیا کہ یہ اُس قسم کا آدمی تھا جو معاشرے کے قیاس اور رائے پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ یہ کہ لوگ اُسے کوئی سیلانی، خانہ بدوش یا حتیٰ کہ بھکاری سمجھ سکتے تھے، اُسے اس بات سے کوئی فرق پڑتا دکھائی نہ دیتا تھا۔

جیسے ہی میں نے اُسے وہاں کھڑے خود کو متعارف کروانے کی اجازت کا منتظر دیکھا، مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ مختلف تھا۔ یہ اُس کی آنکھوں میں، اُس کی حرکتوں میں، اُس کے پورے وجود پر تحریر تھا۔ کسی شاہ بلوط یا برگد کے پھل کی طرح جو بے خبر نگاہوں کو معمولی اور کمزور سا لگتا ہے لیکن وہ اپنے اندر متفاخر برگد کے درخت کا نقیب ہوتا ہے جو وہ بنے گا، اُس نے مجھے اُن چھیدتی سیاہ آنکھوں سے دیکھا اور خاموشی سے سر ہلا دیا۔

''مرحبا درویش، ہماری خانقاہ میں خوش آمدید۔'' میں نے اُسے اپنے سامنے مسند پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سب کو سلام کرنے کے بعد، کمرے میں موجود لوگوں کا پوری تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے درویش بیٹھ گیا۔ آخر اُس کی نگاہ قاضی پر آرکی۔ دونوں آدمی لمحہ بھر ایک دوسرے کو بغیر کچھ کہے دیکھتے رہے اور میں یہ سوچنے سے خود کو روک نہ پایا کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے کیوں کہ وہ ایک دوسرے کے بالکل متضاد تھے۔

میں نے درویش کو بکری کا گرم دودھ، میٹھی انجیر اور کھجوریں پیش کیں، جن سب سے اُس نے نرمی سے انکار کر دیا۔ نام پوچھے جانے پر اُس نے شمس تبریز کہہ کر اپنا تعارف کروایا اور کہا کہ وہ خدا کی جستجو میں سرگرداں درویش تھا۔

''اور کیا تم اُسے پانے میں کامیاب ہوئے؟'' میں نے دریافت کیا۔

سر ہلاتے درویش کے چہرے پر سے ایک سایہ سا گزرا اور وہ بولا، ''بلا شبہ، وہ ہمیشہ میرے ہمراہ رہا ہے۔''

ایک دل شکن مسکراہٹ کے ساتھ جسے چھپانے کی قاضی نے کوئی سعی نہ کی، قاضی نے مداخلت کی، ''مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی کہ تم درویش زندگی کو اس قدر پیچیدہ کیوں بنا لیتے ہو۔ اگر خدا ہمیشہ تمہارے ساتھ رہا ہے تو تم اس سارا وقت اُس کی جستجو میں مارے مارے کیوں پھرتے رہے ہو؟''

شمس تبریز نے متفکر انداز میں اپنا سر جھکا لیا اور ذرا دیر خاموش رہا۔ جب اُس نے دوبارہ نگاہ اٹھائی، اُس کا چہرہ پُرسکون اور آواز نپی تلی تھی۔

''کیوں کہ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ وہ تلاش کرنے پر نہیں مل سکتا، لیکن اُسے پا وہی سکتے ہیں جو اُس کو تلاش کرتے ہیں۔''

''لفظوں کا کیسا کھیل ہے یہ!'' قاضی نے تمسخر سے کہا، ''کیا تم ہمیں یہ بتانے کی کوشش

کر رہے ہو کہ اگر ہم عمر بھر ایک ہی جگہ مقیم رہیں تو ہم خدا کو نہیں پا سکتے؟ یہ فضول بات ہے۔ ہر کسی کو تمہاری طرح چیتھڑے پہن کر گلی گلی پھرنے کی ضرورت نہیں!''

اس پر کمرے میں موجود لوگوں کی ہنسی سنائی دی کہ وہ قاضی کے ساتھ اپنے اتفاق کا اظہار کرنے کے مشتاق تھے۔ بلند آہنگ، بے یقین اور ناخوش ہنسی ان لوگوں کی جو خود سے برتر لوگوں کی خوشامد کے عادی تھے۔ مجھے بے آرامی سی محسوس ہوئی۔ ظاہر تھا کہ قاضی اور درویش کو ایک جگہ لا بٹھانا کوئی اچھا خیال نہ تھا۔

''شاید میری بات کو غلط سمجھا گیا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اگر کوئی اپنے آبائی شہر میں رہے تو وہ خدا کو تلاش نہیں کر سکتا۔ ایسا یقیناً ممکن ہے۔'' درویش نے تسلیم کیا۔ ''ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے کبھی کہیں کا سفر نہیں کیا اور پھر انہوں نے دنیا دیکھ رکھی ہے۔''

''بالکل!'' قاضی فاتحانہ انداز میں دانت نکال کر ہنسا... ایک ہنسی جو درویش کی اگلی بات سن کر غائب ہو گئی۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب تھا قاضی صاحب کہ اگر کوئی سمور کے چغے، ریشمی لباس اور قیمتی زیورات میں ملبوس رہے جیسا کہ آج آپ نے پہن رکھے ہیں تو وہ خدا کو نہیں پا سکتا۔''

کمرے پر ایک ہکا بکا سی خاموشی اتر آئی، ہمارے گرد آوازیں اور سانس لینے کا شور مٹی میں تحلیل ہو رہا تھا۔ یوں جیسے کسی بڑی بات کے ظہور کے انتظار میں ہم سب نے اپنی سانسیں روک لیں، اگرچہ اس سے زیادہ صدمہ انگیز اور کیا ہو سکتا تھا، میں نہیں جانتا تھا۔

''کسی درویش کی حیثیت سے تمہاری زبان خاصی تیز ہے۔'' قاضی نے کہا۔

''جب کچھ کہنے کی ضرورت ہو تو میں کہوں گا، چاہے ساری دنیا میری گردن پکڑ کر مجھے خاموش رہنے کو کہے۔''

اس پر قاضی کی تیوری چڑھ گئی مگر پھر اُس نے کندھے اچکائے۔ ''خیر، جو بھی ہے۔'' وہ بولا، ''میرے معاملے میں مجھے تمہاری ہی ضرورت ہے۔ ہم ابھی اپنے شہر کی شان و شوکت کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ تم نے ضرور بہت سی جگہیں دیکھ رکھی ہوں گی۔ کیا بغداد سے زیادہ دل فریب کوئی جگہ ہے؟''

نرمی سے ایک سے دوسرے آدمی پر نگاہ ڈالتے شمس تبریز نے وضاحت کی، ''اس کا کوئی سوال ہی نہیں کیوں کہ بغداد ایک غیر معمولی شہر ہے لیکن زمین پر کوئی خوب صورتی دائمی نہیں۔ شہر روحانی ستون پر ایستادہ ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے آئینوں کی طرح وہ اپنے باسیوں کے دلوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر وہ دل ہی تاریک اور ایمان سے محروم ہو جائیں تو شہر اپنی دلربائی کھو دیتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے اور ایسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔''

میں خود کو اثبات میں سر ہلانے سے روک نہ پایا۔ لمحے بھر کو اپنی سوچوں سے نکل کر اپنی

آنکھوں میں دوستی کی چمک لیے شمس تبریز میری جانب مڑے۔ میں نے کسی جھلساتے سورج کی حدت کی طرح اُن نگاہوں کو خود پر محسوس کیا۔ تبھی تھا کہ میں نے واضح طور پر دیکھا کہ اپنا نام اُنہیں کیوں موزوں تھا۔ اس شخص سے ذہنی اور جسمانی قوت شعاعوں کی صورت خارج ہو رہی تھی اور وہ اندر سے کسی آتشیں گیند کی مانند جل رہے تھے۔ وہ بلاشبہ ''شمس'' تھے، سورج۔

لیکن قاضی مختلف خیالات کا حامل تھا۔ ''تم صوفی لوگ ہر شے کو پیچیدہ بنا دیتے ہو۔ یہی معاملہ فلسفیوں اور شاعروں کا ہے! اتنے بہت سے لفظوں کی کیا ضرورت؟ انسان سادہ ضروریات والی سادہ مخلوق ہے۔ یہ رہنماؤں کا کام ہے کہ وہ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھیں اور یقین حاصل کریں کہ وہ کہیں بھٹک نہ جائیں۔ اس کے لیے کاملیت کے ساتھ شریعت کے نفاذ کی ضرورت ہے۔''

''شریعت شمع کی طرح ہے۔'' شمس تبریز نے کہا، ''یہ ہمیں قابل قدر روشنی مہیا کرتی ہے۔ لیکن آیئے یہ مت فراموش کریں کہ شمع ہمیں تاریکی میں ایک سے دوسری جگہ جانے میں مدد دیتی ہے۔ اگر ہم یہ بھول جائیں کہ ہمیں جانا کہاں ہے اور اپنی توجہ منزل کی بجائے شمع پر ہی مرکوز کر لیں تو اس کا کیا فائدہ؟''

قاضی صاحب کا منہ بگڑ گیا۔ مجھے خود میں اضطراب کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ شریعت کی اہمیت پر ایک ایسے شخص سے بحث کرنا جس کی ذمہ داری قاضی کے طور پر اکثر لوگوں کو شریعت کے مطابق سزا دینے کی تھی، خطرناک پانیوں میں تیرنے کے مترادف تھا۔ کیا شمس تبریز یہ جانتے نہیں تھے؟

جب میں کوئی مناسب عذر سوچ رہا تھا کہ درویش کو کمرے سے باہر لے چلوں، میں نے اُسے کہتے سنا، ''ایک اصول ہے جس کا اطلاق اِس صورتِ حال میں ہوتا ہے۔''

''کیسا اصول؟'' قاضی نے شک بھرے انداز میں پوچھا۔

شمس تبریز سیدھے ہوئے، اُن کی نگاہیں یوں ہوا میں کسی نقطے پر جمی تھیں جیسے وہ کسی غیر مرئی کتاب سے پڑھ رہے ہوں اور پھر انہوں نے بیان کیا: ''قرآن پاک کا ہر قاری اپنی فہم کی گہرائی کے مطابق اسے مختلف سطح پر سمجھتا ہے۔ بصیرت کی چار سطحیں ہیں۔ پہلی سطح ہے، ظاہری معانی اور لوگوں کی اکثریت اسی پر مطمئن ہے۔ اس کے بعد بطن ہے... داخلی سطح۔ تیسری ہے باطنی سطح۔ اور چوتھی سطح اس قدر گہری ہے کہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی اور اسی وجہ سے وہ ناقابل بیان ہی رہتی ہے۔''

چمکتی آنکھوں کے ساتھ شمس نے بات جاری رکھی۔ ''علما جو شریعت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، ظاہری معانی جانتے ہیں۔ داخلی معانی صوفی جانتے ہیں۔ اولیا باطنی معانی سے واقف ہیں۔ اور جہاں تک چوتھی سطح کی بات ہے، اُس سے صرف پیغمبر اور خدا کے مقربین آگاہ ہیں۔''

''کیا تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ ایک عام صوفی، شریعت کے عالم سے بڑھ کر قرآن کی سمجھ بوجھ رکھتا ہے؟'' قاضی نے پیالے پر اپنی انگلیاں بجاتے ہوئے پوچھا۔

درویش کے لبوں پر ایک ہلکی سی زہرخند مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''احتیاط کرو، میرے دوست۔'' قاضی نے کہا،'' جہاں تم کھڑے ہو، اس کے اور توہین مذہب یا کفر کے درمیان ایک بے حد باریک لکیر ہی ہے۔''

اگر ان الفاظ میں کوئی دھمکی پوشیدہ تھی تو درویش نے بہ ظاہر اس پر توجہ نہ دی۔ ''کفر ہے کیا؟'' اُس نے پوچھا اور پھر فوراً ہی ایک گہری سانس بھر کر مزید کہا،'' مجھے ایک قصہ سنانے کی اجازت دیجئے۔''

اور یہ تھا جو اُنہوں نے ہمیں سنایا:

کسی روز موسیٰ پہاڑوں میں تنہا گھوم رہے تھے کہ انہیں فاصلے پر ایک چرواہا دکھائی دیا۔ وہ شخص گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا اور اُس کے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ موسیٰ چرواہے کی دعا سن کر اس قدر ششدر رہ گئے۔

''اوہ، میرے محبوب خدا، میں تجھے اتنا چاہتا ہوں کہ تو جان ہی نہیں سکتا۔ میں تیرے لیے کچھ بھی کر گزروں گا، بس کہہ کر تو دیکھ۔ چاہے تو مجھے میرے گلّے میں سے سب سے موٹی تازی بھیڑ کو اپنے نام پر قربان کرنے کا کہے، میں بغیر ہچکچائے کر گزروں گا۔ تو اُسے بھون کر اُس کی دُم کی چربی اپنے چاولوں میں ڈالے تو وہ زیادہ مزے دار ہو جائیں گے۔''

موسیٰ توجہ سے سنتے ہوئے آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھے۔

''اس کے بعد میں تیرے پیر دھوؤں گا اور تیرے کان صاف کروں گا اور تیرے بالوں سے جوئیں نکالوں گا۔ میں تجھ سے اتنی محبت کرتا ہوں۔''

اتنا سننا تھا کہ موسیٰ نے چلاّتے ہوئے چرواہے کی بات کاٹ دی،'' رک جاؤ، جاہل آدمی! کیا سمجھتے ہو تم کیا کر رہے ہو؟ تمہارا خیال ہے کہ خدا چاول کھاتا ہے؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ خدا کے پیر ہیں جنہیں تم دھوگے؟ یہ دعا نہیں ہے۔ یہ صریحاً کفر ہے۔''

بدحواس اور شرمندہ چرواہے نے بار بار معذرت کی اور مہذب لوگوں کی طرح دعا مانگنے کا وعدہ کیا۔ اُس سہ پہر حضرت موسیٰ نے اُسے کئی دعائیں سکھائیں۔ پھر اپنے آپ سے بے حد خوش انہوں نے اپنا راستہ لیا۔ لیکن اُس رات موسیٰؑ کو ایک ندائے غیب سنائی دی۔ خدا اُن سے ہم کلام تھا۔

''اے موسیٰ، تم نے یہ کیا کیا؟ تم نے بے چارے چرواہے کو ڈانٹ دیا اور یہ جاننے میں ناکام رہے کہ وہ مجھے کس قدر پیارا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح باتیں صحیح طریقے سے نہ کہہ رہا ہو مگر وہ مخلص تھا۔ اُس کا دل خالص اور نیت اچھی تھی۔ میں اُس سے راضی تھا۔ اُس کے الفاظ تمہارے کانوں کے لیے کفر ہو سکتے ہیں مگر میرے نزدیک وہ دلکش کفر تھے۔''

موسیٰؑ کو فوراً ہی اپنی غلطی کا ادراک ہو گیا۔ اگلے روز صبح سویرے وہ چرواہے سے ملنے دوبارہ پہاڑوں پر گئے۔ انہوں نے اُسے ایک بار پھر محوِ دعا پایا، مگر اس بار وہ اُسی طریقے سے دعا کر رہا تھا جو اُسے سکھایا گیا تھا۔ اپنی دعا ٹھیک سے کرنے کے عزم میں وہ ہکلا رہا تھا اور اپنی گزشتہ دعا کے خشوع و خضوع

اور محبت سے محروم تھا۔ موسیٰ نے جو کچھ اُس کے ساتھ کیا تھا، اُس پر پچھتاتے ہوئے چرواہے کی پشت پر تھپکی دی اور بولے، ''میرے دوست، میں غلطی پر تھا۔ برائے مہربانی مجھے معاف کردو۔ اپنے انداز میں دعا کرتے رہو۔ وہ خدا کی نگاہ میں زیادہ قیمتی، قابل قدر ہے۔''

چرواہا یہ سن کر حیران سے زیادہ پُرسکون ہوگیا۔ اس کے باوجود وہ پرانے طریقے سے دعا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ ہی اُس نے اُن رسمی دعاؤں کی تعمیل کی جو حضرت موسیٰ نے اُسے سکھائی تھیں۔ اُس نے اب خدا سے رمز و کنایے کا ایک نیا طریقہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے سادہ لگن و اخلاص پر مطمئن اور شاداں تھا مگر اب وہ اُس مقام سے گزر چکا تھا... اپنے دلکش کفر سے آگے۔

''سو آپ نے دیکھا، دوسرے لوگ خدا سے جس طرح رابطہ رکھتے ہیں، اُس پر کوئی حتمی فیصلہ نہ سنائیں۔'' شمس تبریز نے بات ختم کی، ''ہر کسی کا اپنا انداز اور اپنی دعا ہے۔ خدا ہمارے لفظوں پر ہماری گرفت نہیں کرتا۔ وہ ہمارے دلوں کی گہرائی میں جھانکتا ہے۔ رسوم اور آداب رسوم سے کوئی فرق نہیں پڑتا، فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ ہمارے دل حسب مراد خالص ہیں یا نہیں۔''

میں نے قاضی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ میں اُس کے مطلق اعتماد اور اطمینان کے نقاب تلے دیکھ سکتا تھا کہ وہ واضح طور پر برہم تھا۔ تاہم ساتھ ہی، جیسا کہ وہ ایک تیز فہم عیار شخص تھا، وہ اس مشکل صورت حال کو بھانپ چکا تھا۔ اگر وہ شمس کی بات پر ردعمل دکھاتا تو اُسے اگلا قدم اٹھا کر اُنہیں اُس کی گستاخی پر سزا دینا پڑتی، جس صورت میں معاملہ گمبھیر ہو جاتا اور ہر کسی کے کانوں تک بات پہنچتی کہ ایک سادہ درویش نے قاضی القضاۃ کے مقابل آنے کی جرأت کی تھی۔ اس لیے اُس کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ یوں ظاہر کرتا جیسے پریشانی کی کوئی بات نہ تھی اور معاملے کو وہیں چھوڑ دیتا۔

باہر غروب ہوتے سورج کے سامنے جو آسمان کو قرمزی رنگوں سے رنگ رہا تھا، گہرے سرمئی بادل چھا رہے تھے۔ ذرا دیر بعد قاضی یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کہ اُسے کوئی ضروری کام نمٹانا تھا۔ مجھے دیکھ کر ذرا سر ہلاتے اور شمس تبریز کو سرد نگاہوں سے گھورتے وہ باہر نکل گیا۔ اُس کے مصاحبین نے خاموشی سے اُس کی پیروی کی۔

''مجھے اندیشہ ہے کہ قاضی کو آپ پسند نہیں آئے۔'' سب کے چلے جانے کے بعد میں نے کہا۔

شمس تبریز نے مسکراتے ہوئے اپنے چہرے سے بال ہٹائے۔ ''اوہ، یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ میں عادی ہوں کہ لوگ مجھے زیادہ پسند نہیں کرتے۔''

میں خود کو جذباتی محسوس کرنے سے روک نہ پایا۔ میں اتنے لمبے عرصے سے اس خانقاہ میں تھا کہ جانتا تھا کہ ایسے مہمان کم ہی آتے تھے۔

''مجھے بتائیے درویش۔'' میں نے کہا، ''آپ جیسے شخص کو کیا بات بغداد کھینچ لے آئی؟''

میں اُن کا جواب سننے کا مشتاق مگر عجیب طور پر خائف بھی تھا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 20 مئی 2008ء

جس رات ایلا کا شوہر گھر نہ آیا، اُس کے خواب میں بگولے رقاص اور درویش رقصاں رہے۔

اُس کا سر مسودے پر دھرا تھا، جب اُس نے سرِ رہ گزر ایک مسافر خانے میں خراب حال جنگجوؤں کو کھانا کھاتے دیکھا، ان کی پلیٹوں میں مزے دار کچوریاں اور شیریں طعام بھرے ہوئے تھے۔

پھر اُس نے خود کو دیکھا۔ وہ کسی دوسرے ملک میں کسی قلعے کے بھرے پُرے بازار میں کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ اُس کے اردگرد لوگ یوں آہستگی سے حرکت کر رہے تھے جیسے وہ کسی ایسی دھن پر رقصاں ہوں جسے وہ نہ سن سکتی تھی۔ اُس نے لٹکی ہوئی مونچھوں والے ایک موٹے آدمی کو کچھ پوچھنے کے لیے روکا تھا، بس اُسے وہ سوال یاد نہ رہا۔ اُس آدمی نے خالی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور لنگڑا کر چلتے آگے بڑھ گیا۔ اُس نے کئی پھیری والوں اور پھر دکان داروں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر کسی نے اُسے جواب نہ دیا۔ پہلے اُس نے سوچا کہ وجہ یہ تھی کہ وہ اُن کی زبان نہ بول سکتی تھی۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھا اور اُسے دہشت بھرا ادراک ہوا کہ اُس کی زبان کاٹی جا چکی تھی۔ بڑھتی ہوئی سراسیمگی کے ساتھ اُس نے اپنا عکس دیکھنے کے لیے اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ اب بھی وہی شخص تھی، آئینے کی تلاش میں اردگرد نظر دوڑائی مگر بازار میں کوئی آئینہ نہ تھا۔ وہ رونے لگی اور کسی پریشان کن آواز سے بیدار ہوئی، ابھی بھی لاعلم کہ اُس کی زبان تھی یا نہیں۔

آنکھیں کھولنے پر ایلا نے سپرٹ کو پچھلے دروازے پر بے چینی سے کھرونچے مارتے دیکھا۔ غالباً پورچ میں کوئی جانور آ گھسا تھا جس پر کتا پاگل ہوا جا رہا تھا۔ خصوصاً سکنک (Skunk) سے اُسے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ پچھلی سردیوں میں ایک ایسے سکنک سے اُس کی بے موقع لڑائی کی یاد اب بھی تازہ تھی۔ سکنک کی اُس ناگوار بو کو کتے سے ختم کرنے میں ایلا کو کئی ہفتے لگے تھے اور حتیٰ کہ اُس نے اسے ٹماٹر کے جوس سے بھرے ٹب میں نہلایا، اس کے بعد بھی بدبو بدستور موجود رہی جو جلے ہوئے ربر کی

یاد دلاتی تھی۔

ایلا نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے پونے تین بجے تھے۔ ڈیوڈ ابھی تک واپس نہ آیا تھا اور شاید اب آتا بھی نہیں۔ جینٹ نے اُس کی فون کال کا جواب نہ دیا تھا اور اپنی مایوسی بھری حالت میں ایلا کو لگتا تھا کہ وہ کبھی دیتی بھی نہیں۔ اپنے شوہر اور بیٹی کی طرف سے خود کو تنہا چھوڑ دیے جانے کی دہشت کے زیر اثر، اُس نے فریج کھولا اور چند منٹ تک اندر دیکھتی رہی۔ چمچ بھر چیری ونیلا آئس کریم کھانے کی خواہش پر وزن بڑھنے کا اندیشہ غالب آ گیا۔ بغیر زیادہ کوشش کے وہ فریج سے پرے ہٹی اور دروازہ بند کر دیا، ضرورت سے ذرا زیادہ سختی سے۔

پھر ایلا نے سرخ وائن کی بوتل نکالی اور اپنے لیے گلاس بھر لیا۔ وہ اچھی وائن تھی، ہلکی اور چاق و چوبند کرنے والی جس میں تلخ سی شیرینی کا شائبہ اُسے پسند تھا۔ جب وہ دوسرا گلاس بھر رہی تھی، تب ہی اُسے لگا کہ اُس نے شاید ڈیوڈ کی مہنگی بورڈیوکس (Bordeaux) کھول لی تھی۔ اس نے لیبل پڑھا... Chateau Margaux 1996۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ کرے کیا، اُس نے بوتل دیکھ کر تیوری چڑھائی۔

وہ اس قدر تھکن زدہ اور نیم خوابیدہ تھی کہ مزید پڑھ نہ سکتی تھی۔ سو اُس نے ای میل چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ وہاں نصف درجن Junk ای میلز اور مشیل کے پیغام کے علاوہ جس میں پوچھا گیا تھا کہ مسودے کا مطالعہ کیسا جا رہا تھا، اُسے عزیز اے ظہارا کی ای میل ملی۔

ڈیر ایلا (اگر میں یوں پکار سکتا ہوں)،

مجھے تمہاری ای میل تب ملی جب میں گوئٹے مالا کے موموستے نانگو (Momostenango) نامی گاؤں میں ہوں۔ یہ ان باقی رہ جانے والی چند جگہوں میں سے ہے جہاں لوگ اب بھی مایائی کیلنڈر استعمال کرتے ہیں۔ میرے ہوٹل کے سامنے منت کا ایک درخت ہے جس پر تم جس بھی رنگ اور نمونے کا تصور کر سکو، اُس کی سینکڑوں دھجیاں بھی ہوئی ہیں۔ لوگ اسے "دل شکستہ لوگوں کا درخت" کہتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کے لوگ کاغذ کے پرزے پر اپنا نام لکھ کر اس کی شاخوں سے باندھ دیتے ہیں، یہ دعا کرتے ہوئے کہ اُن کے دل شفایاب ہو جائیں۔

مجھے امید ہے کہ تمہیں یہ زیادہ گستاخی نہ لگے گی، مگر تمہاری ای میل پڑھنے کے بعد میں منت کے اس درخت تک گیا اور دعا کی کہ تم اور تمہاری بیٹی آپس کی یہ غلط فہمی دور کر لیں۔ محبت کی چھینٹ بھی بے قدر نہیں جانی چاہیے کیوں کہ جیسا کہ رومی نے کہا، محبت آبِ حیات ہے۔

ایک چیز جس نے ماضی میں ذاتی طور پر میری مدد کی ہے، یہ تھی کہ جب میں اپنے اردگرد لوگوں کو بدل نہ سکا تو میں نے ان کی زندگیوں میں مداخلت کرنی اور پریشان ہونا چھوڑ دیا۔ مداخلت یا جمود کی بجائے کیا میں سرِ تسلیم خم کرنے کا مشورہ دے سکتا ہوں؟

بعض لوگ "رضا جوئی یا اطاعت" کو "کمزوری" سے الجھانے کی غلطی کرتے ہیں۔ جب کہ یہ اس

کے سوا کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ رضا جوئی کائنات کے تناظر میں پُر امن رضامندی کی ایک شکل ہے، بشمول اُن چیزوں کے جنہیں ہم ابھی تبدیل کرنے یا سمجھنے کے قابل نہیں۔

مایائی کیلنڈر کے مطابق، آج ایک مبارک دن ہے۔ نئے انسانی شعور کی نقیب ایک بڑی فلکیاتی تبدیلی ہونے کو ہے۔ مجھے سورج کے غروب ہونے اور دن کے انجام کو پہنچنے سے پہلے تمہیں یہ ای میل روانہ کرنے میں جلدی کرنی ہوگی۔

خدا کرے محبت تمہیں تب اور وہاں تلاش کرے جب اور جہاں تمہیں اس کو پانے کی سب سے کم توقع ہو۔

مخلص

عزیز

یہ جان کر جذباتی ہوتے ہوئے کہ دنیا کے ایک دُور افتادہ گوشے میں ایک بالکل اجنبی شخص نے اُس کی خیر و عافیت کے لیے دعا کی تھی، ایلا نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور تصور کیا کہ منت کے پیڑ کی کسی شاخ پر کاغذ کے پرزے پر لکھا اس کا نام بندھا تھا۔ ہوا میں کسی پتنگ کی طرح جھولتا ہوا، آزاد اور خوش باش۔

چند منٹ بعد وہ کچن کا دروازہ کھول کر پچھلے باغ میں نکلی اور ہوا کی پریشان کرنے والی خنکی سے لطف لینے لگی۔ بے چین اور غراتا ہوا، مسلسل ہوا میں کچھ سونگھتا ہوا اسپرٹ اُس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ کتے کی آنکھیں سکڑ گئیں، پھر وہ بے چین ہو کر پھیلیں اور اس کے کان کھڑے ہو گئے، یوں جیسے اُس نے فاصلے پر کسی دہشت خیز چیز کو پہچان لیا تھا۔ موسم بہار کے آخری دنوں کے چاند تلے ایلا اور اُس کا کتا ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے گہری مہیب تاریکی میں گھورتے رہے، بالکل اسی طرح تاریکی میں حرکت کرتی چیزوں سے خوف زدہ، نامعلوم سے خوف زدہ۔

نومرید

بغداد، اپریل 1242ء

بدستور الجھتے اور سر جھکائے ہوئے میں نے قاضی کو دروازے تک چھوڑا اور جوٹھے برتن اکٹھے کرنے تیزی سے بڑے کمرے میں واپس لوٹ آیا۔ میں بابا زمان اور سرگرداں درویش کو اُسی حالت میں بیٹھا پا کر حیران ہوا جس میں اُنہیں چھوڑ گیا تھا، کوئی بھی ایک لفظ تک نہ بولا۔ میں نے حیرانی سے یہ سوچتے ہوئے انہیں انکھیوں سے دیکھا کہ آیا لفظوں کے بغیر گفتگو جاری رکھنا ممکن تھا۔ جتنی دیر ہو سکا، میں وہیں منڈلاتا رہا، مسند کے تکیے ترتیب دیتے، کمرا صاف کرتے، قالین پر سے ریزے چنتے، لیکن کچھ دیر بعد میرے پاس وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا۔

میں نیم دلی سے پیر گھسیٹتے واپس باورچی خانے میں آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی باورچی نے احکامات کی بوچھاڑ کر دی۔ ''تختہ صاف کر دو، فرش پر پوچا لگاؤ! برتن دھو! چولہا اور انگیٹھی کے گرد دیواریں مانجھ کر صاف کرو! اور جب فارغ ہو جاؤ تو چوہوں کی کڑکیاں دیکھنا مت بھولنا!'' چھے ماہ سے، جب سے میں اس خانقاہ میں آیا تھا، باورچی مجھے رگیدرہا تھا۔ روز وہ مجھ سے کسی کتے کی طرح کام کرواتا اور اس تشدد کو میری روحانی تربیت کا حصہ قرار دیتا تھا، یوں جیسے چکنائی بھرے برتن دھونا کسی بھی طرح روحانی ہو سکتا تھا۔

کم گو باورچی کا ایک پسندیدہ جملہ تھا: ''صفائی عبادت ہے، عبادت صفائی ہے!''

''اگر یہ سچ ہوتا تو بغداد کی ساری گھریلو عورتیں روحانی مرشد بن چکی ہوتیں۔'' ایک بار میں نے جواب میں یہ کہنے کی جرأت کی تھی۔

اُس نے لکڑی کا چمچ میرے سر پر دے مارا اور اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔ ''ایسی چغل خوری اور بدگوئی تمہیں کہیں نہیں پہنچائے گی بیٹے۔ اگر تم درویش بننا چاہتے ہو تو لکڑی کے اس چمچ کی طرح گونگے بن جاؤ۔ کسی نومرید میں باغی پن کوئی اچھی خصوصیت نہیں۔ کم بولو، تیزی سے باشعور بنو!''

مجھے باورچی سے نفرت تھی مگر اس سے بڑھ کر مجھے اُس سے خوف آتا تھا۔

میں نے کبھی اُس کی حکم عدولی نہیں کی تھی، یعنی آج شام سے پہلے تک۔

جیسے ہی باورچی نے اپنی پشت موڑی، میں چپکے سے باورچی خانے سے نکلا اور دبے قدموں دوبارہ بڑے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں سرگرداں درویش کے بارے میں مزید جاننے کے لیے بے چین تھا۔ کون تھا وہ؟ وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟ وہ اس خانقاہ کے درویشوں جیسا نہیں تھا۔ اُس کی آنکھیں حتیٰ کہ جب بھی جب وہ انکساری سے سر جھکائے ہوتا، غضب ناک اور سرکش لگتی تھیں۔ اس سے متعلق کچھ ایسا بے حد غیر معمولی اور ناقابل پیش گوئی تھا کہ جو تقریباً دہشت خیز تھا۔

میں نے دروازے کی درز سے اندر جھانکا۔ پہلے تو مجھے کچھ دکھائی نہ دے سکا۔ لیکن جلد ہی میری آنکھیں اندر کمرے کی نیم تاریکی کی عادی ہو گئیں اور میں اب اُن کے چہرے دیکھ سکتا تھا۔

مجھے آفندی کی یہ پوچھتی آواز سنائی دی کہ ''مجھے بتایئے، شمس تبریز، آپ جیسے شخص کو کیا بات بغداد کھینچ لے آئی ہے؟ کیا آپ نے اس مقام کو خواب میں دیکھا ہے؟''

درویش نے اپنا سر ہلایا۔ ''نہیں، مجھے یہاں لانے والا، خواب نہیں۔ وہ ایک کشف تھا۔ مجھے کبھی خواب دکھائی نہیں دیئے۔''

''ہر کوئی خواب دیکھتا ہے۔'' بابا زمان نے نرمی سے کہا، ''بس یہ ہے کہ کسی کو وہ ہمیشہ یاد نہیں رہتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ خواب نہیں دیکھتے۔''

''لیکن، میں نہیں دیکھتا۔'' درویش نے اصرار کیا۔ ''یہ اُس سودے کا حصہ ہے جو میں نے خدا سے کیا۔ آپ جانتے ہیں، اپنے لڑکپن میں مَیں نے فرشتے دیکھے اور اپنی نگاہوں کے سامنے کائنات کے اسرار کھلتے دیکھے۔ جب میں نے یہ بات اپنے ماں باپ کو بتائی تو وہ خوش نہ ہوئے اور مجھے خواب نہ دیکھنے کا کہا۔ جب میں نے اپنے دوستوں کو اپنے راز میں شریک کیا، تو انہوں نے بھی کہا کہ میں ایک خوابوں میں مبتلا شخص تھا۔ میں نے اپنے اساتذہ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا جواب بھی مختلف نہ تھا۔ آخرکار میں سمجھ گیا کہ لوگ جب بھی کوئی غیر معمولی بات سنتے ہیں تو وہ اُسے خواب کہتے ہیں۔ میں اس لفظ کو اور جس سب کی بھی یہ ترجمانی کرتا تھا، ناپسند کرنے لگا۔''

یہ کہہ کر درویش نے ذرا دیر توقف کیا، یوں جیسے اُس نے کوئی ناگہانی آواز سنی تھی۔ پھر ایک عجیب ترین بات رونما ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، اپنی کمر سیدھی کی اور آہستہ آہستہ بلاارادہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا، اس تمام عرصے میں وہ میری جانب دیکھ رہا تھا۔ یوں تھا جیسے کسی طور اُسے علم ہو گیا تھا کہ میں انہیں چوری چھپے دیکھ رہا تھا۔

یوں تھا جیسے وہ چوبی دروازے کے آر پار دیکھ سکتا تھا۔

میرا دل دیوانگی سے دھڑکنے لگا۔ میں واپس باورچی خانے میں بھاگ جانا چاہتا تھا مگر معلوم نہ ہو سکا کہ کیسے بھاگوں۔ میرے بازو، میری ٹانگیں، میرا پورا بدن جم کر رہ گیا تھا۔ دروازے کے پار اور

دروازے سے گزرتی شمس تبریز کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ دہشت زدہ جیسا کہ میں تھا، اس کے ساتھ مجھے اپنے جسم میں بے انتہا توانائی کا احساس ہوا۔

وہ قریب آیا، اپنا ہاتھ دروازے کے دستے پر رکھا لیکن جب میں نے خیال کیا کہ اب وہ دروازے کھول کر مجھے پکڑنے والا تھا، وہ رک گیا۔ میں اتنے قریب سے اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا مگر اور مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ اُس نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا۔ ہم نا قابل برداشت حد تک طویل وقت کے لیے منتظر رہے۔ پھر وہ واپس مڑا اور دروازے سے دُور ہٹتا چلا گیا۔ اُس نے اپنی کہانی جاری رکھی۔

''جب میں کچھ بڑا ہوا، تو میں نے خدا سے التجا کی کہ وہ خواب دیکھنے کی میری صلاحیت واپس لے لے تا کہ ہر مرتبہ جب میرا اُس سے سامنا ہو تو میں جان جاؤں کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا۔ اُس نے میری بات مان لی۔ اُس نے وہ سب واپس لے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی خواب نہیں دیکھتا۔''

شمس تبریز اب کمرے کی کھلی کھڑکیوں کے قریب کھڑے تھے۔ باہر ہلکی سی بوندا باندی ہو رہی تھی اور وہ متفکرانہ انداز میں اُسے دیکھتے رہے، پھر وہ بولے، ''خدا نے خواب دیکھنے کی میری صلاحیت واپس لے لی۔ لیکن اس محرومی کی تلافی کے لیے اُس نے مجھے دوسروں کے خوابوں کی تعبیر بتانے کی اجازت دے دی۔ میں خوابوں کی تعبیر بتاتا ہوں۔''

مجھے توقع تھی کہ بابا زمان ان بے وقوفانہ باتوں کا یقین نہ کریں گے اور اُنہیں ڈانٹ دیں گے۔ جیسا کہ وہ ہمیشہ مجھے ڈانٹ دیتے تھے۔

مگر اس کی بجائے آفندی نے احتراماً سر ہلایا اور بولے، ''آپ کوئی غیر معمولی آدمی لگتے ہیں۔ مجھے بتایئے، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ درحقیقت مجھے امید تھی کہ آپ مجھے یہ بتائیں گے کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔''

''آپ کا کیا مطلب ہے؟'' آفندی نے الجھ کر پوچھا۔

''تقریباً چالیس برس سے، میں ایک سرگرداں درویش رہا ہوں۔ میں قدرت کی حکمت میں ماہر ہوں، اگرچہ معاشرے کی حکمت اب بھی مجھ سے اجنبی ہے۔ اگر ضرورت ہو تو میں کسی وحشی جانور کی طرح لڑ سکتا ہوں مگر میں خود اب کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ میں آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ کے نام بتا سکتا ہوں، جنگلوں میں درختوں کو پہچان سکتا ہوں اور خدا نے جن انسانوں کو اپنی صورت پر تخلیق کیا ہے، اُنہیں کسی کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا ہوں۔''

شمس نے توقف کیا اور آفندی کے چراغ روشن کرنے کے دوران منتظر رہے۔ پھر انہوں نے اپنی بات کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔

''ایک اصول کے مطابق، آپ کائنات میں ہر کسی اور ہر شے کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں، کیوں کہ خدا کسی مسجد، سانا گوگ یا چرچ میں محدود نہیں۔ لیکن اگر آپ پھر بھی جاننا چاہتے ہیں کہ

اس کا ٹھکانہ کہاں ہے تو اس کی تلاش صرف ایک جگہ کی جا سکتی ہے: سچے عاشق کے دل میں۔ ایسا کوئی نہیں جو اس کو دیکھنے کے بعد زندہ رہا ہو، بالکل جیسے ایسا کوئی نہیں جو اُسے دیکھنے کے بعد مر گیا ہو۔ جو کوئی اسے تلاش کرے گا، ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔''

مدھم ٹمٹماتی روشنی میں شمس تبریز زیادہ قدآور دکھائی دیے، ان کے بال بے ترتیب لہروں کی صورت میں اُن کے شانوں پر گرے ہوئے تھے۔

''لیکن علم کسی پرانے گلدان کی تہ میں پڑے کھاری سے پانی کی طرح ہے، یہاں تک کہ وہ کہیں بہنے لگے۔ برسوں میں خدا سے کسی ایسے رفیق کے لیے دعا کرتا رہا ہوں تاکہ اپنے اندر جمع علم اُس کے ساتھ بانٹ سکوں۔ آخر مجھے سمرقند میں القا ہوا، مجھے بتایا گیا کہ میں اپنی تقدیر کی تکمیل کے لیے بغداد جاؤں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میرے رفیق کا نام اور اُس کا پتہ جانتے ہیں اور مجھے بتائیں گے، اگر اب نہیں تو بعد میں۔''

باہر رات اتر چکی تھی اور چاندنی کی کرنیں کھلی کھڑکیوں سے اندر آ رہی تھیں۔ مجھے ادراک ہوا کہ کتنی دیر ہو چکی تھی اور باورچی یقیناً مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ لیکن میں نے پرواہ نہ کی۔ لمحے بھر کو مجھے قوانین توڑ کر خوشی ہوئی۔

''مجھے نہیں معلوم کہ آپ مجھ سے کس قسم کا جواب چاہ رہے ہیں۔'' آفندی بڑبڑائے۔ ''لیکن اگر مجھے کسی معلومات کا انکشاف کرنا ہے تو میں جانتا ہوں کہ یہ مقرر وقت پر ہو جائے گا۔ تب تک آپ یہاں ہمارے پاس ٹھہر سکتے ہیں۔ ہمیں مہمان نوازی کا شرف دیں۔''

یہ سن کر سرگرداں درویش انکساری اور شکرگزاری سے بابا زمان کی دست بوسی کے لیے جھک گیا۔ تبھی تھا کہ آفندی نے وہ عجیب سوال پوچھا، ''آپ کہتے ہیں کہ آپ اپنا علم کسی دوسرے شخص کو منتقل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ ''حق'' کو کسی بیش قیمت موتی کی طرح اپنی ہتھیلی میں تھامنا اور کسی خاص شخص کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن روحانی روشنی کے لیے کسی دوسرے کی شرحِ قلب کسی انسان کے لیے آسان کام نہیں۔ آپ خدا کے غضب کو پکار رہے ہیں۔ آپ اس کے بدلے کیا قیمت ادا کرنے کو آمادہ ہیں؟''

میں زندگی بھر کبھی وہ جواب نہ بھول پاؤں گا جو درویش نے دیا۔ اپنی بھنویں اچکاتے ہوئے اُس نے مضبوطی سے کہا، ''میں اپنا سر پیش کرنے کے لیے راضی ہوں۔''

اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد کپکپاہٹ محسوس کرتے میں لڑکھڑا گیا۔ جب میں نے دوبارہ اپنی آنکھ درز پر جمائی تو مجھے آفندی بھی اس جواب پر اسی قدر بوکھلائے ہوئے دکھائی دیے۔

''شاید ہم نے آج کافی باتیں کر لی ہیں۔'' بابا زمان نے ایک گہری سانس بھری۔ ''آپ تھک چکے ہوں گے۔ میں ذرا نو مرید کو بلالوں۔ وہ آپ کو آپ کا بستر دکھا دے گا اور صاف چادریں اور

دودھ کا پیالہ پیش کرے گا۔''

اب شمس تبریز دروازے کی طرف مڑے اور مجھے اپنی ہڈیوں تک محسوس ہوا کہ وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس سے بڑھ کر، یوں تھا جیسے وہ میرے پار اور میرے اندر جھانک رہے تھے، میری روح کے گڑھوں اور چوٹیوں کا مطالعہ کرتے، اُن رازوں کا جائزہ لیتے ہوئے جو خود مجھ سے بھی نہاں تھے۔ شاید وہ کالا جادو جانتے تھے یا ہاروت اور ماروت نے اُن کی تربیت کی تھی، بابل کے دو فرشتے جن کے خلاف قرآن نے ہمیں تنبیہ کی تھی۔ یا پھر وہ کوئی مافوق الفطرت صلاحتیں رکھتے تھے جن کے باعث وہ دروازوں اور دیواروں کے پار دیکھ سکتے تھے۔ بہرصورت انہوں نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔

''نومرید کو بلانے کی ضرورت نہیں۔'' اپنی بلند ہوتی آواز میں انہوں نے کہا، ''مجھے احساس سا ہوتا ہے کہ وہ قریب ہی ہے اور پہلے ہی ہماری بات سن چکا ہے۔''

میں نے ایک گہری سانس بھری، اتنی اونچی آواز میں کہ وہ مُردوں کو ان کی قبروں سے جگا سکتی تھی۔ گھبراہٹ کے عالم میں مَیں اچھلا اور تاریکی میں پناہ لینے کو باغ کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن وہاں ایک ناخوش گوار اتفاق میرا منتظر تھا۔

''سو تم یہاں تھے، ننھے بدمعاش!'' اپنے ہاتھ میں جھاڑو تھامے باورچی میری طرف لپکا۔ ''تم بڑی مشکل میں ہو بیٹے، بڑی مشکل میں۔''

میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور آخری لمحے میں جھاڑو کے وار سے بچنے میں کامیاب رہا۔

''ادھر آ جاؤ، ورنہ تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا!'' میرے پیچھے بھاگتا ہوا باورچی ہانپتے ہوئے چیخا۔

لیکن میں نہ رکا۔ اس کی بجائے میں کسی تیر کی تیزی سے باغ کی طرف لپکا۔ اپنی نگاہوں میں شمس تبریز کا جھمکتا چہرہ لیے میں بھاگا اور اُس بل کھاتے راستے پر بھاگتا ہی رہا جو خانقاہ کو مرکزی سڑک سے ملاتا تھا۔ اور اگرچہ میں کافی دُور نکل آیا تھا، پھر بھی میں خود کو بھاگنے سے روک نہ پایا۔ تیزی سے دھڑکتے دل اور خشک حلق کے ساتھ مَیں بھاگتا رہا، یہاں تک کہ میرے گھٹنے جواب دے گئے اور میں مزید بھاگ نہ سکا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 21 مئی 2008ء

اگلی صبح جب جھگڑے کے لیے تیار ڈیوڈ گھر واپس لوٹا تو اُسے ایلا اپنی گود میں کھلی ''دلکش کفر'' اور برابر میں دھرے وائن کے خالی گلاس کے ساتھ بستر پر سوتی ملی۔ اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا کہ کمبل ذرا اُس کے اوپر کھینچ دے کہ وہ آرام سے سوئی رہے مگر پھر اپنا ارادہ بدل دیا۔

دس منٹ بعد ایلا جاگ گئی۔ وہ باتھ روم میں اُس کے شاور لینے کی آواز سن کر حیران نہ ہوئی۔ اُس کا شوہر دوسری عورتوں سے فلرٹ کر سکتا تھا اور بہ ظاہر اُن کے ساتھ رات بھی گزار سکتا تھا مگر وہ صبح کا شاور اپنے باتھ روم کے سوا کہیں لینا پسند نہ کرتا۔ جب ڈیوڈ فارغ ہوا اور واپس کمرے میں آیا تو ایلا نے یوں ظاہر کیا، جیسے وہ ابھی تک سو رہی تھی اور یوں اُسے اپنی غیر موجودگی کی کسی وضاحت سے بچا لیا۔

اس کے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں اُس کا شوہر اور بچے دونوں گھر سے جا چکے تھے اور ایلا کچن میں اکیلی تھی۔ زندگی لگتا تھا کہ معمول کی ڈگر پر لوٹ آئی تھی۔ اُس نے اپنی پسندیدہ کک بک کھولی، Culinary Artistry Made Plain and Easy اور کئی آپشن پر غور کرنے کے بعد ایک خاصا محنت طلب مینو منتخب کیا جو اُسے ساری سہ پہر مصروف رکھتا۔

زعفران، ناریل اور نارنجی کے ساتھ گھونگھا مچھلی کا شوربہ

کھمبیوں، تازہ جڑی بوٹیوں اور پانچ طرح کی پنیر کے ساتھ بیکڈ پاستا

سرکے اور بھنے ہوئے لہسن کے ساتھ روزمیری بھری بچھڑے کی چانپیں

سبز لوبیے اور گوبھی کا لائم کے ساتھ سلاد

پھر اُس نے میٹھے کا فیصلہ کیا: گرم چاکلیٹ سوفلے۔

ایلا کو کھانا پکانا پسند تھا، اس کی کئی وجوہات تھیں۔ عام لوازمات سے مزے دار کھانا بنانا نہ صرف مسرت بخش اور تسکین بخش بلکہ عجیب طور پر لذت بخش بھی تھا۔ لیکن اس سے بڑھ کر وہ کھانا پکانے

سے اس لیے بھی لطف اٹھاتی تھی کہ وہ اس میں خاصی ماہر تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی سوچیں اس دوران پُرسکون ہو جاتی تھیں۔ اُس کی زندگی میں باورچی خانہ ایسی جگہ تھی جہاں وہ باہر کی دنیا کو پوری طرح نظرانداز کرسکتی تھی اور وقت کی روانی کو اپنے اندر روک سکتی تھی۔ اُس نے تصور کیا کہ کچھ لوگوں کے لیے جنس بھی ایسا اثر رکھتی تھی مگر اس کے لیے ہمیشہ دو لوگوں کی ضرورت ہوتی تھی جب کہ کھانا پکانے کے لیے کسی کو محض وقت، توجہ اور سبزیوں اور لوازمات سے بھرے تھیلے کی ضرورت تھی۔

ٹی وی پروگراموں میں کھانا پکانے والے لوگ یوں بات کرتے جیسے کھانا پکانا، انسپائریشن، قوتِ تخلیق اور تخلیقی پن سے متعلق تھی۔ اُن کا پسندیدہ لفظ تھا، ''تجربہ کرنا۔'' ایلا کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ کیوں نہ تجربے کرنے کو سائنس دانوں اور پُرکاری کو فنکاروں کے لیے چھوڑ دیا جائے! کھانا پکانا، بنیادی معلومات سیکھنے، ہدایات کی پیروی کرنے اور زمانوں کی دانائی کا احترام کرنے سے متعلق تھا۔ آپ کو بس یہ کرنا تھا کہ جو روایات وقت کے ساتھ قائم رہیں، انہیں استعمال کرتے، ان پر تجربے نہ کرتے۔ کھانا پکانے کی مہارت، روایات اور رسومات سے آئی اور اگرچہ یہ واضح تھا کہ جدید دَور میں ایسی چیزوں کو حقیر سمجھا جاتا تھا، باورچی خانے میں روایتی بننے میں کوئی حرج نہ تھا۔

ایلا کو اپنے روزمرہ معمولات بھی بہت خوشی دیتے تھے۔ ہر صبح سویرے کم و بیش ایک ہی وقت خاندان ناشتہ کرتا، ہفتے کے آخری دنوں وہ ایک ہی شاپنگ مال میں جاتے اور ہر مہینے کی پہلی اتوار کو وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ رات کا کھانا کھاتے۔ چوں کہ ڈیوڈ کام کا رسیا تھا اور اُس کے پاس وقت کم ہوتا تھا، گھر میں ہر چیز کی انچارج ایلا تھی: حساب کتاب دیکھنا، گھر کی دیکھ بھال، فرنیچر کی پوشش وغیرہ کروانا، سودا سلف لانا، بچوں کے شیڈول طے کرنا اور ان کی ہوم ورک میں مدد کرنا وغیرہ۔ جمعرات کو وہ فیوژن کوکنگ کلب جاتی تھی جہاں کے ممبر مختلف ممالک کی کھانا پکانے کی ترکیبوں کو باہم ملاتے اور پھر ان زمانوں پرانی ترکیبوں کو نئے مصالحوں اور اجزا سے تازہ دم کرتے تھے۔ ہر جمعے کو وہ گھنٹوں کسانوں کی مارکیٹ میں صرف کرتی، کسانوں سے ان کی پیداوار کے بارے میں باتیں کرتے، نامیاتی آڑو کے کم میٹھے جیم کے جار کا جائزہ لیتے یا کسی دوسرے خریدار کو بتاتے کہ Baby Portabella کھمبیاں کیسے بہترین طریقے سے پکائی جائیں۔ جو کچھ اسے نہ مل پاتا، گھر واپسی کے راستے میں وہ ہول فوڈز مارکیٹ سے خرید لیتی۔

پھر ہفتے کی شام ڈیوڈ، ایلا کو باہر کسی ریسٹورنٹ لے جاتا (عام طور پر تھائی یا جاپانی) اور اگر وہ زیادہ تھکے ہوئے یا پیے ہوئے نہ ہوتے یا ایسا نہ ہوتا کہ اُن کا موڈ نہ ہو تو وہ ایک دوسرے سے وصل کرتے۔ مختصر بوسے اور نرمی سے جنبشیں جن میں عشق کم اور دردمندی زیادہ ہوتی تھی۔ جنس جو کبھی اُن کا سب سے قابلِ بھروسا رابطہ تھی، اب عرصہ ہوا اپنی کشش کھو چکی تھی۔ بعض اوقات انہیں ایک دوسرے کے قریب آئے بغیر ہفتوں گزر جاتے تھے۔ ایلا کو عجیب لگا کہ ایک دوسرے کی قربت اُس کی زندگی میں کبھی اتنی اہم رہی تھی اور اب جب اہم نہ رہی تھی تو اُس نے خود کو پُرسکون اور قدرے آزاد محسوس کیا۔ کسی حد

تک وہ اس خیال کو درست سمجھتی تھی کہ لمبے عرصے سے شادی شدہ جوڑے جسمانی قربت سے بڑھ کر کسی قابل بھروسا اور پائیدار رابطے کے ذریعے کی خاطر رفتہ رفتہ جسمانی کشش کے میدان سے نکل جاتے ہیں۔

واحد مسئلہ یہ تھا کہ ڈیوڈ نے جسمانی قربت اتنی نہیں چھوڑی تھی، جتنی کہ ایلا سے جسمانی قربت۔ ایلا نے کبھی اُس کے معاشقوں پر کھل کر اُس سے جھگڑا نہ کیا تھا، حتیٰ کہ کبھی اپنے شکوک کا اشارہ تک نہ دیا۔ کوئی سکینڈل تھے، نہ خجالت آمیز اتفاقات، کچھ بھی ایسا نہیں جس پر زبانیں حرکت میں آتیں۔ اُس کے دوسری عورتوں خاص طور پر اپنی نوجوان اسسٹنٹ کے ساتھ جسمانی قربت کی رفتار کے سبب وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس سب سے کیسے نمٹتا تھا لیکن اس کا شوہر معاملات سے ہوشیاری اور خاموشی سے نمٹ لیتا تھا۔ اگرچہ بے وفائی کی ایک بُو ہوتی تھی۔ ایلا یہ ضرور جانتی تھی۔

اگر واقعات کا کوئی سلسلہ تھا بھی تو ایلا نہیں بتا سکتی تھی کہ پہلے کیا ہوا اور بعد میں کیا ہوا تھا۔ کیا جسمانی قربت میں اُس کی عدم دلچسپی کی وجہ اُس کے شوہر کی بے وفائی تھی! یا یہ اس کے برعکس تھا؟ کیا پہلے ڈیوڈ نے اُسے دھوکا دیا تھا اور پھر اُس نے اپنے جسم کو نظر انداز کیا اور اپنی جنسی خواہش کھو بیٹھی تھی؟

بہر صورت نتیجہ ایک ہی تھا۔ اُن کے درمیان دمک، وہ روشنی جو انہیں اپنی چاہت کو سطح پر رکھتے ہوئے، شادی کے سمندر کے نامعلوم پانیوں سے گزرنے میں مدد دیتی تھی، حتیٰ کہ تین بچوں اور شادی کے بیس برس بعد بھی، وہ دمک اب موجود نہ رہی تھی۔

☼

اگلے تین گھنٹے اس کا ذہن سوچوں سے بھرا رہا جب کہ اُس کے ہاتھ بے چین اور حرکت میں تھے۔ اُس نے ٹماٹر کاٹے، لہسن پیسا، پیاز کو ہلکا سا بھونا، ساس بنائی، نارنجی کے چھلکے کاٹے اور گندم کی روٹی کے لیے آٹا گوندھا۔ یہ آخری شے ڈیوڈ کی ماں کی اُسے کی گئی سنہری نصیحت تھی جب وہ دونوں ایک دوسرے سے منسوب ہوئے تھے۔

''تازہ پکی روٹی کی سوندھی مہک سے بڑھ کر کوئی شے مرد کو گھر کی یاد نہیں دلاتی۔'' انہوں نے کہا تھا، ''روٹی کبھی مت خریدو۔ اسے خود پکاؤ بہنی۔ یہ حیران کن کام کرے گی۔''

ساری سہ پہر کام کرنے کے بعد ایلا نے ہم رنگ نیپکن، خوشبو دار شمعوں اور زرد اور نارنجی رنگوں والے گل دستے کے ساتھ عمدگی سے میز سجائی۔ پھول اس قدر شوخ رنگ تھے کہ مصنوعی لگتے تھے۔ آخری ٹچ کے لیے اُس نے چمکتے دمکتے نیپکن رنگز کا اضافہ کیا۔ مکمل ہونے کے بعد ڈائننگ ٹیبل سٹائلش ہوم میگزینز کی میزوں سے مشابہ دکھائی دیتی تھی۔

تھکی ہوئی مگر مطمئن ایلا نے مقامی خبروں کے لیے کچن کا ٹی وی آن کیا۔ ایک نوجوان تھیراپسٹ کو اُس کے اپارٹمنٹ میں چھرا گھونپا گیا تھا، ہسپتال میں بجلی کے شارٹ سرکٹ سے آگ لگ گئی اور ہائی سکول کے چار طلبا کو لوٹ مار کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ زمین پر منڈلاتے ناتمام خطروں پر

سر ہلاتے وہ خبریں دیکھتی رہی۔عزیز اے ظہار اکس خواہش اور حوصلے سے دنیا کے کم ترقی یافتہ علاقوں کا سفر کرتا تھا جب کہ حتیٰ کہ امریکہ کے شہروں کے مضافات بھی محفوظ نہ رہے تھے؟

ایلا کو یہ بے حد تحیر خیز لگا کہ ایک نا قابل پیش گوئی اور نا قابل نفوذ دنیا اُس جیسے لوگوں کو واپس گھروں میں گھسا سکتی تھی جب کہ عزیز جیسے کسی شخص کے لیے وہ بالکل برعکس اثر کرتی تھی۔ اُسے وہ دنیا کسی ڈور دراز روندے ہوئے راستے پر مہم جوئی کے آغاز کے لیے متاثر کرتی تھی۔

شام ساڑھے سات بجے روبن سٹین خاندان کسی تصویر جیسی مکمل میز پر بیٹھا۔ جلتی شمعیں ڈائننگ روم کی فضا کو مقدس سا بنا رہی تھیں۔ باہر سے کوئی دیکھنے والا یہی فرض کرتا کہ وہ ایک مکمل خاندان تھے، دھوئیں کے ان مرغولوں کی طرح دلکش جو فضا میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ جینٹ کی عدم موجودگی نے بھی اس تصویر کو ماند یا مدھم نہ کیا۔ انہوں نے کھانا کھایا جس دوران اوری اور ایوی سکول میں دن کے واقعات کے بارے فضول بک بک کرتے رہے۔ ایک بار تو ایلا نے ان کے اس قدر باتونی ہونے اور شور مچانے اور اُس خاموشی کو ڈھانپنے پر شکر ادا کیا جو دوسری صورت میں اُس کے شوہر اور اُس کے درمیان بوجھل پن سے طاری رہتی۔

تنکھیوں سے ایلا نے ڈیوڈ کو گوبھی کے ٹکڑے میں کانٹا جماتے اور آہستہ آہستہ چباتے دیکھا۔ اُس کی نگاہ اُس کے پتلے زرد ہونٹوں اور موتی جیسے دانتوں پر گئی... وہ دہن جس سے وہ خوب شناسا تھی اور جسے اس نے بہت بار چوما تھا۔ اُس نے تصور میں اُسے کسی دوسری عورت کو چومتے دیکھا۔ کسی وجہ سے اُس کے ذہنی تصور میں ابھرنے والی رقیب ڈیوڈ کی نوجوان سیکریٹری نہیں بلکہ سوسن سرانڈون (Susan Sarandon) جیسی کوئی فربہ عورت تھی۔ اتھلیٹک اور پُراعتماد، جس کے تنگ لباس سے اُس کا گداز بدن جھانک رہا تھا اور اُس نے چمڑے کے اونچی ایڑی کے، گھٹنوں تک آتے سرخ بوٹ پہن رکھے تھے، اُس کا چہرہ چمک دار، بلکہ بے پناہ میک اَپ کے باعث تقریباً رنگ برنگا تھا۔ ایلا نے تصور میں ڈیوڈ کو اس عورت کو عجلت میں اور بے تابی سے چومتے دیکھا، بالکل بھی اُس طرح نہیں جیسے وہ گھر کی میز پر بیٹھا گوبھی چبا رہا تھا۔

تبھی تھا کہ اپنا Culinary Artistry Made Plain and Easy ڈنر کرتے اور تصور میں اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت سے معاشقہ کرتے دیکھتے، ایلا کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ وہ خوف ناک صراحت اور سکون کے ساتھ جان گئی کہ اپنی ناتجربہ کاری اور بزدلی کے باوجود ایک روز وہ یہ سب کچھ چھوڑ دے گی: اپنا کچن، اپنا کتا، اپنے بچے، اپنے ہمسائے، اپنا شوہر، اپنی کک بکس اور گھر میں بنائی جانے والی روٹی کی ترکیبیں... وہ اٹھ کر سیدھے سبھاؤ اُس دنیا میں نکل کھڑی ہوگی جہاں ہمہ وقت خطرناک چیزیں رونما ہوتی رہتی تھیں۔

آفندی

بغداد، 26 جنوری 1243ء

برداشت وصبر جو شمس تبریز کے پاس تھا، درویشی خانقاہ کا حصہ بننے کے لیے اُس سے کہیں زیادہ کی ضرورت ہے۔ پھر بھی نو مہینے گزر چکے ہیں اور وہ اب بھی ہمارے ہمراہ ہیں۔

شروع میں مجھے اُن سے توقع تھی کہ وہ کسی بھی لمحے اٹھ کر چل دیں گے، سختی سے منظم زندگی سے اُن کا گریز اسی قدر واضح طور پر نمایاں تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ مقررہ وقت پر سونا اور جاگنا، پابندی سے معمول کا کھانا کھانا اور باقی سب کی طرح ایک ہی معمول کا پابند ہونا اُنہیں بے انتہا بیزار کیے دے رہا تھا۔ وہ کسی تنہا پرندے کی طرح پرواز کے عادی تھے، سرکش اور آزاد۔ مجھے شبہ ہوا کہ کئی بار وہ فرار ہونے کے قریب تھے۔ اس کے باوجود، اپنے رفیق کی تلاش کی لگن، خلوت نشینی کی ضرورت سے بڑھ کر تھی۔ شمس تبریز کو پوری شدت سے یقین تھا کہ کسی روز میں اُس تمام معلومات کے ساتھ ان کے پاس پہنچوں گا جس کی اُنہیں ضرورت تھی اور اُنہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں جائیں اور کسے تلاش کریں۔ اس یقین کے ساتھ وہ رکے رہے۔

ان نو مہینوں میں مَیں نے اُنہیں قریب سے دیکھا اور حیران ہوا کہ کیا وقت اُن کے لیے مختلف طور پر زیادہ تیزی اور زیادہ شدت سے گزرتا تھا۔ جس کو سیکھنے میں دوسرے درویشوں کو مہینوں بعض اوقات برسوں لگتے، وہ اگر دنوں نہیں تو ہفتوں میں کر لیتے تھے۔ ہرنئی اور غیر معمولی شے کے لیے ان میں حیرت انگیز تجسس تھا اور وہ فطرت کے مشاہد تھے۔ بہت بار میں نے اُنہیں باغ میں، مکڑی کے جالوں کے تناسب یا رات کو کھلنے والے پھول پر چمکتے شبنم کے جھلملاتے قطروں کی تحسین کرتے پایا۔ حشرات الارض، پودے اور جانور اُنہیں کتابوں اور مسودوں سے زیادہ دلچسپ اور اثر انگیز لگتے تھے۔ لیکن پھر جب میں یہ سوچنے کو تھا کہ اُنہیں مطالعے میں کوئی دلچسپی نہیں، میں انہیں کسی قدیم کتاب میں گم پاتا۔ پھر دوبارہ، وہ ہفتوں بغیر کچھ پڑھے یا مطالعہ کیے گزار دیتے تھے۔

جب میں نے اُن سے اس بارے میں پوچھا، اُنہوں نے جواب دیا کہ کسی کو اپنی عقل و دانش کو مطمئن رکھنا چاہیے، تاہم احتیاط کرنی چاہیے کہ اُسے بگاڑ نہ دے۔ یہ اُن کے اصولوں میں سے ایک تھا۔

''محبت اور عقل مختلف مادے سے بنے ہیں۔'' اُنہوں نے کہا، ''عقل لوگوں کو گرہوں میں باندھ دیتی ہے اور کچھ بھی داؤ پر نہیں لگاتی لیکن محبت تمام گرہوں کو تحلیل کر دیتی ہے اور سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہے۔ عقل ہمیشہ محتاط ہوتی ہے اور نصیحت کرتی ہے، ''بے پناہ بے خودی سے محتاط رہو۔'' جب کہ محبت کہتی ہے، ''پروا نہیں! چھلانگ لگا دو!'' عقل آسانی سے ہار نہیں مانتی جب کہ محبت بلا تردد خود کو ریزہ ریزہ ملبہ کر لیتی ہے۔ لیکن کھنڈرات میں خزانے پنہاں ہیں۔ ٹوٹے ہوئے شکستہ دل میں خزانے پنہاں ہیں۔''

جب میں اُنہیں بہتر طور پر جاننے لگا، میں نے اُن کی بے باکی اور تیز فہمی کی داد دی۔ لیکن مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ شمس تبریز کی بے نظیر ہوشیاری اور قوتِ تخلیق کا ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ ایک بات تھی کہ وہ ترش روئی کی حد تک صاف گو تھے۔ میں نے اپنے درویشوں کو دوسروں میں خامیاں نہ دیکھنا سکھایا تھا اور یہ کہ اگر وہ ایسا کریں بھی تو اس بارے میں خاموش اور درگزر کرنے والے ہوں۔ تاہم ایسی کوئی خامی نہ تھی جس پر شمس تبریز کی توجہ نہ جاتی ہو۔ جب بھی وہ کچھ غلط دیکھتے تو فوراً بول اٹھتے تھے، کبھی اِدھر اُدھر کی نہ ہانکتے تھے۔ اُن کی یہ ایمان داری دوسروں کو مشتعل کرتی لیکن اُنہیں لوگوں کو اشتعال دلانا بھی پسند تھا تاکہ دیکھ سکیں کہ غصے کے عالم میں ان کے اندر سے کیا کچھ باہر نکلتا ہے۔

اُنہیں عام معمول کے کاموں پر مجبور کرنا مشکل تھا۔ اُن میں ایسے کاموں کے لیے صبر نہ تھا اور جیسے ہی وہ کام کرنا سیکھ جاتے، اس میں ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی۔ جب وہی کام معمول کا حصہ بن جاتا تو وہ انہیں پنجرے میں بند کسی چیتے کی طرح مضطرب کر دیتا۔ اگر کسی گفتگو سے وہ اکتا جاتے یا کوئی شخص کوئی احمقانہ تبصرہ کرتا تو وہ اٹھ کر چل دیتے، دل لگی میں کبھی وقت برباد نہ کرتے۔ بیشتر انسانوں کو جو اقدار عزیز ہوتی ہیں، جیسا کہ تحفظ، آرام اور خوشی، ان کے اُن کی نگاہوں میں بہ مشکل ہی کوئی معانی تھے۔ اور لفظوں پر اُس کا عدم بھروسا اس قدر شدید تھا کہ کئی کئی روز وہ بغیر کچھ کہے گزار دیتے۔ یہ بھی اُس کے اصولوں میں سے ایک تھا: ''دنیا کے بیشتر مسائل کی جو زبان کی لغزش اور سادہ غلط فہمیاں ہیں۔ لفظوں کو ان کے ظاہر پر بھی مت لیں۔ جب آپ محبت کے علاقے میں قدم دھرتے ہیں تو جو زبان ہم جانتے ہیں، وہ فرسودہ ہو جاتی ہے۔ جسے لفظوں میں ادا نہ کیا جا سکے، اُسے صرف خاموشی کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔''

وقت کے ساتھ میں اُن کی خیر و عافیت کے لیے فکر مند ہو گیا کیوں کہ اندر کہیں میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص جو اتنی شدت سے فروزاں تھا، خود کو کسی خطرناک صورتِ حال میں ڈالنے کا رجحان رکھ سکتا تھا۔

انجام کار، ہمارے مقدر خدا کے ہاتھ میں ہیں اور صرف وہی آگاہ ہے کہ ہم میں سے کون کب اور کیسے دنیا سے رخصت ہو گا۔ اپنی طرف سے میں نے پوری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا کہ شمس تبریز کو آہستہ روی پر جتنا مائل کر سکوں، کروں اور اُنہیں نسبتاً پرسکون طرزِ زندگی کے معمولات کا پابند بناؤں۔ اور کچھ عرصے تو مجھے خیال بھی ہوا کہ میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ لیکن پھر سرما آ گیا اور موسم سرما کے ساتھ دور دراز سے ایک پیغام بر ایک مراسلہ لیے چلا آیا۔ اور اُس خط نے سب کچھ تبدیل کر دیا۔

مکتوب

قیصری سے بغداد، فروری 1243ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،

میرے محترم، بابا زمان،

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ ہمیں ایک دوسرے سے ملاقات کیے ایک عرصہ بیت چکا ہے اور مجھے امید ہے کہ میرا خط آپ کو بخیر و عافیت پائے گا۔ بغداد کے مضافات میں آپ نے جو خانقاہ تعمیر کی ہے، اس کے متعلق میں نے بہت سی قابل تعریف باتیں سنی ہیں، کہ آپ درویشوں کو علم و حکمت اور حب الٰہی کی تعلیم دیتے ہیں۔ میں یہ خط آپ کو رازدارانہ طور پہ لکھ رہا ہوں تا کہ آپ کو ایک ایسی بات میں شریک کر سکوں جو میرے دماغ پہ سوار ہے۔ مجھے ابتداء سے آغاز کی اجازت دیجیے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ مرحوم سلطان علاؤالدین کیقباد ایک اہم اور غیر معمولی شخصیت تھے، مشکل ادوار میں جنہوں نے قیادت و رہنمائی میں شرف حاصل کیا۔ ایک ایسے شہر کی تعمیر ان کا خواب تھا جہاں شاعر، ہنرمند اور فلسفی رہتے اور امن و سکون سے کام کر سکتے۔ دنیا میں پھیلی عداوت و انتشار کے باعث اس خواب کو بہت سے لوگ ناممکن الحصول کہتے تھے۔ خصوصاً جب دونوں اطراف سے صلیبی اور منگول حملہ آور ہو رہے ہوں۔ ہم یہ سب دیکھ چکے ہیں۔ مسلمانوں کو ہلاک کرتے عیسائی، عیسائیوں کو مارتے عیسائی، عیسائیوں کی جان لیتے مسلمان۔ ایک دوسرے کے حریف مذہب، فرقے، قبیلے حتیٰ کہ بھائی۔ لیکن کیقباد ایک پرعزم رہنما تھے۔ انہوں نے قونیہ شہر کا انتخاب کیا جہاں وہ اپنے خواب کو تعبیر دے سکیں... عظیم طوفان نوح کے اترنے پر ابھرنے والی پہلی جگہ...

اب قونیہ میں ایک ایسے عالم رہتے ہیں جن کا ذکر آپ نے شاید سنا ہو یا نہیں۔ ان کا نام مولانا جلال الدین رومی ہے مگر اکثر انہیں صرف رومی کے نام سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ مجھے ان سے ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ تعلیم کا موقع بھی ملا، پہلے ان کے استاد کے طور پہ، پھر ان کے والد کی وفات کے بعد ان کے شیخ و مرشد کے طور پہ اور برسوں بعد ان کے طالب علم کے طور پہ۔

ہاں میرے دوست، میں اپنے شاگرد کا شاگرد بن گیا۔ وہ اس قدر باصلاحیت اور دانش مند ہیں کہ ایک مقام کے بعد جب تعلیم دینے کو میرے پاس کچھ نہ رہا تو میں نے اس کی بجائے ان سے تعلیم لینا شروع کر دی۔ ان کے والد بھی ایک روشن فکر عالم تھے۔ لیکن رومی میں وہ خصوصیت ہے جو کم ہی علما میں ہوتی ہے: مذہب کی چھال کے اندر گہرائی میں اترنا اور اس کے مرکز سے وہ گوہر نکال لانا جو آفاقی اور ابدی ہو۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ محض میرے ذاتی خیالات نہیں۔ جب نوجوانی میں رومی کی ملاقات عظیم صوفی، دواساز اور عطار، فریدالدین سے ہوئی تو عطار نے اُن سے متعلق کہا تھا،" یہ لڑکا محبت کے دل میں دروازہ وا کرے گا اور تمام صوفی عشاق کے دلوں میں شعلہ جگا دے گا۔" اسی طرح ممتاز فلسفی، مصنف اور صوفی، ابن عربی نے ایک روز نوعمر رومی کو اپنے والد کے عقب میں چلتے دیکھ کر بے ساختہ کہا:" سبحان اللہ، ایک بحر، ایک جھیل کے پیچھے چل رہا ہے!"

چوبیس برس کی نوعمری میں مولانا رومی روحانی رہنما بن گئے۔ آج تیرہ برس بعد قونیہ کے باسی انہیں ایک مثالی شخصیت کے طور پر دیکھتے ہیں اور ہر جمعہ کے روز ان کے خطبات کو سننے کے لیے پورے خطے کے لوگ اس شہر میں جمع ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے قانون، فلسفے، الہیات، فلکیات، تاریخ، علم کیمیا اور الجبرا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے دس ہزار کے لگ بھگ شاگرد ہیں۔ اُن کے پیروکار اُن کے لفظ لفظ کو سنتے اور انہیں ایک ایسا عظیم باعلم شخص گردانتے ہیں جو اگر تاریخ عالم میں نہیں تو تاریخ اسلام میں کوئی اہم مثبت تبدیلی لائے گا۔

لیکن میرے لیے رومی ہمیشہ کسی بیٹے کی طرح ہیں۔ میں نے اُن کے مرحوم والد سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان پر نگاہ رکھوں گا۔ اور اب جب کہ میں اپنے آخری ایام کی جانب بڑھتا ایک بوڑھا ضعیف شخص ہوں، میں یقین دہانی چاہتا ہوں کہ وہ صحیح صحبت میں رہیں۔

آپ جانتے ہیں، اس قدر حیرت انگیز غیر معمولی اور بلاشبہ کامیاب ہونے کے باوجود، مولانا رومی نے خود کئی مرتبہ مجھے شریک راز کیا کہ باطنی طور پر وہ خود کو غیر مطمئن محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں کسی شے کی کمی ہے... ایک خلا جسے ان کا خاندان نہ ہی شاگرد پُر کر سکتے ہیں۔ ایک بار میں نے انہیں بتایا کہ اگرچہ وہ خام نہ تھے مگر وہ کندن بھی نہ تھے۔ ان کا پیالہ کنارے تک بھرا ہوا تھا اور پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ ان کی روح کا دروازہ وا ہو جائے تاکہ محبت کی آب جو اندر باہر بہہ سکے۔ جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے تو میں نے بتایا کہ انہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے، رفیق راہ اور انہیں یاد دلایا کہ حدیث نبویؐ میں ارشاد ہوتا ہے:" مومن ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔"

اگر یہ موضوع دوبارہ نہ اٹھتا تو میں اسے بالکل ہی فراموش کر چکا ہوتا لیکن جس روز میں قونیہ سے روانہ ہوا، مولانا رومی میرے پاس اس خواب کی تعبیر لینے آئے جو انہیں متواتر دکھائی دے کر پریشان کر رہا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اپنے خواب میں وہ کسی دور دراز سرزمین کے پُرہجوم شہر میں کسی

کو تلاش کر رہے تھے۔ الفاظ عربی میں۔ پُر مسرت غروبِ آفتاب۔ شہتوت کے درخت اور اپنے اخفا کوئے میں صبر سے اپنے لمحے کے منتظر ریشم کے کیڑے۔ پھر انہوں نے اس گھر کے صحن میں خود کو دیکھا، اپنے ہاتھ میں لالٹین لیے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے، گریہ کناں۔

ابتدا میں مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ ان کے خواب کے یہ ٹکڑے کس طرف اشارہ تھے۔ کچھ بھی مانوس دکھائی نہ دیا۔ لیکن ایک روز جب مجھے تحفے میں ریشمی گلوپوش ملا، جواب میری گرفت میں آ گیا اور معمہ حل ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ کیسے آپ ریشم اور اس کے کیڑوں کے شوقین تھے۔ مجھے وہ شاندار باتیں یاد آئیں جو میں نے آپ کے "طریقہ" کے بارے سنی تھیں۔ اور مجھ پر عیاں ہوا کہ مولانا رومی نے جو جگہ اپنے خوابوں میں دیکھی تھی، وہ آپ کی خانقاہ کے سوا اور کوئی نہ تھی۔ مختصر یہ میرے برادر، کہ میں خود کو یہ سوچنے سے روک نہ پایا کہ کیا مولانا کا رفیق آپ کی چھت تلے رہتا ہے۔ یہ خط تحریر کرنے کا سبب یہی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ آپ کی خانقاہ میں ایسا کوئی آدمی ہے یا نہیں۔ لیکن اگر ہے تو میں اُسے اس کے منتظر مقدر سے مطلع کرنے کی ذمہ داری آپ پر چھوڑتا ہوں۔ اگر میں اور آپ دو دریاؤں کے ملنے اور حبِ الٰہی کے سمندر کی طرف ایک ہو کر بہنے میں کوئی لمحے بھر کا بھی کردار ادا کر سکتے ہیں تو... اگر ہم خدا کے دو اچھے دوستوں کے ملنے میں مدد کر سکتے ہیں تو میں خود کو فیض یاب لوگوں میں شمار کروں گا۔

تاہم، آپ کو ایک بات کا خیال رکھنے کی ضرورت ہو گی۔ مولانا رومی ایک بارسوخ شخصیت ہو سکتے ہیں جن کی بہت سے لوگ تعریف و احترام کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کے کوئی ناقد نہیں۔ ان پر تنقید کرنے والے کئی ایک لوگ ہیں۔ مزید یہ کہ یوں مل کر بہنے پر عدم اطمینان اور مخالفت سر اٹھا سکتے ہیں اور ایسی رقابتیں سامنے آ سکتی ہیں جو ہماری سمجھ و فہم سے باہر ہوں۔ اپنے رفیق کے لیے ان کی محبت پر اُن کے خاندانی اور قریبی حلقے میں مسئلے اٹھ سکتے ہیں۔ کوئی شخص جس سے کوئی دوسرا ایسا شخص کھلے عام محبت رکھتا ہو جس کی بہت سے لوگ تعریف و تحسین کرتے ہیں تو اس پر پہلے شخص کے لیے اگر دوسروں کی طرف سے نفرت نہیں تو رشک و حسد کا سر اٹھانا لازم ہے۔

یہ سب مولانا رومی کے رفیق کو کسی ممکنہ خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں میرے برادر، آپ جس شخص کو قونیہ روانہ کریں گے، ہو سکتا ہے وہ کبھی واپس نہ لوٹ پائے۔ اس لیے اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے کہ اس خط کو مولانا کے رفیق پر کیسے ظاہر کریں، میں چاہوں گا کہ آپ اس معاملے پر خوب غور کر لیں۔

آپ کو ایک مشکل صورتِ حال سے دوچار کرنے پر مجھے افسوس ہے لیکن جیسا کہ ہم دونوں جانتے ہیں، خدا ہم پر اس سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا جو ہم برداشت نہ کر سکیں۔ میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں اور بھروسا رکھیے جو بھی نتیجہ ہوا، آپ درست سمت میں درست قدم ہی اٹھائیں گے۔

خدا کرے، آپ اور آپ کے درویش سدا ایمان کی روشنی میں منور رہیں۔

استاد سید برہان الدین

شمس

بغداد، 18 ستمبر 1243ء

برف کی لشکتی قلموں اور برفاب سفید راستوں سے آگے، دُور کہیں ایک پیغامبر نمودار ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ قیصری سے آیا تھا اور اس پر درویشوں میں ہل چل سی ہوئی جو جانتے تھے کہ سال کے اس وقت میں مہمان گرمیوں کے میٹھے انگور سے بھی زیادہ کم یاب تھے۔ اس قدر فوری پیغام لانے والا قاصد جس نے برفانی طوفان کی بھی پرواہ نہ کی تھی، اس کے دو میں سے کوئی ایک مطلب ہو سکتا تھا: کوئی افسوس ناک واقعہ رونما ہوا تھا یا پھر کچھ اہم ہونے جا رہا تھا۔

قاصد کی آمد پر خانقاہ کے درویشوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی کیوں کہ ہر کوئی شیخ کو دیے گئے خط کے بارے میں متجسس تھا۔ لیکن اسرار کی چادر تلے شیخ نے کسی قسم کا کوئی اشارہ نہ دیا۔ جذبات سے عاری، زیرِ لب جیسے جگالی کرتے اور سرگری سے خود پر پہرے بٹھائے، کئی روز ان کے چہرے پر ایسا تاثر رہا جیسے وہ اپنے ضمیر سے لڑ رہے ہوں اور درست فیصلے پر پہنچنے میں انہیں دشواری ہو رہی ہو۔

اس دورانیے میں بابا زمان کے قریب سے مشاہدے پر مجھے صرف تجسس نے نہیں اکسایا تھا۔ اندر کہیں باطن میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ خط ذاتی طور پر میرے متعلق تھا، اگرچہ میں یہ نہ بتا سکتا تھا کہ کس طرح سے۔ میں نے کئی شامیں خدا سے رہنمائی کی استدعا میں اللہ کے 99 اسمائے حسنیٰ کا ورد کرتے گزاریں۔ ہر مرتبہ ایک ہی نام سامنے آ جاتا: الجبار... ہر شے جس کے زیرِ تصرف ہے اور جس کی سلطنت میں اُس کی مرضی و ارادے کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔

آنے والے دنوں میں جب خانقاہ میں ہر کوئی بے لگام اندازے لگا رہا تھا، میں باغ میں تنہا وقت گزارتا اور دھرتی ماں کو برف کی دبیز چادر تلے دراز دیکھتا۔ آخر ایک روز ہمیں باورچی خانے میں لگی تانبے کی گھنٹی متواتر بجتی سنائی دی جو ہمیں فوری اجلاس کے لیے بلا رہی تھی۔ خانقاہ کے بڑے کمرے میں داخل ہونے پر مجھے شاگرد اور درویش سب وہاں جمع ملے جو ایک بڑے سے دائرے کی صورت بیٹھے

ہوئے تھے۔ دائرے کے درمیان آفندی تھے، ان کے لب بھینچے ہوئے اور آنکھیں دھندلی تھیں۔

کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد وہ بولے، ''بسم اللہ۔ آپ سب حیران ہوں گے کہ میں نے آج آپ کو یہاں کیوں بلایا ہے۔ معاملہ اس خط کا ہے، جو مجھے موصول ہوا۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کہاں سے آیا۔ یہ کہنا کافی ہے کہ اس نے میری توجہ ایک ایسے موضوع کی طرف دلائی جس کا نتیجہ عظیم ہوگا۔''

بابا زمان ذرا دیر کو رکے اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ تھکن زدہ، دبلے اور زرد رُو دکھائی دیے، یوں جیسے ان گزشتہ دنوں میں اُن کی عمر خاصی بڑھ گئی تھی۔ لیکن جب انہوں نے سلسلۂ کلام پھر سے جوڑا تو ان کی آواز ایک غیر متوقع عزم سے بھری ہوئی تھی۔

''ایک شہر جو یہاں سے زیادہ دور نہیں، وہاں ایک عالم فاضل شخصیت رہتی ہے۔ وہ الفاظ کے استعمال میں تو ماہر ہیں مگر تشبیہات میں نہیں کیوں کہ وہ شاعر نہیں۔ ہزاروں لوگ اُن سے محبت کرتے، ان کا احترام کرتے اور ان کی تعریف کرتے ہیں لیکن وہ خود کسی کے محب نہیں ہیں۔ ایسے اسباب کے باعث جو میری اور آپ کی رسائی سے باہر ہیں، ہماری خانقاہ میں سے کسی کو اُن سے ملنے جانا اور ان کا رفیق بننا ہوگا۔''

میرا دل میرے سینے میں جیسے سکڑ گیا۔ میں نے آہستگی، بے حد آہستگی سے سانس خارج کی۔ میں ایک اصول کو یاد کرنے سے خود کو روک نہ پایا۔ ''تنہائی اور خلوت دو مختلف چیزیں ہیں۔ جب آپ تنہا ہوتے ہیں تو آسانی سے اس جھانسے میں آجاتے ہیں کہ آپ درست راستے پر ہیں۔ خلوت ہمارے لیے بہتر ہے کیوں کہ اس کے معانی ہیں، کسی کی کمی محسوس نہ ہوتے ہوئے تنہا ہونا۔ لیکن آخر کار بہترین یہی ہے کہ کوئی شخص ڈھونڈ لیا جائے، کوئی شخص جو آپ کا آئینہ ہو۔ یاد رکھیں کہ کسی دوسرے شخص کے آئینۂ قلب میں ہی آپ اپنا عکس اور اپنے اندر خدا کے ظہور یا جلوے کو دیکھ سکتے ہیں۔''

شیخ نے بات جاری رکھی۔ ''میں یہاں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا آپ میں سے کوئی رضا کارانہ طور پر اس روحانی سفر پر جانا چاہے گا۔ میں خود کسی کو متعین کر سکتا تھا مگر یہ کوئی ایسا کام نہیں جو فریضہ سمجھ کر ادا کیا جا سکے۔ کیوں کہ یہ صرف محبت کی خاطر اور محبت کے نام پر ہی کیا جا سکتا ہے۔''

ایک نوجوان درویش نے بولنے کی اجازت چاہی۔ ''وہ عالم کون ہیں؟''

''میں اُن کا نام صرف اُس شخص پر آشکار کر سکتا ہوں جو جانے پر آمادہ ہو۔''

یہ سن کر کئی درویشوں نے پرجوش ہو کر بے صبری سے ہاتھ کھڑے کیے۔ نو امیدوار تھے۔ میں ان میں شامل ہو کر دسواں بن گیا۔ بابا زمان نے ہمیں ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ان کی بات مکمل ہونے کا انتظار کریں۔ ''ایک بات اور ہے جو اپنا ذہن بنانے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ جان لیں۔''

اس پر شیخ نے ہمیں بتایا کہ اس سفر میں بڑا خطرہ اور بے مثال مشکلات تھیں اور واپسی کی کوئی

یقین دہانی نہ تھی۔ فوراً ہی سب ہاتھ نیچے ہو گئے۔ سوائے میرے۔

بابا زمان نے پہلی مرتبہ دیر تک میری آنکھوں میں جھانکا اور جیسے ہی میری نگاہیں ان سے ملیں، میں سمجھ گیا کہ وہ شروع سے آگاہ تھے کہ رضا کار صرف میں ہی ہوں گا۔

''شمس تبریز!'' شیخ نے آہستگی اور اس طرح مغموم انداز میں کہا، جیسے میرا نام ان کے منہ میں کوئی بوجھل ذائقہ چھوڑ گیا ہو۔ ''میں آپ کے عزم کا احترام کرتا ہوں مگر آپ اس سلسلہ طریقت کے پوری طرح رکن نہیں ہیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔''

''میں نہیں جانتا کہ اس بات میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

شیخ دیر تک غور و فکر کے عالم میں خاموش رہے۔ پھر غیر متوقع طور پر وہ کھڑے ہوئے اور بات ختم کی، ''آؤ ذرا دیر کو یہ موضوع ترک کر دیں۔ آمدِ بہار پر ہم دوبارہ اس بارے میں بات کریں گے۔''

میرا دل مائل بہ بغاوت ہو گیا۔ بابا زمان جانتے تھے کہ میری بغداد آمد کا سبب ہی یہی تھا، پھر بھی وہ مجھے میرے مقدر کی تکمیل کے موقع سے محروم کیے دے رہے تھے۔

''کیوں آفندی؟ انتظار کیوں جب کہ میں اسی لمحے سے تیار ہوں؟ مجھے صرف شہر اور عالم کا نام بتائیے اور میں اپنے رستے پر ہوں گا!'' میں نے بے ساختہ کہا۔

لیکن شیخ نے فوراً ہی ایسے سرد اور سخت لہجے میں جواب دیا جو میں اُن سے سننے کا عادی نہ تھا۔

''بحث نہیں۔ اجلاس ختم ہوا۔''

☼

وہ ایک طویل اور سخت موسم سرما تھا۔ باغ منجمد تھا اور میرے لب بھی۔ اگلے تین ماہ میں نے کسی سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ ہر روز میں مضافات میں لمبی سیر کیا کرتا، اس امید میں کہ کوئی ایسا درخت دکھائی دے جائے جس پر شگوفے پھوٹ پڑے ہوں۔ لیکن برف باری کے بعد مزید برف باری ہوئی۔ بہار افق پر کہیں نہ تھی۔ پھر بھی، باہر سے میں جتنا مایوس اور دل شکستہ دکھائی دیتا تھا، اپنے ذہن میں ایک اور اصول رکھتے ہوئے اندر سے اتنا ہی شکر گزار اور پُرامید رہا۔ ایک اصول تھا جو میرے مزاج سے موزوں تھا: ''زندگی میں کچھ بھی رونما ہو جائے، زندگی چاہے کتنی ہی دشوار لگنے لگے، مایوسی کے کبھی قریب بھی مت پھٹکنا۔ حتیٰ کہ جب سب دروازے بند ہو جائیں، تب اللہ صرف تمہارے لیے کوئی نیا دروا کر دے گا۔ شکر گزار بنو! سب اچھا ہو تو شکر گزاری کرنا بڑا آسان ہوتا ہے۔ لیکن ایک صوفی نہ صرف ان نعمتوں کے لیے شکر گزار ہوتا ہے جو اُسے بخشی جائیں بلکہ اس سب کے لیے بھی مشکور رہتا ہے جس سے اُسے محروم رکھا جائے۔''

پھر ایک صبح آخرکار مجھے برف کی پرتوں تلے سے پھوٹتا، کسی شیریں نغمے جیسا پُرمسرت ایک خیرہ کن رنگ کا نظارہ دکھائی دیا۔ وہ ننھے ننھے کاسنی پھولوں سے بھری ہچتیا گھاس کی جھاڑی تھی۔ میرا دل مسرت سے معمور ہو گیا۔ خانقاہ واپس آتے ہوئے مجھے سنہری بالوں والا نومرید ملا اور میں نے خوشی خوشی

اُسے سلام کیا۔ وہ مجھے اپنی ترش رُو خاموشی میں گم دیکھنے کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

''مسکراؤ لڑکے!'' میں چلایا، ''دیکھتے نہیں بہار آگئی ہے؟''

اس روز کے بعد قدرتی مناظر حیران کن تیزی سے بدلنے لگے۔ برف پگھلی، درختوں پر شگوفے پھوٹے، چڑیاں اور گانے والی چڑیاں لوٹ آئیں اور زیادہ دیر نہ گزری کہ فضا ایک ہلکی سی خوشبو سے معطر ہو گئی۔

ایک صبح ہمیں پھر سے تانبے کی گھنٹی بجتی سنائی دی۔ اس مرتبہ بڑے کمرے میں پہنچنے والا پہلا شخص میں تھا۔ ایک بار پھر ہم شیخ کے گرد ایک بڑے دائرے کی صورت بیٹھ گئے اور انہیں اس ممتاز مسلمان عالم کے بارے باتیں کرتے سنا جو سب کچھ جانتے تھے، ماسوائے داغِ محبت کے۔ ایک بار پھر میرے سوا کسی نے خدمات پیش نہ کیں۔

''میں دیکھتا ہوں کہ صرف شمس تبریز ہی نے خدمات پیش کی ہیں۔'' بابا زمان نے اعلان کیا۔ ان کی آواز کا آہنگ بلند ہو رہا تھا اور پھر بھی وہ ہوا کی سرسراہٹ جیسی تھی۔ ''لیکن فیصلے پر پہنچنے سے پہلے میں موسم خزاں کا انتظار کروں گا۔''

میں ہکا بکا رہ گیا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، میں اس کا یقین نہ کر پایا۔ التوا کے تین طویل مہینوں بعد یہاں تھا میں، روانہ ہونے کو تیار اور شیخ مجھے اگلے مزید چھ ماہ سفر ملتوی کرنے کا کہہ رہے تھے۔ ڈوبتے دل کے ساتھ میں نے احتجاج کیا، شکایت کی اور شیخ سے التجا کی کہ مجھے شہر اور عالم کا نام بتادیں۔ مگر ایک بار پھر انہوں نے انکار کر دیا۔

تاہم اس مرتبہ مجھے معلوم تھا کہ انتظار آسان ہوگا کیوں کہ مزید تاخیر نہ کی جا سکتی تھی۔ سرما سے بہار تک ثابت قدم رہنے کے بعد میں بہار سے خزاں تک اپنی آتش پر قابو رکھ ہی سکتا تھا۔ بابا زمان کے انکار نے مجھے بددل نہ کیا۔ اگر کچھ کیا تو میرے جذبے کو فروزاں اور عزم کو مزید توانا کر دیا تھا۔ ایک اور اصول کے مطابق، ''صبر، بے بسی سے برداشت کیے جانے کا نام نہیں۔ اس سے مراد ہے، اتنی دور اندیشی کہ کسی عمل کے انجام پر بھروسا کیا جائے۔ صبر سے کیا مراد ہے؟ اس کا مطلب ہے خار پر نگاہ کرتے پھول دکھائی دے، رات نظر میں ہو اور دکھائی صبح کا اُجالا دے۔ بے صبری کا مطلب ہے، کوتاہ بینی یعنی کوئی شخص انجام کو دیکھنے کے قابل نہ ہو پائے۔ محبانِ الٰہی صبر کا دامن تھامے رکھتے ہیں کیوں کہ وہ خوب آگاہ ہوتے ہیں کہ ہلال کو ماہِ کامل بننے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔''

موسم خزاں کے آغاز پر تانبے کی گھنٹی تیسری بار بج اٹھی، میں بلا عجلت اور پورے اعتماد سے آگے بڑھا، اس بھروسے کے ساتھ کہ اب معاملات بالآخر طے ہو جائیں گے۔ جب بابا زمان نے ایک بار پھر مجھے ہاتھ اٹھاتے دیکھا تو انہوں نے نگاہ چرائی نہ موضوع بدلا۔ اس کی بجائے انہوں نے میری طرف دیکھ کر عزم سے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے شمس، کوئی سوال نہیں کہ آپ ہی کو اس سفر پر روانہ ہونا چاہیے۔ کل صبح آپ اپنے راستے پر ہوں گے، اِن شاء اللہ۔''

میں نے شیخ کی دست بوسی کی۔ آخر کار عرصے بعد میں اپنے رفیق سے ملنے جا رہا تھا۔

بابا زمان مجھے دیکھ کر گرم جوشی اور کسی گہری فکر میں مشغول مسکرائے، بالکل جس طرح کوئی باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو میدانِ جنگ کی طرف روانہ کرتے مسکراتا ہے۔ پھر انہوں نے اپنے لمبے خاکی لبادے سے ایک مہر بند خط نکالا اور وہ مجھے تھمانے کے بعد خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ہر کسی نے اُن کی پیروی کی۔ میں کمرے میں تنہا رہ گیا، میں نے موم کی مہر کھولی۔ اس کے اندر نفیس تحریر میں دو معلومات تھیں۔ شہر اور عالم کا نام۔ بہ ظاہر مجھے کسی مولانا جلال الدین رومی سے ملنے کے لیے قونیہ جانا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میں نے یہ نام پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ میں بس اتنا واقف تھا کہ وہ کوئی مشہور عالم ہو سکتے تھے لیکن میرے لیے وہ ایک مکمل اسرار تھے۔ ایک ایک کر کے میں نے اُن کے نام کے حروف دہرائے: طاقت ور اور درخشاں ''ر''، مخملیں ''و''، بے خوف اور خود اعتماد ''م'' اور پُر اسرار ''ی''، جسے ابھی حل ہونا تھا۔

ان حروف کو ملا کر، میں نے وہ نام بار بار دہرایا، یہاں تک کہ وہ لفظ کسی مٹھائی کی شیرینی کے ساتھ میرے زبان پر گھل گیا اور اس قدر مانوس ہو گیا، جیسے ''پانی''، ''روٹی'' یا ''دودھ۔''

ایلا

نارتھمپٹن، 22 مئی 2008ء

اپنی سفید دلائی تلے ایلا خود کو ناتواں محسوس کرتے خراب گلے کے ساتھ بستر پر لیٹی تھی۔ دیر تک جاگنے اور متواتر کئی راتیں اپنے معمول کی حد سے زیادہ مے نوشی کرنے پر اُسے یہ قیمت چکانی پڑی۔ پھر بھی وہ ناشتے کی تیاری کے لیے نیچے گئی اور اپنے جڑواں بچوں اور شوہر کے ہمراہ میز پر بیٹھے اُس نے پوری کوشش کی کہ سکول میں Coolest گاڑیوں پر اُن کی گپ شپ میں دلچسپی دکھائے جب کہ اس وقت وہ بس واپس بستر میں لیٹ کر سونا چاہتی تھی۔

اچانک اورلی اپنی ماں کی طرف مڑی اور پوچھنے لگی، ''ایوی کہتا ہے کہ ہماری بہن دوبارہ کبھی گھر نہیں آئے گی۔ کیا یہ سچ ہے مام؟'' اُس کے لہجے میں شک اور الزام کی بُو تھی۔

''یقیناً، یہ سچ نہیں ہے۔ تمہاری بہن اور میرا جھگڑا ہوا تھا، جیسا کہ تم جانتی ہی ہو مگر ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔'' ایلا نے کہا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے سکاٹ کو فون کیا اور اُسے جینٹ کو چھوڑنے کا کہا تھا؟'' ایوی نے بظاہر اس موضوع سے مزہ لیتے ہوئے دانت نکال کر پوچھا۔

ایلا نے پوری آنکھیں کھول کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ لیکن ڈیوڈ نے یوں بھنویں اچکائیں اور ہاتھ جھٹکے، جیسے اشارے میں کہتا ہو کہ انہیں ایسی باتیں بتانے والا وہ نہیں تھا۔

کوشش کر کے خود کو پُرسکون کرتے ایلا اپنے لہجے میں حکمانہ تاثر لے آئی جس میں وہ اپنے بچوں کو ہدایات دیا کرتی تھی۔ ''یہ درست نہیں ہے۔ میں نے سکاٹ سے بات ضرور کی تھی لیکن میں نے اُسے تمہاری بہن کو چھوڑنے کا نہیں کہا۔ میں نے صرف شادی میں جلدی نہ کرنے کا کہا تھا۔''

''میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔'' اورلی نے پورے یقین سے اعلان کیا۔

''ہاں! جیسے کوئی لڑکا تمہیں بیوی بنانا ہی تو چاہے گا!'' ایوی نے ٹکڑا توڑ جواب دیا۔

اپنے جڑواں بچوں کو ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے سنتی ایلا کے ہونٹوں پر گھبراہٹ زدہ مسکراہٹ آٹھہری جس کی وجہ وہ خود بھی سمجھ نہ پائی۔ ایلا نے اسے دبانے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ وہاں موجود تھی، اُس کی جلد تلے نقش جب ان کا دن اچھا گزرنے کی دعا کے ساتھ اس نے انہیں رخصت کیا۔

واپس میز پر اپنی سیٹ پر پہنچ کر ہی وہ اُس مسکراہٹ سے نجات پا سکی تھی اور ایسا اُس نے خود کو منہ بسورنے کی اجازت دے کر کیا۔ کچن یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہاں چوہوں کی کسی فوج نے حملہ کر دیا ہو۔ اَدھ کھائے انڈے، سیریل کے آدھے چھوڑے پیالے اور کاؤنٹر پر گندے مگ کا ڈھیر۔ باہر جانے کے لیے بے چین سپرٹ ٹہل رہا تھا لیکن کافی کے دو کپ اور ملٹی وٹامن مشروب کے بعد بھی ایلا بس اتنا ہی کر پائی کہ اُسے چند منٹوں کے لیے باہر باغ میں ہی لے جا سکی۔

☼

باغ سے واپسی پر ایلا کو آنسرنگ مشین کی سرخ بتی جلتی بجھتی ملی۔ اُس نے بٹن دبایا اور اُسے خوشی ہوئی کہ جینٹ سریلی آواز کمرے میں پھیل گئی۔

''مام، آپ موجود ہیں... ؟ اچھا، میرا خیال ہے نہیں، ورنہ آپ فون اٹھا لیتیں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''اوکے، مجھے آپ پر اس قدر غصہ تھا کہ میں دوبارہ آپ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اب میں اس بارے میں ٹھنڈی ہو چکی ہوں۔ میرا مطلب ہے، آپ نے جو کیا وہ غلط تھا، یہ یقینی بات ہے۔ آپ کو کبھی سکاٹ کو فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ سنیں، آپ کو سارا وقت میری حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اب وقت سے پہلے پیدا ہونے والی وہ بچی نہیں جسے انکیوبیٹر میں رکھنا پڑے۔ ضرورت سے زیادہ حفاظت کرنا چھوڑ دیں! بس مجھے میری مرضی سے جینے دیں، ٹھیک ہے؟''

ایلا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اُس کے دماغ میں نوزائیدہ جینٹ کی صورت گھوم گئی۔ اُس کی جلد بے حد سرخ اور اداس، اُس ننھی اور تقریباً شفاف انگلیوں کی جھریاں، سانس لینے کی ٹیوب سے منسلک اُس کے پھیپھڑے... وہ اس دنیا کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ ایلا نے کئی بے خواب راتیں محض اس کی سانسوں کی آواز سنتے گزاری تھیں، صرف اس یقین دہانی کے لیے کہ وہ زندہ تھی اور زندہ بچ جائے گی۔

''مام، ایک اور بات۔'' جینٹ مزید بولی، جیسے اُسے بعد میں کوئی خیال آیا ہو۔ ''مجھے آپ سے محبت ہے۔''

اس مقام پر ایلا نے ایک گہری سانس خارج کی۔ اُس کا دماغ عزیز کی ای میل کی طرف چلا گیا۔ منت کے اُس پیڑ نے اس کی منت پوری کر دی تھی۔ کم سے کم اُس کا پہلا حصہ تو ضرور۔ اُسے فون کر کے جینٹ نے اپنے حصے کا کام کر دیا تھا۔ اب ایلا کی باری تھی کہ وہ باقی سب کام مکمل کرتی۔ اُس نے اپنی بیٹی کے سیل فون پر کال کی اور اُسے کیمپس لائبریری کے راستے میں پایا۔

''مجھے تمہارا پیغام مل گیا ہے ہنی۔ سنو، مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں تم سے معذرت کرنا چاہتی ہوں۔''

توقف ہوا، مختصر مگر بھرپور۔ ''کوئی بات نہیں، مام۔''

''نہیں، ایسا نہیں۔ مجھے تمہارے جذبات کا احترام کرنا چاہیے تھا۔''

''اس سب کو چھوڑ دیں۔ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟'' جینٹ نے کہا، یوں جیسے وہ ماں تھی اور ایلا اُس کی باغی بیٹی۔

''ہاں، ڈیئر۔''

اب جینٹ کی آواز رازدارانہ سرگوشی میں ڈھل گئی، یوں جیسے وہ جو کچھ آگے پوچھنے جا رہی تھی، اُس سے خائف تھی۔ ''آپ نے اگلے روز جو کہا، اُس نے مجھے کسی قدر پریشان کر دیا ہے۔ میرا مطلب ہے، کیا یہ سچ ہے؟ کیا آپ واقعی ناخوش ہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' ایلا نے قدرے جلدی سے جواب دیا، ''میں نے تین خوب صورت بچے پیدا اور بڑے کیے... میں ناخوش کیسے ہو سکتی ہوں؟''

لیکن جینٹ قائل دکھائی نہ دی۔ ''میرا مطلب ڈیڈی سے تھا۔''

ایلا کو معلوم نہ تھا کہ سوائے سچ کے وہ اور کیا کہے۔ ''تمہارے باپ اور میری شادی کو ایک لمبا عرصہ ہو چکا ہے۔ اتنے برسوں بعد بھی محبت میں گرفتار رہنا مشکل ہوتا ہے۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' جینٹ بولی اور عجیب طور پر ایلا کو محسوس ہوا کہ وہ واقعی سمجھتی تھی۔

اُس کے فون رکھنے کے بعد ایلا نے خود کو محبت کے بارے میں سوچنے کی اجازت دی۔ وہ اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ کیسے وہ جو اس قدر مجروح اور خشک مزاج ہو چکی تھی، کبھی دوبارہ محبت کا تجربہ کر سکتی تھی۔ محبت تو اُن کے لیے تھی جو اس بے لگام گردش کرتی دنیا میں کسی سیب یا قالبے کی تلاش میں تھے۔ لیکن ان لوگوں کا کیا، جو عرصہ ہوا جستجو ہی چھوڑ چکے تھے؟

دن ڈھلنے سے پہلے اُس نے عزیز کو جواب لکھا:

ڈیئر عزیز (اگر میں یوں پکار سکتی ہوں تو)،

تمہارے مہربان اور دل خوش کن جواب کا شکریہ جس نے مجھے خاندانی بحران سے گزرنے میں خاصی مدد دی۔ میری بیٹی اور میں اس ناگوار غلط فہمی کو بھلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، جیسا کہ تم نے اسے نرمی سے نام دیا تھا۔

ایک چیز کے بارے میں تم بالکل درست تھے۔ میں مسلسل دو مخالف چیزوں کے درمیان ڈگمگا رہی ہوں: جارحانہ اور مجہول یا غیر متحرک۔ میں اپنے پیاروں کی زندگیوں میں بہت دخل دیتی ہوں یا پھر میں خود کو ان کے اقدامات پر بالکل بے بس پاتی ہوں۔

جہاں تک تسلیم کرنے یا سر جھکانے کی بات ہے، مجھے کبھی اس قسم کے پُرسکون دستبرداری کا تجربہ نہیں ہوا جس کے بارے میں تم نے لکھا تھا۔ ایمان داری سے کہوں تو مجھے نہیں معلوم کہ صوفی کیسے بنتے ہیں۔ لیکن مجھے تمہیں یہ بتانا ہے کہ حیرت انگیز طور پر جیسے ہی میں نے کچھ چاہنا اور مداخلت کرنا چھوڑ دیا تو جینٹ اور میرے درمیان معاملے بالکل ویسے ہو گئے جیسا میں چاہتی تھی۔ میں تمہاری مقروضِ احسان ہوں۔ میں بھی تمہارے لیے دعا کرنا چاہتی ہوں لیکن ایک عرصہ ہوا جب سے میں نے خدا کے دروازے پہ دستک نہیں دی کہ اب مجھے یقین نہیں کہ آیا خدا اب بھی اسی جگہ ہی رہتا ہے یا نہیں۔ اوہ، کیا میں تمہاری کہانی کے کارواں سرائے کے مالک جیسی بات کر رہی ہوں؟ فکر مت کرو، میں اس کے جیسی تلخ مزاج بالکل نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو نہیں۔

نارتھمپٹن میں تمہاری دوست،

ایلا

مکتوب

بغداد سے قیصری، 29 ستمبر 1243ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر سید برہان الدین،

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ آپ کا خط موصول ہونے پر اور یہ جان کر مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ آج بھی راہِ محبت پر قائم ہیں۔ تاہم آپ کے خط نے مجھے گو مگو کے عالم میں ڈال دیا۔ کیوں کہ جیسے ہی مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ رومی کے رفیق کی تلاش میں ہیں، میں اسی وقت جان گیا کہ آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ البتہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس کے بعد اب میں کیا کروں۔

آپ جانتے ہیں، میری چھت تلے مقیم ایک سرگرداں درویش، شمس تبریز، آپ کے خط میں بیان کردہ تفصیلات پر پورے اترتے ہیں۔ شمس اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ کسی خاص مقصد سے دنیا میں موجود ہیں اور زندگی کے اس مقام پر ان کی خواہش ہے کہ وہ کسی عالم کا سینہ روشن کریں۔ وہ کسی مرید کی تلاش میں ہیں نہ ہی انہیں کسی شاگرد کی ضرورت ہے، انہوں نے اللہ سے کسی رفیق کے لیے دعا کی ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی عام انسان کی تلاش میں نہیں۔ وہ اپنا ہاتھ کسی ایسے شخص کی نبض پر رکھنا چاہتے ہیں جو راہِ حق پر دنیا کی رہنمائی کرے۔

جب مجھے آپ کا خط ملا تو میں تبھی جان گیا کہ شمس تبریز کی تقدیر ہے مولانا رومی سے ملاقات۔ پھر بھی تمام درویشوں کو برابر کا موقع دینے کے لیے میں نے انہیں اکٹھا کیا اور کسی تفصیل میں جائے بغیر انہیں بتایا کہ ایک عالم ہیں جن کی شرح قطب ہونا ہے۔ یہ سن کر بڑے جوش اور وہاں جانے کے امیدوار تو کئی ہوئے، مگر یہ جان کر کہ اس ذمے داری کی راہ میں کئی خطرات تھے، صرف شمس تبریز ہی ثابت قدم رہے۔ یہ پچھلے سال موسم سرما کی بات ہے۔ بہار اور پھر خزاں میں بھی منظر دہرایا گیا۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں نے اتنا انکار کیوں کیا۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا اور صاف گوئی سے بیان کروں تو میں ایک ہی سبب پیش کر سکتا ہوں: میں خود شمس تبریز کا گرویدہ

ہو چکا ہوں۔ مجھے یہ بات اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھی کہ میں انہیں کسی خطرناک سفر پر روانہ کر رہا ہوں۔

آپ جانتے ہیں، شمس تبریز عام انسانوں کی مانند نہیں۔ جب تک انہوں نے قلندری زندگی اختیار کیے رکھی، اس وقت تک تو سب ٹھیک تھا، لیکن اگر وہ کسی شہر میں رہتے اور شہر کے باسیوں سے گھلتے ملتے ہیں تو مجھے خدشہ ہے کہ وہ کچھ ایسا کریں گے کہ عام لوگ ان سے خفا اور برہم ہوں۔ یہی سبب تھا کہ میں نے ان کے سفر کو ملتوی کرنے کی جتنی ہو سکی، کوشش کی۔

ان کی روانگی سے ایک روز قبل، شمس تبریز میرے ہمراہ شہتوت کے درختوں کے جھنڈ میں شام کی سیر کو نکل گئے جہاں میں نے ریشم کے کیڑے پال رکھے ہیں۔ کہتے ہیں، کچھ پختہ عادتیں کبھی نہیں بدلتیں۔ جذبۂ محبت بھی ریشم کی مانند ہے، تکلیف دہ حد تک نازک اور حیرت انگیز حد تک مضبوط۔ میں نے تبھی شمس تبریز کو بتایا کہ کیسے ریشم کا کیڑا اپنے کوئے سے باہر آتے ہوئے اسی ریشم کو برباد کر دیتا ہے، جسے وہ تیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کاشت کار کو ریشم کے کیڑے یا ریشم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ بیشتر اوقات وہ ریشم کو بچانے کے لیے کوئے میں موجود ریشم کے کیڑے کو مار دیتے ہیں۔ ایک ریشمی رومال بنانے میں ریشم کے ہزاروں کیڑوں کی زندگیاں صرف ہوتی ہیں۔

شام ڈھل رہی تھی۔ خنک ہوا چلنے لگی اور میں کپکپا گیا۔ بڑھاپے میں سردی کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے، لیکن میں آگاہ تھا کہ میں سردی کے باعث نہیں کپکپایا تھا۔ سبب یہ تھا کہ مجھے ادراک ہو گیا کہ وہ آخری مرتبہ تھی کہ شمس تبریز میرے باغ میں کھڑے ہوتے۔ ہم دوبارہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملیں گے۔ اس دنیا میں تو نہیں۔ شمس تبریز بھی اس حقیقت کو محسوس کر چکے تھے کیوں کہ ان کی آنکھوں میں اب افسردگی تھی۔

اگلے روز پَو پھٹتے ہی شمس تبریز میری دست بوسی کے لیے آئے اور مجھ سے دعا چاہی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے اپنے لمبے سیاہ بال اور ریش مونڈھ لی تھی، اس کا سبب انہوں نے بتایا نہ ہی میں نے پوچھا۔ روانگی سے قبل شمس تبریز نے کہا کہ اس داستان میں ان کا کردار ریشم کے کیڑے سے مشابہ تھا۔ وہ اور رومی عشقِ حقیقی کے خول میں بند ہوں گے، اور جب وقت مکمل ہو جائے گا اور ریشم بُنا جائے گا، تبھی باہر آئیں گے۔ لیکن انجام کار ریشم کو باقی رہنا تھا اور ریشم کے کیڑے کو فنا ہو جانا تھا۔

یوں وہ قونیہ روانہ ہوئے۔ اللہ اس کا حامی و ناصر ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے درست قدم اٹھایا اور آپ نے بھی، لیکن میرا دل اداسی سے بوجھل ہے اور میں اس انتہائی غیر معمولی اور غیر مطیع درویش کی کمی ابھی سے محسوس کر رہا ہوں، جس کا کبھی میری خانقاہ نے خیر مقدم کیا تھا۔

انجام کار، ہم اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اللہ آپ کی کفایت فرمائے۔

بابا زمان

نومرید

بغداد، 29 ستمبر 1243ء

بلاشبہ درویشی آسان نہیں۔ ہر کسی نے مجھے اس سے متنبہ کیا تھا۔ یہ تذکرہ کرنا مگر وہ بھول گئے کہ درویش بننے کے لیے مجھے کسی جہنم سے گزرنا ہوگا۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں، کسی کتے کی طرح کام کر رہا ہوں۔ دن کا بیشتر وقت تو میں اتنی سخت محنت کرتا ہوں کہ جب آخرکار سونے کے لیے چٹائی پر لیٹتا ہوں تو اپنے عضلات میں ہوتے درد اور پیروں میں اٹھتی تھرتھراہٹ کے باعث سو نہیں پاتا۔ مجھے حیرت ہے کہ کیا کبھی کسی نے توجہ بھی کی کہ مجھ سے کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اگر ان کی توجہ میں یہ بات آتی ہے بھی تو وہ یقیناً ہمدردی ظاہر نہیں کرتے۔ اور میں جس قدر شدت سے تگ و دو کرتا ہوں، یہ اُسی قدر بدتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ میرا نام تک نہیں جانتے۔ "نومرید" وہ مجھے پکارتے ہیں اور میری پیٹھ پیچھے سرگوشیوں میں "وہ سنہری بالوں والا نادان۔"

اب تک بدترین ہے، باورچی خانے میں باورچی کی نگرانی میں کام کرنا۔ اس آدمی کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ وہ کسی خانقاہ میں باورچی کی بجائے منگول فوج میں خون کا پیاسا فوجی سالار ہو سکتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ اُس نے کبھی کسی سے کوئی اچھی بات کی ہو۔ مجھے یہ بھی نہیں لگتا کہ وہ مسکرانا بھی جانتا ہے۔

ایک بار میں نے ایک مقدم درویش سے پوچھا کہ کیا سب نوآموز شاگردوں کو باورچی خانے میں باورچی کے ساتھ کام کرنے کی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ پُراسرار انداز میں مسکرایا اور جواب دیا: "سب کو تو نہیں، صرف چند ایک کو۔"

پھر میں ہی کیوں؟ شیخ یہ کیوں چاہتے تھے کہ میں دوسرے مریدوں کی نسبت زیادہ تکلیف سے گزروں؟ کیا اس لیے کہ میرا نفس اُن سے زیادہ سرکش ہے اور اسے نظم و ضبط سیکھنے کے لیے زیادہ سخت برتاؤ کی ضرورت ہے؟

ہر روز میں سب سے پہلے بیدار ہوتا ہوں تاکہ قریبی کھاڑی سے پانی بھر کر لا سکوں۔ پھر میں

چولہا جلاتا ہوں اور جل کی چپٹی روٹیاں پکاتا ہوں۔ ناشتے میں دیئے جانے والے شوربے کی تیاری بھی میری ہی ذمےداری ہے۔ پچاس لوگوں کا کھانا پکانا آسان نہیں۔ سب کچھ بڑی بڑی دیگوں میں پکتا ہے۔ جو نہانے کے ناند سے چھوٹی نہیں ہوتیں۔ اور اندازہ کریں کہ انہیں بعد میں مانجھ کر صاف کون کرتا ہے؟ صبح پو پھٹنے سے لے کر شام کا دھندلکا پھیلنے تک میں فرشوں پر پچارا لگاتا ہوں، صفائی کرتا ہوں، سیڑھیاں پونچھتا ہوں، صحن میں جھاڑو لگاتا ہوں، لکڑی کاٹتا ہوں اور گھٹنوں اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل پر بیٹھے فرش کے پرانے چرچراتے تختے مانجھ رگڑ کا صاف کرتا ہوں۔ میں مربے اور مصالحے دار مزے دار کھانے تیار کرتا ہوں۔ میں گاجروں کا اچار ڈالتا ہوں، یہ دیکھتے کہ ان میں اتنا نمک ضرور ہو کہ اس میں انڈا تیر سکے۔ اگر میں نمک زیادہ یا کم ڈال دوں تو باورچی کو دورہ پڑ جاتا ہے اور وہ سارے مرتبان توڑ ڈالتا ہے اور پھر مجھے سب کچھ نئے سرے سے تیار کرنا پڑتا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ مجھ سے توقع رکھی جاتی ہے کہ ہر کام سرانجام دیتے ہوئے میں عربی میں دعاؤں کا ورد کیے جاؤں۔ باورچی چاہتا ہے کہ میں اونچی آواز میں پڑھوں تاکہ وہ جانچ سکے کہ میں بیچ میں کہیں کچھ چھوڑتا یا غلط تلفظ سے ادائیگی تو نہیں کرتا۔ سو میں عبادت کرتا اور کام کرتا ہوں، کام کرتا اور عبادت کرتا ہوں۔ ''باورچی خانے میں تم جتنی مشقت سہو گے بیٹے، اتنی جلدی ہی تم بڑے اور سمجھ دار ہو گے۔'' میرا اذیت رساں دعوی کرتا ہے۔ ''جب تم کھانا پکانا سیکھ رہے ہو گے، تمہاری روح میں اُبال آئے گا۔''

''لیکن یہ آزمائش کب تک جاری رہے گی؟'' ایک مرتبہ میں نے پوچھا۔

''ایک ہزار ایک دن۔'' اُس کا جواب تھا، ''اگر داستان گو شہرزاد اتنے عرصے تک ہر شب ایک نئی کہانی سنا سکتی تھی تو تم بھی یہ جھیل لو گے۔''

یہ پاگل پن ہے! کیا میں کسی بھی طرح اُس باتونی شہرزاد سے مشابہت رکھتا ہوں؟ اس کے ساتھ ساتھ، اُسے تو بس مخملیں تکیوں سے ٹیک لگا کر بے کار بیٹھنا اور رنگ برنگی کہانیاں گھڑنا تھیں جس دوران وہ ظالم شہزادے کو میٹھے انگوروں اور اپنے تخیل سے گھڑی داستانوں پر پالتی۔ مجھے اس میں کوئی محنت دکھائی نہیں دیتی۔ اگر اُس کو وہ کام کرنے کا کہا جاتا جو میں کرتا ہوں تو وہ تو ایک ہفتہ بھی زندہ نہ رہ پاتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اور کوئی گنتی کر رہا ہے یا نہیں۔ مگر میں یقیناً کر رہا ہوں شمار۔ اور میرے ابھی 624 دن باقی ہیں مزید۔

اپنی آزمائش کے پہلے چالیس روز میں نے ایک اتنی چھوٹی اور نیچی چھت والی کوٹھڑی میں گزارے کہ میں لیٹ سکتا تھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا اور مجھے سارا وقت اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھنا پڑتا تھا۔ اگر مجھے ڈھنگ کے کھانے یا کسی آرام کی چاہ ہوتی، میں تاریکی یا تنہائی سے خوف زدہ ہوتا یا خدانہ کرے مجھے کسی عورت کے متعلق کوئی بہکاتا خواب آتا تو مجھے روحانی مدد کے لیے چھت سے لٹکتی نقرئی گھنٹیوں کو بجانے کا حکم

تھا۔ میں نے کبھی گھنٹی نہ بجائی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے کبھی کوئی بھٹکانے والا خیال نہ آیا تھا۔ لیکن کچھ بھٹکتے خیال آنے میں کیا برائی ہے جب آپ ہل بھی نہ سکتے ہوں؟

گوشہ نشینی کا یہ وقت گزرنے پر مجھے باورچی کے ہاتھوں تکلیف اٹھانے کو باورچی خانے میں بھیج دیا گیا۔ اور تکلیف میں نے خوب اٹھائی۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ میں اُس کی طرف چاہے تلخ بھی تھا مگر میں نے باورچی کے اصول کبھی نہیں توڑے... یعنی اُس شام سے پہلے تک جب شمس تبریز کی آمد ہوئی۔ اُس رات جب بالآخر باورچی نے مجھے آ پکڑا تو اُس نے میری زندگی کی بدترین پٹائی کی، ایک کے بعد ایک بید مجنوں کی چھڑیاں اُس نے میری کمر پر توڑ دیں۔ پھر اُس نے میرے جوتے دروازے کے سامنے یوں رکھ دیئے کہ اُن کا رخ باہر کی جانب تھا، یہ واضح کرنے کو کہ وہ میرے جانے کا وقت تھا۔ درویشی خانقاہ میں، وہ کبھی بھی آپ کو باہر نکالتے ہیں نہ ہی کھل کر یہ بتاتے ہیں کہ آپ ناکام ہو چکے ہیں، اس کی بجائے وہ آپ کو خاموشی سے رخصت کر دیتے ہیں۔

''ہم تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں درویش نہیں بنا سکتے۔'' باورچی نے اعلان کیا۔ ''کوئی آدمی گدھے کو پانی تک لا سکتا ہے مگر اُسے پانی پینے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ گدھے میں خود پیاس ہونی چاہیے۔ اور کوئی راہ نہیں ہے۔''

یقیناً اس میں گدھا میں ہی تھا۔ صاف گوئی سے کہوں تو اگر شمس تبریز نہ ہوتے تو میں یہ جگہ عرصہ پہلے ہی چھوڑ چکا ہوتا۔ اُن کے متعلق میرے تجسس نے مجھے یہاں روکے رکھا۔ میں پہلے کبھی اُن جیسے کسی شخص سے نہ ملا تھا۔ انہیں کسی کا ڈر تھا نہ وہ کسی کی اطاعت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ باورچی بھی ان کی عزت کرتا تھا۔ اگر اس خانقاہ میں کوئی میرے لیے مثالی نمونہ تھا تو وہ اپنے سحر، وقار اور سرکشی کے سبب شمس تبریز تھے۔ منکسر المزاج بوڑھے شیخ نہیں۔

ہاں شمس تبریز ہی میرے مجمع سورما تھے۔ ان سے ملنے کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا کہ میں کوئی مسکین سا درویش نہیں بنوں گا۔ اگر میں ان کے ساتھ کافی وقت گزارتا تو میں اُن ہی کی طرح نڈر، ثابت قدم اور باغی بن سکوں گا۔ سو جب موسم خزاں آیا اور مجھے معلوم ہوا کہ شمس تبریز جا رہے تھے، میں نے اُن کے ہمراہ جانے کا فیصلہ کیا۔

اپنا فیصلہ کر چکنے کے بعد میں بابا زمان سے ملنے گیا اور انہیں چراغ کی روشنی میں بیٹھے ایک پرانی کتاب پڑھتے پایا۔

''تم کیا چاہتے ہو لڑکے؟'' انہوں نے یوں بیزاری سے پوچھا، جیسے محض مجھے دیکھتے ہی وہ اکتا گئے تھے۔

میں جتنا منہ پھٹ ہو سکتا تھا، اُس سے، میں نے کہا، ''مجھے معلوم ہے کہ شمس تبریز جلد ہی یہاں سے جا رہے ہیں آفندی۔ میں ان کے ہمراہ جانا چاہتا ہوں۔ انہیں راستے میں کسی کی رفاقت کی ضرورت

ہو سکتی ہے۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اُن کی اتنی پرواہ کرتے ہو۔'' شیخ نے شک و شبے کے عالم میں کہا، ''یا ایسا اس لیے ہے کہ تم باورچی خانے کی اپنی ذمے داریوں سے گریز چاہتے ہو؟ تمہارا امتحان ابھی ختم نہیں ہوا۔ تمہیں ابھی بہ مشکل ہی درویش کہا جا سکتا ہے۔''

''شاید شمس تبریز جیسے کسی شخص کے ساتھ سفر پر جانا میرا امتحان ہو۔'' یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا کہنا خاصی بے باکی اور گستاخی تھی، مگر پھر بھی میں نے کہہ دیا۔

آفندی نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور غور و فکر کرنے لگے۔ ان کی خاموشی جتنی بڑھتی رہی، اتنا ہی میں قائل ہو گیا کہ وہ میری بے ادبی پر مجھے سرزنش کریں گے اور باورچی کو بلا کر اُسے مجھ پر نظر رکھنے کا کہیں گے۔ لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہ کیا۔ اس کی بجائے انہوں نے ناامیدی سے میری طرف دیکھا اور سر ہلا دیا۔

''شاید تم خانقاہ کی زندگی کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے، میرے بیٹے۔ آخرکار ہر سات مریدوں میں سے جو اس راستے پر روانہ ہوتے ہیں، صرف کوئی ایک ہی آگے جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم درویش بننے کے لیے موزوں نہیں ہو اور تمہیں اپنی قسمت کہیں اور تلاش کرنی چاہیے۔ جہاں تک شمس تبریز کے سفر میں اُن کا ساتھ دینے کی بات ہے، اس بارے میں تمہیں اُن ہی سے پوچھنا پڑے گا۔''

یوں مجھے گویا اطلاع دے کر بابا زمان نے اپنے سر کے دوستانہ مگر فیصلہ کن اشارے سے وہ باب بند کر دیا اور دوبارہ اپنی کتاب کا مطالعہ کرنے لگے۔

مجھے اداسی محسوس ہوئی اور اپنا آپ بہت چھوٹا مگر عجیب طور پر آزاد لگا۔

شمس

بغداد، 30 ستمبر 1243ء

برسرِ پیکار ہواؤں سے، میں اور میرا گھوڑا اگلے روز پو پھٹتے ہی روانہ ہو گئے۔ میں صرف ایک بار پلٹ کر دیکھنے کو رکا۔ شہتوت کے درختوں اور جھاڑیوں میں چھپی درویش خانقاہ کسی پرندے کے گھونسلے سے مشابہ دکھائی دی۔ ذرا دیر کو میرے ذہن کے پردے پر بابا زمان کا متفکر چہرہ جھلملایا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے بارے میں فکر مند تھے۔ لیکن مجھے اس کی کوئی ٹھوس وجہ دکھائی نہ دی۔ میں محبت کے باطنی سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ اس سے کیا نقصان ہو سکتا تھا؟ یہ میرا دسواں اصول تھا: ''مشرق، مغرب، شمال، جنوب سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری منزل جو کوئی بھی ہو، بس یہ یقین دہانی حاصل کرو کہ ہر سفر، باطن کا سفر ہو۔ اگر تم باطن میں سفر کرو تو تم پوری دنیا اور مافیہا کا سفر کر لو گے۔''

اگرچہ مجھے آگے مشکلات کے آنے کی توقع تھی مگر مجھے اس کی فکر یا پرواہ نہ تھی۔ قونیہ میں میرا جو بھی مقدر منتظر تھا، میں نے اُس کا خیر مقدم کیا۔ ایک صوفی کے طور پر مجھے گلاب کے ساتھ خار کو قبول کرنے کی تربیت حاصل تھی، زندگی کے حُسن کے ساتھ اس کی مشکلات کو قبول کرنے کی تربیت۔ چنانچہ اگلا اصول تھا: ''دایہ جانتی ہے کہ درد زہ نہ ہو تو ماں بچے کو جنم نہیں دے سکتی۔ اسی طرح ایک نئی ''ذات یا شخصیت'' کے جنم کے لیے صعوبت اٹھانی ضروری ہے۔ جس طرح چکنی مٹی کو پختہ ہونے کے لیے شدید حدت سے گزرنا پڑتا ہے، محبت بھی درد و تکلیف کے بغیر کامل نہیں ہو سکتی۔''

☼

خانقاہ سے رخصت ہونے سے ایک رات قبل میں نے اپنے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں تاکہ تاریکی کی آوازیں اور مہک بہ کر اندر آ جائیں۔ شمع کی ٹمٹماتی روشنی میں میں نے اپنے لمبے بال تراش لیے۔ ان کی گھنی لٹیں فرش پر گر گئیں۔ پھر میں نے اپنی ڈاڑھی مونچھیں مونڈ لیں اور بھنوؤں سے بھی چھٹکارا پالیا۔ یہ کر چکنے کے بعد میں نے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا، جو اَب زیادہ روشن اور نوجوان تھا۔

ایک بھی بال کے بغیر میرا چہرہ اب نام، عمر اور صنف سے پاک تھا۔ اس کا کوئی ماضی تھا نہ مستقبل، اس لیے میں دائمی طور پر سربہ مہر۔

''تمہارا سفر تمہیں پہلے ہی تبدیل کر رہا ہے۔'' جب میں شیخ کے کمرے میں انہیں الوداع کہنے گیا تو وہ بولے، ''اور ابھی یہ شروع ہوا بھی نہیں۔''

''جی ہاں، مجھے ادراک ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا، ''یہ بھی چالیس اصولوں میں سے ایک ہے: محبت کی جستجو ہمیں بدل دیتی ہے۔ محبت کی جستجو کرنے والوں میں ایسا کوئی طالب یا جویا نہیں جو راہِ عشق میں کندن نہ بنا ہو۔ جس لمحے آپ محبت کی جستجو کا آغاز کرتے ہیں، آپ کا ظاہر اور باطن بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔''

ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بابا زمان نے ایک مخملیں ڈبیا نکالی اور میرے حوالے کر دی۔ اس کے اندر مجھے تین چیزیں ملیں: ایک نقرئی آئینہ، ریشمی رومال اور کسی مرہم کی شیشی۔

''یہ چیزیں سفر میں تمہاری مدد کریں گی۔ جب ضرورت ہو تو انہیں استعمال کر لینا۔ اگر کبھی تم اپنی ذات کے افتخار سے محروم ہوئے تو یہ آئینہ تمہیں اپنے باطن کا حُسن دکھائے گا۔ اگر تمہاری شہرت داغ دار ہوئی تو یہ رومال تمہیں یاد دلائے گا کہ تمہارا دل کس قدر خالص ہے۔ اور جہاں تک مرہم کی بات ہے، یہ تمہارے زخموں کو شفا دے گا، ظاہری اور باطنی دونوں زخموں کو۔''

میں نے ہر شے کو سہلایا، ڈبیا بند کی اور بابا زمان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر کہنے کو کچھ باقی نہ رہا تھا۔

جب پرندے چہکنا شروع ہوئے اور صبح کی اوّلین کرنوں میں شاخوں پر شبنم کے قطرے جھلملائے تو میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ یہ جانے بغیر کہ کیا توقع رکھوں مگر اُس مقدر پر بھروسا رکھتے ہوئے جو خدائے بزرگ و برتر نے میرے لیے تیار کر رکھا تھا، میں نے قونیہ کی طرف سفر کا آغاز کیا۔

نومرید

بغداد، 30 ستمبر 1243ء

بغداد سے روانہ شمس تبریز کے پیچھے مَیں اپنے چوری شدہ گھوڑے پر سوار تعاقب میں تھا۔ میں نے ان کے اور اپنے درمیان محفوظ فاصلہ رکھنے کی سخت کوشش کی مگر جلد ہی خود کو ظاہر کیے بغیر اُن کا پیچھا کرنا ناممکن ثابت ہوگیا۔ جب شمس تبریز تازہ دم ہونے اور زادِ راہ خریدنے بغداد کے بازار میں رکے تو میں نے سامنے آنے کا فیصلہ کیا اور ان کے گھوڑے کے آگے آ گرا۔

''سرخی مائل زرد رنگ بالوں والے نادان، تم زمین پر پڑے کیا کر رہے ہو؟'' گھوڑے پر سوار شمس تبریز، نیم خوش اور نیم حیران بے ساختہ بولے۔

میں گھٹنوں کے بل جھکا، اپنے ہاتھ جوڑے اور گردن جھکالی، جیسا میں نے گداگروں کو کرتے دیکھا تھا اور التجا کی، ''میں آپ کا رفیقِ سفر بننا چاہتا ہوں۔ برائے مہربانی مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔''

''تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟''

میں رکا۔ اس سوال کا مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ ''نہیں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں آپ کا مرید بننا چاہتا ہوں۔ میرے لیے آپ قابلِ تقلید مثال ہیں۔''

''میں ہمیشہ تنہا سفر کرتا ہوں اور مجھے کوئی مرید یا طالب علم نہیں چاہئیں۔ تمہارا شکریہ! اور میں یقیناً کسی کے لیے کوئی قابلِ تقلید مثال نہیں، کجا کہ تمہارے لیے۔'' شمس تبریز نے کہا، ''سو اپنا راستہ لو۔ لیکن اگر پھر بھی تم مستقبل میں کسی مرشد کی تلاش کرو گے تو اپنے دماغ میں ایک سنہری اصول رکھنا،'' اس ظاہر کائنات میں آسمان پر اتنے ستارے نہیں ہوں گے جتنے زمین پر جعلی گرو اور جھوٹے مرشد پائے جاتے ہیں۔ طاقت کے رسیا اور مطلب پرست لوگوں کو بھی سچے مرشد سے مت الجھانا۔ ایک حقیقی روحانی رہنما تمہاری توجہ اپنی ذات پر مرکوز نہیں کرے گا اور تم سے مطلق فرمانبرداری اور تعریف و تحسین کا تقاضا نہ کرے گا بلکہ اس کی بجائے وہ تمہیں تمہارے باطن کو پہچاننے اور اس کی تحسین میں تمہاری مدد کرے گا۔ سچے مرشد کسی شیشے کی طرح

شفاف ہوتے ہیں۔ وہ نورِ خداوندی کو خود میں سے چھن کر گزرنے دیتے ہیں۔''

''برائے مہربانی مجھے ایک موقع دیں۔'' میں نے التجا کی، ''تمام مشہور سیاحوں یا مسافروں کے ساتھ کوئی معاونت کے لیے ضرور ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاگرد یا کوئی بھی۔''

شمس تبریز نے متفکر انداز میں اپنی تھوڑی کھجائی، یوں جیسے وہ میرے الفاظ کی سچائی کا اعتراف کر رہے ہوں۔ ''کیا تم میں میری صحبت برداشت کرنے کی سکت ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

میں اچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور پورے دل سے اپنا سر ہلایا۔ ''مجھ میں بالکل ہے، اور میری طاقت میرے اندر سے اٹھتی ہے۔''

''بہت خوب پھر۔ تو تمہاری پہلی ذمہ داری یہ ہے: میں چاہتا ہوں کہ تم قریب ترین مے خانے میں جاؤ اور اپنے لیے مے سرخ کی صراحی خرید لاؤ۔ تم اسے یہیں بیچ بازار پیو گے۔''

اب، میں تو اپنی پوشاک سے فرش رگڑ کر صاف کرنے، برتنوں کو اس وقت تک چمکانے کا عادی تھا، یہاں تک کہ وہ نفیس وینسی جام کی طرح جھلملانے لگتے جو میں نے اُن ہنرمندوں کے ہاتھوں میں دیکھے تھے جو عرصہ پہلے قسطنطنیہ سے فرار ہوئے تھے جب صلیبیوں نے اُس شہر میں غارت گری کی تھی۔ میں ایک وقت میں سو پیاز کاٹ سکتا تھا یا لہسن کی سو گانٹھیں چھیل اور پیس سکتا تھا، سب روحانی ترقی کے نام پر۔ لیکن پُرہجوم بازار میں شراب پینا، اس حد تک جانا تو میرے دائرۂ ادراک سے باہر تھا۔ میں نے دہشت کے عالم میں انہیں دیکھا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر میرے باپ کو معلوم ہو گیا تو وہ میری ٹانگیں توڑ دیں گے۔ انہوں نے مجھے خانقاہ ایک بہتر مسلمان بننے کے لیے بھیجا تھا، بے دین بننے کے لیے نہیں۔ میرا خاندان اور میرے دوست میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟''

مجھے شمس تبریز کی جلتی نگاہ خود پر جمی محسوس ہوئی اور اس نگاہ کے دباؤ تلے میں کپکپا کر رہ گیا، بالکل اُس دن کی طرح جب میں نے بند دروازوں کے پیچھے سے اُن کی جاسوسی کی تھی۔

''تم نے دیکھا، تم میرے مرید نہیں بن سکتے۔'' انہوں نے پورے یقین کے ساتھ گویا حتمی فیصلہ صادر کیا۔ ''تم میرے مقابلے میں بے حد بزدل ہو۔ تمہیں اس بات کی بہت پرواہ ہے کہ لوگ کیا سوچتے ہیں۔ لیکن کیا تم جانتے ہو؟ چوں کہ تم دوسروں کی پسندیدگی حاصل کرنے کے لیے بہت جان توڑ کوشش کرتے ہو، تم ان کی تنقید سے کبھی چھٹکارا حاصل نہ کر پاؤ گے، چاہے تم کتنی ہی مشقت کر و۔''

مجھے ادراک ہوا کہ میرا اُن کی صحبت میں چلنے کا موقع ہاتھوں سے پھسل رہا تھا اور میں نے اپنے دفاع میں عجلت کی۔ ''میں کیسے جان سکتا تھا کہ آپ یہ مطالبہ بلا مقصد نہیں کر رہے؟ شراب اسلام میں ممنوع اور حرام ہے۔ میں سمجھا آپ میرا امتحان لے رہے ہیں۔''

''لیکن یہ تو گویا خدا کی طرح حکم صادر کرنا ہوتا۔ ایک دوسرے پر فیصلہ سنانا اور ایک دوسرے

کی پارسائی کو ناپنا ہمارا کام نہیں۔" شمس تبریز نے جواب دیا۔

میں نے نا امیدی کے عالم میں ارد گرد دیکھا۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ ان کے الفاظ سے میں کیا مطلب اخذ کروں، میرا دماغ کسی ابلتے حلوے کی مانند تھا۔

شمس تبریز نے بات جاری رکھی: "تم کہتے ہو کہ تم اس راہ کے مسافر بننا چاہتے ہو لیکن اس کے لیے تم کوئی قربانی نہیں دینا چاہتے۔ پیسہ، شہرت، طاقت، افراط یا نفسانی خوشی... کسی کو زندگی میں جو شے بھی سب سے پیاری ہو، اُسے وہی سب سے پہلے ختم کرنی چاہیے۔"

اپنے گھوڑے کو تھپکی دیتے ہوئے شمس تبریز نے حتمی انداز میں بات ختم کی۔ "میرا خیال ہے تمہیں اپنے خاندان کے ساتھ بغداد میں ٹھہرنا چاہیے۔ کوئی ایماندار تاجر ڈھونڈو اور اُس کے شاگرد بن جاؤ۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کسی روز تم ایک اچھے تاجر بن جاؤ گے۔ لیکن حریص مت بننا! اب تمہاری اجازت سے، مجھے جانا ہوگا۔"

اس کے ساتھ انہوں نے ایک آخری بار مجھے سلام کیا، گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ اپنے سموں تلے پھسلتی ہوئی دنیا پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ میں اپنے گھوڑے پر کود کر چڑھا اور بغداد کے مضافات تک اُن کا پیچھا کیا مگر پھر ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ دُور فاصلے پر کسی سیاہ نقطے کی صورت بھی دکھائی نہ دیئے۔ افق پر اُس سیاہ نقطے کے اوجھل ہونے کے بہت دیر بعد تک بھی میں خود پر شمس تبریز کی نگاہوں کا بوجھ محسوس کر سکتا تھا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 24 مئی 2008ء

ناشتہ دن بھر کا سب سے اہم کھانا ہے۔ اس قول پر یقین رکھنے والی عورت کی حیثیت سے ایلا ہفتے کے معمول کے دنوں اور چھٹی کے روز بھی ایک ہی طرح سے روز صبح اٹھ کر کچن کی راہ لیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک اچھا ناشتہ باقی دن کے مزاج کو طے کرتا تھا۔ اس نے وومن میگزینوں میں پڑھا تھا کہ وہ خاندان جو پابندی سے مل بیٹھ کر مناسب ناشتہ کرتے ہیں، اُن کی نسبت زیادہ باہم پیوست اور ہم آہنگ ہوتے ہیں جن میں خاندان کا ہر فرد صبح عجلت میں نیم بھوک کے عالم میں گھر سے نکل پڑتا ہے۔ اور اگرچہ اُسے اس تحقیق پر پکا یقین تھا، پھر بھی ابھی اُسے خوشیوں بھرے کسی ناشتے کا تجربہ نہ ہوا تھا جن کے بارے میں میگزین لکھتے تھے۔ ناشتے کا اُس کا تجربہ کہکشاؤں کا تصادم تھا جہاں اس کے خاندان کا ہر فرد کسی مختلف ڈھول کی دھن پر مارچ کرتا تھا۔ ہر کوئی ناشتے میں دوسرے سے مختلف چیز کھانا چاہتا تھا، جو ایلا کے مل کر ناشتہ کرنے کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ میز پر یگانگت یا اتفاق کیسے ہو سکتا تھا جب ایک ٹوسٹڈ بریڈ اور جم کتر رہی ہوتی (جینیٹ) جب کہ دوسرا چیز چیز شہد والا سیریل کھا رہا ہوتا (ایوی) اور تیسرا صبر سے انکار کر رہا ہوتا کہ اُسے Scrambled انڈے پیش کیے جائیں گے (ڈیوڈ) اور چوتھی کچھ بھی کھانے سے سرے سے انکار ہی کر دیتی (اورلی)؟ پھر بھی، ناشتہ اہم تھا۔ ہر صبح وہ اسے تیار کرتی، اس بات پر پُرعزم کہ اُس کا کوئی بچہ کینڈی یا کوئی اور جنک فوڈ چباتے ہوئے دن کا آغاز نہ کرے۔

لیکن اُس صبح جب وہ کچن میں داخل ہوئی تو کافی تیار کرنے، نارنجی نچوڑنے یا بریڈ سینکنے کی بجائے پہلا کام ایلا نے یہ کیا کہ کچن کی میز پر بیٹھ کر لیپ ٹاپ کھول لیا۔ اس نے انٹرنیٹ لاگ آن کیا تاکہ دیکھ سکے کہ عزیز کی ای میل آئی تھی یا نہیں۔ اُسے خوشی ہوئی کہ ای میل موجود تھی۔

ڈیئر ایلا،

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تم اور تمہاری بیٹی کے درمیان معاملات میں بہتری آگئی

ہے۔جہاں تک میری بات ہے میں کل صبح سویرے موستے نانگو گاؤں سے نکل کھڑا ہوا تھا۔عجیب بات ہے کہ میں وہاں صرف چند روز رکا اور پھر بھی جب الوداع کہنے کا وقت آیا تو میں نے اداسی بلکہ تقریباً رنج محسوس کیا۔کیا میں دوبارہ کبھی کوئٹے مالا کا یہ چھوٹا سا گاؤں دیکھ پاؤں گا؟ میرا نہیں خیال۔

ہر بار جب میں اپنی پسندیدہ جگہ کو الوداع کہتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے وجود کا ایک حصہ پیچھے ہی چھوڑے جا رہا ہوں۔میرا اندازہ ہے کہ ہم نے چاہے مارکو پولو کی طرح خوب سفر کیا ہو یا پھر گہوارے سے لے کر قبر تک ایک ہی جگہ مقیم رہے ہوں، زندگی پیدائش اور موت کا ایک سلسلہ ہے۔لمحے جنم لیتے ہیں اور لمحے فنا ہو جاتے ہیں۔نئے تجربات کے سامنے آنے کے لیے پرانے تجربات کو مرجھانا پڑتا ہے۔تمہارا ایسا خیال نہیں؟

موستے نانگو میں مَیں نے مراقبہ کر کے تمہاری شخصیت کے گرد ہالے کے رنگوں کا تصور کرنے کی کوشش کی۔زیادہ دیر نہ گزری کہ میرے سامنے تین رنگ نمودار ہوئے: پُرشوق زرد، کمزور نارنجی اور محتاط سادھاتی ارغوانی۔مجھے محسوس ہوا کہ یہ تمہارے رنگ تھے۔مجھے لگا کہ وہ الگ الگ اور مل کر بھی دونوں طرح خوب صورت تھے۔

کوئٹے مالا میں میری آخری منزل چاجل (Chajul) ہے... کچی اینٹوں کے گھروں اور اپنی عمر سے بڑی سمجھ دار آنکھوں والے بچوں کا ایک چھوٹا سا قصبہ۔ہر گھر میں ہر عمر کی عورتیں شاندار رنگ کاریاں اور غالیچے بناتی ہیں۔میں نے ایک بوڑھی دادی اماں سے ایک غالیچہ منتخب کرنے کا کہا اور بتایا کہ وہ نارتھمپٹن میں رہنے والی ایک خاتون کے لیے تحفہ ہے۔کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنے پیچھے موجود بڑے سے ڈھیر سے ایک غالیچہ نکالا۔خدا کی قسم، اُس ڈھیر میں ہر ممکنہ رنگ کے پچاس سے زائد غالیچے تھے۔پھر بھی اس نے جو منتخب کیا وہ صرف تین رنگوں کے ڈیزائن پر مشتمل تھا: زرد، نارنجی اور ارغوانی۔ مجھے خیال ہوا کہ تم اس اتفاق کے بارے میں جاننا پسند کرو گی، اگر اتفاق نام کی کوئی شے خدا کی کائنات میں موجود ہے تو۔

کیا تمہیں کبھی یہ خیال آیا کہ ہمارا خطوط کا یہ تبادلہ ہو سکتا ہے کسی اتفاق کا نتیجہ نہ ہو؟

مخلص

عوزئے

پس تحریر: اگر تم چاہو تو میں یہ غالیچہ تمہیں ڈاک کے ذریعے بھجوا دوں یا میں اُس روز کا انتظار کر سکتا ہوں کہ جب ہم کافی پینے کے لیے ملیں اور میں اسے خود لے کر آؤں۔

ایلا نے اپنی آنکھیں بند کیں اور تصور کرنے کی کوشش کی کہ اُس کی شخصیت کے ہالے کے رنگ اُس کے چہرے کا کیسے احاطہ کیے ہوئے تھے۔دلچسپ طور پر اُس کی ذات کا جو تصور اس کے ذہن کے پردے پر منعکس ہوا، وہ کسی بالغ شخصیت کا نہیں بلکہ ایک بچی کا تھا، تقریباً سات برس عمر کی۔

بہت سی باتیں ایک دم اس کے دماغ میں کسی سیلاب کی طرح امڈ پڑیں، یادیں جو اُس کا خیال تھا وہ عرصہ ہوا پہلے چھوڑ آئی تھی۔ اپنی کمر میں پستئی رنگ کا ایپرن باندھے اور ہاتھ میں پیمائش کا کپ لیے ساکت کھڑی اُس کی ماں کا تصور، اُس کے چہرے پر تکلیف کا سفید راکھ سا نقاب، دیواروں سے لٹکتے شوخ رنگوں کے چمکتے کاغذ سے کاٹ کر بنائے گئے دل، اور چھت سے لٹکتا اُس کے باپ کا جسم یوں جیسے وہ کرسمس کی آرائش میں مکمل مل جانا اور گھر کو ایک پُرمسرت تہوار کا تاثر دینا چاہتے تھے۔ اُسے یاد آیا کہ کیسے اُس نے اپنی نوعمری کے برس اپنی ماں کو اپنے باپ کی خودکشی کا ذمہ دار سمجھتے گزارے تھے۔ اپنی نوجوانی میں ایلا نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ جب اس کی شادی ہوگی تو وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ خوش رکھے گی اور اپنی شادی کو اپنی ماں کی طرح ناکام نہ ہونے دے گی۔ اپنی اس کوشش میں کہ اُس کی شادی شدہ زندگی جس قدر ممکن ہو سکے، اُس کی ماں کی شادی شدہ زندگی سے مختلف ہو، جس نے کسی عیسائی آدمی سے شادی کی تھی، ایلا نے اپنے ہم مذہب سے شادی کو ترجیح دی تھی۔

یہ صرف چند برس پہلے کی بات تھی کہ ایلا نے اپنی بوڑھی ہوتی ماں سے نفرت کرنا چھوڑ دی تھی اور اگرچہ اُن دونوں کے تعلقات بعد میں اچھے ہو گئے تھے، سچ یہ تھا کہ جب کبھی بھی وہ ماضی کو یاد کرتی تو اُسے اپنے اندر گہرائی میں کہیں تکلیف محسوس ہوتی تھی۔

''مام!... ارتھ ٹو مام! ارتھ ٹو مام!''

ایلا کو اپنے کندھوں کے پیچھے ہنسی کی پھوہار اور سرگوشیاں سنائی دیں۔ جب وہ مڑی تو اُسے آنکھوں کے چار جوڑے حیرت کے عالم میں خود کو تکتے ملے۔ اورلی، ایوی، جینٹ اور ڈیوڈ، چاروں ایک ساتھ ناشتے کے لیے چلے آئے تھے اور اب ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے اُس کا یوں جائزہ لے رہے تھے جیسے وہ کوئی اجنبی مخلوق تھی۔ جس طرح سے وہ دیکھ رہے تھے، لگتا تھا کہ وہ خاصی دیر سے کھڑے اُس کی توجہ پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''صبح بخیر، تم سب کو۔'' ایلا مسکرا دی۔

''آپ نے کیوں کر ہماری آواز نہیں سنی؟'' اورلی نے واقعی میں حیران ہوتے پوچھا۔

''تم اس سکرین میں بہت محو لگتی تھی۔'' ڈیوڈ نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

ایلا کی نگاہ نے اپنے شوہر کی نگاہوں کا پیچھا کیا اور وہاں اُس کے سامنے سکرین پر اُسے عزیز اے ظہارا کی ای میل دکھائی دی، جو مدھم سی روشن تھی۔ ایک لمحے میں اُس نے شٹ ڈاؤن کا انتظار کیے بغیر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

''مجھے لٹریری ایجنسی کے لیے کافی کچھ پڑھنا ہے۔'' ایلا نے آنکھیں گھماتے کہا، ''میں اپنی رپورٹ پر کام کر رہی تھی۔''

''نہیں، آپ رپورٹ پر کام نہیں کر رہی تھیں۔ آپ ای میلز پڑھ رہی تھیں۔'' ایوی نے

کہا۔اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

ان تین ایج لڑکوں میں ایسا کیا تھا جس نے انہیں دوسرے سب لوگوں کی خامیوں اور جھوٹ کو پکڑنے کا اتنا شوقین بنا دیا تھا؟ ایلا نے سوچا۔لیکن اُسے اطمینان ہوا کہ دوسرے اس موضوع میں لگتا تھا دلچسپی ہی نہیں رکھتے تھے۔درحقیقت ان سب کی توجہ اب کہیں اور مرکوز تھی، ان کی نظریں کچن کاؤنٹر پر تھیں۔

اُن سب کے سوال کو لفظوں میں بیان کرنے کو ایلا کی طرف مڑنے والی اورلی تھی۔"مام، کیسے ہوا کہ آج صبح آپ نے کوئی ناشتہ ہی نہیں بنایا؟"

اب ایلا کاؤنٹر کی طرف مڑی اور اُس نے وہ دیکھا جو سب دیکھ چکے تھے۔کوئی کافی تھی نہ چولہے پر Scrambled انڈے، نہ ہی بلیو بیری ساس کے ساتھ کوئی ٹوسٹ۔اُس نے بار بار سر اوپر نیچے ہلایا، یوں جیسے کسی ناقابل تردید سچائی بیان کرتی کسی اندرونی آواز سے اتفاق کر رہی ہو۔

ٹھیک، اُس نے سوچا، وہ ناشتہ بنانا کیوں کر بھول گئی تھی؟

حصہ دوم

آب

اشیا جو سیال، متغیر اور ناقابل پیش گوئی ہیں



رومی

قونیہ، 15 اکتوبر 1244ء

بے انتہا حسین اور روشن، پورے جوبن پر چاند آسمان سے معلق کسی بڑے سے موتی جیسا دکھائی دیتا تھا۔ میں بستر سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر چاندنی میں نہائے صحن میں جھانکا۔ تاہم ایسے حُسن کے نظارے سے بھی میرے تیزی سے دھڑکتے دل یا میرے ہاتھوں کی لرزش کو کوئی سکون نہ ملا۔

''آفندی، آپ زرد دکھائی دیتے ہیں۔ کیا آپ نے پھر کوئی خواب دیکھا ہے؟'' میری بیوی نے سرگوشی کی، ''کیا میں آپ کو پانی لادوں؟''

میں نے اُسے فکر نہ کرنے اور دوبارہ سوجانے کا کہا۔ وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ ہمارے خواب ہمارے نصیب کا حصہ تھے اور خدا جیسے چاہتا، وہ اپنا راستہ چلتے۔ اس کے ساتھ، میں نے سوچا، کوئی وجہ رہی ہوگی کہ پچھلے چالیس روز سے ہر شب مجھے ایک ہی خواب دکھائی دے رہا تھا۔

خواب کا آغاز ہر مرتبہ ذرا مختلف تھا۔ یا شاید وہ ہمیشہ ایک سا ہی تھا مگر میں ہی ہر شام مختلف دروازے سے داخل ہوتا تھا۔ اس موقع پر میں نے خود کو قالین سے آراستہ ایک ایسے کمرے میں تلاوت قرآن کرتے پایا جو مانوس سا محسوس ہوا لیکن وہ ایسی کسی جگہ جیسا نہیں تھا جہاں میں پہلے جاچکا ہوں۔ میرے بالکل سامنے ایک طویل قامت، دبلا پتلا درویش بیٹھا تھا، اُس کے چہرے پر ایک نقاب تھا۔ وہ ایک شمع دان تھامے ہوا تھا جس میں پانچ شمعیں جل رہی تھیں جس سے مجھے اتنی روشنی مل رہی تھی کہ میں تلاوت کرپاتا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے درویش کو وہ آیت مبارکہ دکھانے کو سر اٹھایا جو میں پڑھ رہا تھا اور تبھی مجھے یہ مرعوب کن ادراک ہوا کہ جسے میں نے شمع دان سمجھا تھا، وہ اُس آدمی کا روشن دایاں ہاتھ تھا۔ وہ اپنا ہاتھ میری طرف کھولے ہوئے تھا جس کی پانچوں انگلیاں فروزاں تھیں۔

گھبراہٹ کے عالم میں میں نے اردگرد پانی کی تلاش میں نظر دوڑائی مگر کہیں پانی دکھائی نہ

دیا۔ میں نے اپنی چادر اتاری اور شعلے بجھانے کے لیے درویش کی طرف پھینک دی۔ لیکن جب میں نے چادر دوبارہ اٹھائی تو وہ اپنے پیچھے ایک جلتی شمع چھوڑ کر غائب ہو چکا تھا۔

اس مقام سے آگے ہمیشہ ایک ہی خواب دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اُسے گھر میں تلاش کرنا شروع کیا، ہر کونے کھدرے میں تلاش کیا۔ پھر میں صحن کی طرف بھاگا جہاں شوخ زرد رنگ کے سمندر میں گلاب کھل چکے تھے۔ میں نے دائیں بائیں سمت میں پکارا مگر وہ آدمی کہیں دکھائی نہ دیا۔

''لوٹ آؤ میرے محبوب۔ تم کہاں ہو؟''

آخرکار، یوں جیسے کسی بدشگون وجدان کی رہنمائی میں مَیں کنویں کے قریب پہنچا اور نیچے تاریک پانیوں میں جھانکا۔ پہلے تو مجھے کچھ دکھائی نہ دیا لیکن ذرا دیر بعد چاند نے اپنی جھلملاتی چاندنی مجھ پر برسائی اور صحن کو ایک نایاب سی تابانی حاصل ہو گئی۔ تبھی تھا کہ کنویں کی تہ میں مجھے بے مثل رنج و ملال کے ساتھ اپنی طرف دیکھتی دو آنکھیں نظر آئیں۔

''انہوں نے اُسے مار ڈالا!'' کوئی چیخا۔ شاید وہ میں ہی تھا۔

شاید کسی بے انت کرب کے عالم میں میری آواز ایسی ہی سنائی دے گی۔ اور میں چیختا رہا اور چلاتا رہا، یہاں تک کہ میری بیوی نے مجھے سختی سے تھام کر اپنے سینے سے لگایا اور نرمی سے پوچھا، ''آفندی، کیا آپ نے وہی خواب دوبارہ دیکھا ہے؟''

☼

کیرا کے دوبارہ سونے کے بعد میں چپکے سے صحن میں چلا آیا۔ اُس لمحے میرا تاثر یوں تھا جیسے میں اب بھی خواب دیکھ رہا تھا، صاف واضح اور خوف انگیز خواب۔ رات کے سکوت میں، کنویں کے نظارے پر میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی لیکن میں خود کو اس کی منڈیر بیٹھنے سے روک نہ پایا اور درختوں میں نرمی سے سرسرا کر گزرتی ہوائے شب کی صدا سننے لگا۔

اس جیسے وقت میں مجھے اچانک خود پر اداسی کی کوئی لہر طاری ہوتی محسوس ہوتی ہے، اگرچہ میں کبھی نہیں بتا سکتا کہ کیوں۔ میری زندگی مکمل اور بھرپور ہے جس میں مجھے تین نعمتیں حاصل ہیں جو مجھے بے حد عزیز ہیں: علم، نیکی اور خدا کی تلاش میں دوسروں کی مدد کی قابلیت۔

اڑتیس برس کی عمر میں، خدا نے مجھے اُس سے بڑھ کر نوازا ہے جو میں کبھی طلب کر سکتا تھا۔ مجھے ایک مبلغ اور مفسر کے طور پر تربیت دی گئی اور الہامی وجدان کی سائنس میں آگے بڑھا... ایک علم جو پیغمبروں، ولیوں اور مختلف درجے کے علما کو دیا جاتا ہے۔ اپنے مرحوم والد کی رہنمائی میں، اپنے وقت کے بہترین اساتذہ سے تعلیم یافتہ، میں نے اپنی آگاہی میں اضافے کی خاطر سخت محنت کی، اس یقین کے ساتھ کہ خدا نے مجھے یہی فریضہ سونپا تھا۔

میرے ضعیف استاد سید برہان الدین کہا کرتے تھے کہ میں خدا کے پیاروں میں سے ایک تھا

کیوں کہ مجھے اُس کا پیغام اُس کے لوگوں تک پہنچانے اور صحیح اور غلط میں فرق کرنے میں اُن کی مدد کرنے کی قابلِ احترام ذمے داری سونپی گئی تھی۔

برسوں سے شریعت کے دوسرے عالموں کے ساتھ علم الٰہیات پر بحث کرتے، اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے، قانون اور حدیث کا مطالعہ کرتے، ہر جمعے کو شہر کی سب سے بڑی جامعہ میں خطبہ دیتے ہوئے، میں ایک مدرسے میں پڑھاتا آرہا ہوں۔ عرصہ ہوا میں ان طلبا کی تعداد کا شمار کھو چکا ہوں جن کو میں نے تعلیم دی۔ لوگ جب میری تبلیغ کی صلاحیتوں کی تعریف و تحسین کرتے اور مجھے بتاتے ہیں کہ کیسے اُس وقت جب انہیں رہنمائی کی اشد ضرورت تھی تو میرے الفاظ نے ان کی زندگیاں تبدیل کر دیں، یہ سب سننا بہت خوشامد آمیز ہوتا ہے۔

مجھے محبت کرنے والے خاندان، اچھے دوستوں اور وفادار شاگردوں سے نوازا گیا ہے۔ اپنی زندگی میں کبھی مجھے مفلسی یا تنگی نہیں جھیلنی پڑی، اگرچہ اپنی پہلی بیوی کی وفات میرے لیے بہت المناک تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں دوبارہ شادی نہیں کروں گا لیکن میں نے کی اور کیرا کی بدولت مجھے محبت اور مسرت کا تجربہ ہوا۔ میرے دونوں بیٹے بڑے ہو چکے ہیں، اگرچہ یہ دیکھ کر وہ دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف نکلے ہیں، میری حیرت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ دو بیجوں کی طرح ہیں جو اگرچہ ایک ہی طرح کی مٹی میں، پہلو بہ پہلو کاشت کیے گئے اور ایک سی دھوپ اور پانی سے پروان چڑھے مگر دو بالکل مختلف پودوں کی صورت انہوں نے نشوونما پائی۔ مجھے اُن پر فخر ہے، بالکل جیسے مجھے اپنی لے پالک بیٹی پر فخر ہے جو منفرد صلاحیتیں رکھتی ہے۔ میں اپنی ذاتی اور سماجی زندگی دونوں میں ایک خوش باش اور مطمئن شخص ہوں۔

پھر کیوں مجھے اپنی اندر یہ خالی پن، یہ خلا محسوس ہوتا ہے جو ہر گزرتے دن کے ساتھ گہرا اور وسیع ہوتا چلا جاتا ہے؟ یہ کسی بیماری کی طرح میری روح کو مسلسل کترتا ہے اور جہاں کہیں میں جاؤں، میرے ہمراہ رہتا ہے، کسی چوہے کی طرح خاموش اور انتہائی حریص۔

شمس

قونیہ، 17 اکتوبر 1244ء

بابِ شہر سے داخل ہونے سے پہلے، یہ شہر جہاں میں پہلے کبھی نہ آیا تھا، میں نے لمحے بھر رک کر اس کے اولیا کو سلام پیش کیا... زندہ اور مرحومین دونوں، ظاہر اور نہاں دونوں۔ میری زندگی میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ میں کسی نئی جگہ اس کے اولیا اللہ کے حضور سلام پیش کیے بغیر داخل ہوا ہوں۔ اس سے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ وہ جگہ مسلمانوں کی تھی یا عیسائیوں کی یا یہودیوں کی۔ میرا ماننا تھا کہ اولیا اللہ، نام کے ایسے معمولی فرق یا امتیازات سے ماورا تھے۔ ولی یا بزرگ کا تعلق تمام نسلِ انسانی سے ہوتا ہے۔

سو جب میں نے قونیہ کو فاصلے سے پہلی بار دیکھا، تو میں نے وہی کیا جو ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے بعد کچھ غیر معمولی وقوع پذیر ہوا۔ میرے سلام کا جواب دیتے یا جواب میں دعائے فضل و رحمت کرنے کے، جیسا کہ ''وہ'' ہمیشہ کیا کرتے تھے، وہ بزرگ شکستہ لوحِ مزار کی طرح خاموش رہے۔ میں نے انہیں دوبارہ سلام کیا، اس مرتبہ زیادہ بلند آواز میں اور زیادہ زور دے کر، کہ اگر انہوں نے میری آواز نہ سنی تھی۔ لیکن ایک بار پھر اس کے جواب میں خاموشی ہی رہی۔ مجھے ادراک ہوا کہ بزرگوں نے میرا سلام سن لیا تھا، وہ بس مجھے جواب میں دعا سے نہ نواز رہے تھے۔

''مجھے بتایئے کہ کیا خطا سرزد ہوئی ہے؟'' میں نے ہوا سے پوچھا تا کہ وہ میرے الفاظ دُور دراز، بزرگوں تک پہنچا دیتی۔

ذرا دیر بعد ہوا جواب لیے واپس آئی۔ ''اے درویش، اس شہر میں تم دو انتہائیں پاؤ گے اور اس کے درمیان کچھ نہیں۔ خالص محبت یا پھر خالص نفرت۔ ہم تمہیں انتباہ کر رہے ہیں۔ اپنے برتے پر ہی داخل ہونا۔''

''اس صورت میں فکر کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا، ''جب تک کہ میرا سامنا خالص اور سچی محبت کے ساتھ ہو سکتا ہے، میرے لیے وہی کافی ہوگی۔''

یہ سن کر قونیہ کے بزرگوں نے مجھے دعا دی۔ لیکن میں ابھی شہر میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں برگد کے ایک درخت تلے بیٹھ گیا اور میرا گھوڑا آس پاس کی چھدری گھاس چرنے لگا۔ میں نے دور دکھائی دیتے شہر پر نظر کی۔ دھوپ میں قونیہ کے مینار شیشے کی کرچیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ہر تھوڑی دیر بعد مجھے کتوں کے بھونکنے، گدھوں کے رینکنے، بچوں کے ہنسنے اور پھیری والوں کے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلانے کی آوازیں آتی تھیں... زندگی سے دھڑکتے شہر کی معمول کی آوازیں۔ میں نے سوچا، اس لمحے ان بند دروازوں اور جالی دار کھڑکیوں کے عقب میں کس قسم کی خوشیاں اور دکھ رہتے تھے؟ خانہ بدوشی کی زندگی کا عادی ہونے کے باعث، مجھے شہر میں آباد ہونے پر ذرا سی بوکھلاہٹ محسوس ہوئی لیکن مجھے ایک اور بنیادی اصول یاد آیا: ''تمہاری راہ میں جو بھی تبدیلیاں آئیں، کوشش کرنا کہ ان کے خلاف مزاحمت نہ کرو۔ اس کی بجائے زندگی کو خود پر سے گزرنے دو۔ اور یہ فکر مت کرو کہ تمہاری زندگی میں نشیب و فراز آرہے ہیں۔ یا تمہاری زندگی الٹ پلٹ ہو رہی ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ تم جس رخ کے عادی ہو، وہ تمہارے لیے بہتر ہے یا پھر بدلنے والا رخ؟''

ایک دوستانہ آواز پر میں اپنی محویت کے عالم سے نکلا۔ ''سلام علیکم، درویش!''

جب میں مڑا تو مجھے زیتونی رنگت والا، اجلی مونچھوں والا ایک ہٹا کٹا دہقان دکھائی دیا۔ وہ ایک بیل گاڑی پر سوار تھا جس میں جتا سوکھا سا مریل بیل یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی بھی لمحے وہ اپنی آخری سانس لے لے گا۔

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔'' میں نے پکار کر جواب دیا۔

''تم یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟ اگر تم اپنے گھوڑے کی سواری سے تھک گئے ہو تو میں تمہیں اپنی سواری پر ساتھ لیے چلتا ہوں۔''

میں مسکرا دیا۔ ''شکریہ، مگر میرا خیال ہے کہ میں تمہارے بیل کی نسبت زیادہ تیزی سے پیدل چل لوں گا۔''

''میرے بیل کو کمتر نہ جانو۔'' دہقان ذرا مشتعل ہو کر بولا، ''یہ بوڑھا اور کمزور ہو سکتا ہے مگر اب بھی یہ میرا بہترین دوست ہے۔''

ان الفاظ میں اپنی حیثیت جان کر، میں اچھل کر کھڑا ہوا اور دہقان کے سامنے جھک گیا۔ کیسے میں جو کہ خدا کے وسیع دائرہ تخلیق میں خود ایک ادنیٰ شے تھا، اس دائرے میں موجود کسی دوسری شے کو حقیر جان سکتا تھا، چاہے وہ جانور ہوتا یا کوئی انسان؟

''میں تم اور تمہارے بیل دونوں سے معذرت کرتا ہوں۔'' میں نے کہا، ''برائے مہربانی مجھے معاف کر دو۔''

دہقان کے چہرے پر بے یقینی کا ایک سایہ سا گزر گیا۔ وہ ایک لمحے کو تو بے تاثر چہرے کے

ساتھ کھڑا رہ گیا، یہ اندازہ لگاتے کہ آیا میں کہیں اُس کا مذاق تو نہیں اڑا رہا تھا۔ ''کسی نے ایسا کبھی نہیں کیا۔'' جب وہ دوبارہ بولا تو ایک گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے بیل سے معذرت کرنا؟''

''خیر، یہ بھی۔ لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ کسی نے کبھی مجھ سے معذرت نہیں کی۔ عام طور پر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ میں ہوں جسے سارا وقت معافی مانگنی پڑتی ہے۔ چاہے جب لوگ میرے ساتھ غلط کریں، تب بھی میں ہی ان سے معذرت کرتا ہوں۔''

میں یہ سن کر متاثر ہوا۔ ''قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو بہترین سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ یہ بھی اصولوں میں سے ایک ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''کیسا اصول؟'' اُس نے پوچھا۔

''خدا تمہاری تخلیق کی ظاہری اور باطنی تکمیل میں مصروف ہے۔ اس کی پوری توجہ تم پر ہے۔ ہر انسان ایک زیرِ تکمیل مرحلے میں ہے جو آہستگی اور مضبوطی سے تکمیل کی طرف گامزن ہے۔ ہم میں سے ہر ایک، منفرد اور تکمیل پانے کی تگ و دو میں ایک نامکمل فن پارہ ہے۔ خدا ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ انفرادی معاملہ رکھتا ہے کیوں کہ نسلِ انسانی ماہرانہ خطاطی کا نفیس فن ہے جہاں پوری تصویر میں ہر نقطہ یکساں اہم ہے۔''

''کیا تم بھی یہاں خطبہ سننے کے لیے آئے ہو؟'' دہقان نے اب نئی عود کر آتی دلچسپی سے پوچھا، ''لگتا ہے کہ یہاں خاصا ہجوم ہو جائے گا۔ وہ ایک غیر معمولی شخصیت ہیں۔''

جب مجھے ادراک ہوا کہ وہ کس کی بات کر رہا تھا، تو میرے دل کی دھڑکن لمحے بھر کو رکی۔

''مجھے بتاؤ کہ مولانا رومی کے خطبوں میں ایسی کیا اہم بات ہے؟''

دہقان خاموش ہو گیا اور چند ثانیے آنکھیں سکیڑ کر افق کی سمت دیکھتا رہا۔ اس کی توجہ ہر طرف تھی اور کہیں بھی نہ تھی۔

پھر وہ بولا، ''میں ایک ایسے گاؤں سے تعلق رکھتا ہوں جہاں بہت سے مصائب آئے۔ پہلے قحط، پھر منگول۔ انہوں نے اپنی راہ میں آنے والے ہر گاؤں میں لوٹ مار کی اور اُسے نذرِ آتش کر دیا۔ لیکن جو کچھ انہوں نے بڑے شہروں کے ساتھ کیا، وہ بدتر تھا۔ انہوں نے ارضِ روم، سیواس اور قیصری پر قبضہ کیا، ان کی ساری مردانہ آبادی کا قتلِ عام کیا اور اُن کی عورتوں کو ساتھ اٹھا لے گئے۔ میں خود اپنے کسی پیارے یا اپنے گھر سے محروم نہیں ہوا۔ لیکن کچھ ہے جو میں نے کھو دیا۔ میں خوشی سے محروم ہو گیا۔''

''اس بات کا مولانا رومی سے کیا لینا دینا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اپنی نگاہ اپنے بیل کی طرف جھکا کر دہقان بے ڈھنگے سے انداز میں بڑبڑایا، ''سب کہتے ہیں کہ اگر تم مولانا رومی کو وعظ کرتے سنو تو تمہاری اداسی دور ہو جاتی ہے۔''

ذاتی طور پر میرا نہیں خیال تھا کہ اداسی میں کوئی برائی تھی۔ اس کے برعکس ... لوگوں کو منافقت خوش کرتی تھی اور سچائی انہیں اداس کر دیتی۔ لیکن یہ بات میں نے دہقان کو نہ بتائی۔ اس کی بجائے میں نے کہا، ''کیا میں تمہارے ساتھ ہی قونیہ نہ چلوں اور راستے میں تم مجھے مولانا رومی کے بارے میں مزید بتانا؟''

میں نے اپنے گھوڑے کی لگام، بیل گاڑی کے ساتھ باندھی اور دہقان کے برابر جا بیٹھا، یہ دیکھ کر خوش کہ بیل نے اضافی بوجھ کی پرواہ نہ کی تھی۔ بہرصورت وہ وہی تکلیف بھری ست چال چلتا رہا۔ دہقان نے مجھے روٹی اور بکری کے پنیر کی پیشکش کی۔ ہم کھاتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ اس حالت میں جب نیلے آسمان پر سورج روشن تھا اور شہر کے بزرگوں کی ہوشیار نگاہوں میں، میں قونیہ میں داخل ہوا۔

''اپنا خیال رکھنا، میرے دوست۔'' بیل گاڑی سے کود کر اترتے میں نے کہا اور اپنے گھوڑے کی باگیں کھولنے لگا۔

''وعظ سننے ضرور آنا!'' دہقان نے توقع کے عالم میں پکار کر کہا۔

میں نے سر ہلایا اور ہاتھ ہلا کر الوداع کہا، ''اِن شاء اللہ۔''

اگرچہ میں خطبہ سننے کے لیے مشتاق تھا اور مولانا رومی سے ملنے کو بے تاب، لیکن میں پہلے شہر میں وقت گزارنا اور جاننا چاہتا تھا کہ شہر کے لوگ اس عظیم مبلغ کے بارے میں کیا خیالات رکھتے تھے۔ میں اُنہیں اجنبی نگاہوں سے دیکھنا چاہتا تھا، مہربان اور نامہربان، محبت کرنے والی اور محبت و الفت سے عاری، اس سے پہلے کہ میں اُنہیں خود اپنی نظروں سے دیکھتا۔

حسن گداگر

قونیہ، 17اکتوبر 1244ء

بلاشک وشبہ، لوگ زمین کے اِس مقام کفارہ کو "مقدس کرب واذیت" کہتے ہیں۔ میں مقامِ اعراف میں پھنسا ایک کوڑھی ہوں۔ مجھے زندہ لوگ اپنے درمیان چاہتے ہیں نہ مُردہ۔ گلیوں میں مائیں اپنے بدتمیزی کرتے بچوں کو ڈرانے کی خاطر میری طرف اشارہ کرتی ہیں اور بچے مجھ پر پتھر اچھالتے ہیں۔ کاریگر مجھے اپنی دکانوں کے سامنے سے بھگا دیتے ہیں تاکہ اُس نحوست سے چھٹکارا پا سکیں جو میرے پیچھے ہر جگہ چلی آتی ہے اور حاملہ عورتوں کی جب کبھی مجھ پر نظر پڑ جائے تو وہ اس خدشے کے تحت اپنے رخ موڑ لیتی ہیں کہ اُن کے بچے کسی نقص کے ساتھ پیدا ہوں گے۔ ان لوگوں میں سے کوئی نہیں جانتا کہ وہ جس قدر مجھ سے گریز کرنا چاہتے ہیں، اُس سے کہیں زیادہ میں ان سے اور ان کی ترحم اور افسوس بھری نگاہوں سے بچنا چاہتا ہوں۔

اس بیماری میں پہلے جلد بدلتی ہے، وہ موٹی اور گہری رنگت کی ہوتی چلی جاتی ہے۔ مختلف حجم اور گندے انڈے کے رنگ کے دھبے کندھوں، گھٹنوں، بازوؤں اور چہرے پر نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اس مرحلے پر بہت جلن اور سوزش ہوتی ہے لیکن پھر کسی طور درد کم ہو جاتا ہے یا پھر آپ درد سے بے حس ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد دھبے بڑھنا اور سوجنا شروع ہو جاتے ہیں، اور بدصورت گلٹیوں میں بدل جاتے ہیں۔ ہاتھ پنجوں کی صورت ڈھل جاتے ہیں اور چہرہ ناقابل پہچان حد تک مسخ ہو جاتا ہے۔ اب میں آخری مراحل کے قریب ہوں، اب میں اپنی آنکھوں کے پپوٹے بند نہیں کر سکتا۔ آنسو اور تھوک کا بہنا میرے اختیار سے باہر ہے۔ میرے ہاتھوں کے چھ ناخن جھڑ چکے ہیں اور ساتواں جھڑنے کو ہے۔ عجیب بات یہ کہ میرے بال ابھی تک موجود ہیں۔ میرا خیال ہے مجھے اس کو خوش قسمتی سمجھنا چاہیے۔

میں نے سنا تھا کہ یورپ میں کوڑھیوں کو شہر کی فصیلوں سے باہر رکھتے ہیں۔ یہاں وہ ہمیں شہر کے اندر رہنے دیتے ہیں جب تک کہ ہم لوگوں کو اپنی موجودگی سے خبردار کرنے کے لیے گلے میں گھنٹی پہنے

رکھیں۔ ہمیں بھیک مانگنے کی بھی اجازت ہے جو کہ اچھی بات ہے کیوں کہ دوسری صورت میں ہم غالباً بھوکوں مرجاتے۔ زندہ رہنے کے دو طریقوں میں سے ایک گداگری ہے۔ دوسرا ہے دعا کرنا۔ اس لیے نہیں کہ خدا کوڑھیوں پر خصوصی توجہ دیتا ہے بلکہ اس لیے کہ کسی عجیب وجہ کے باعث لوگوں کا خیال ایسا ہے کہ خدا ہماری سنتا ہے۔ اس وجہ سے شہر کے لوگ ہم سے جتنا تنفر رکھتے ہیں، اتنا ہی ہمارا احترام بھی کرتے ہیں۔ وہ بیماروں، معذوروں اور بوڑھوں کے لیے دعا کروانے کی خاطر ہماری خدمات حاصل کرتے ہیں۔ وہ ہمیں معاوضہ دیتے اور کھانا بھی کھلاتے ہیں، اس امید میں کہ ہمارے منہ سے چند مزید دعائیں نچوڑ لیں۔ گلیوں راہ گزاروں پر کوڑھیوں سے کتوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے، لیکن وہ جگہیں جہاں موت اور مایوسی منڈلاتے ہیں، وہاں ہم سلطان ہیں۔

جب بھی دعا کروانے کے لیے میری خدمات لی جاتی ہیں تو میں اپنا سر جھکا کر عربی میں ناقابل فہم آوازیں نکالتا ہوں، یوں ظاہر کرتے ہوئے جیسے میں دعا کرنے میں محو ہوں۔ میں بس دکھاوا ہی کرسکتا ہوں کیوں کہ میرا نہیں خیال کہ خدا میری سنتا ہے۔ میرے پاس اس یقین کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ میری سنتا ہے۔

اگرچہ یہ کم منافع بخش ہے مگر پھر بھی مجھے بھیک مانگنا دعا کرنے سے زیادہ آسان لگتا ہے۔ کم از کم اس میں مَیں کسی کو دھوکا نہیں دے رہا ہوتا۔ بھیک مانگنے کے لیے جمعہ کا دن بہترین ہے، سوائے رمضان کے دنوں کے جن میں پورا مہینہ ہی خاصا نفع بخش ہوتا ہے۔ رمضان کا آخری روز پیسہ بنانے کا بہترین وقت ہے۔ اس روز کنجوس ترین لوگ بھی خیرات کرتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے ماضی اور حال کے گناہوں کی تلافی چاہتے ہیں۔ سال میں اس ایک مرتبہ لوگ بھکاریوں سے منہ نہیں پھیرتے۔ اس کے برعکس وہ گداگروں کی تلاش میں ہوتے ہیں، جو جتنا قابل رحم ہوگا، اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اُن کی یہ دکھاوا کرنے کی ضرورت کہ وہ کس قدر سخی اور فیاض ہیں، اس قدر گہری ہے کہ وہ نہ صرف خیرات دینے میں پہل کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اُس روز تو وہ گویا ہم سے محبت کرتے ہیں۔

آج بھی خاصا فائدہ بخش دن ہوسکتا ہے کیوں کہ مولانا رومی جمعہ کا خطبہ دینے والے ہیں۔ مسجد پہلے ہی کھچا کھچ بھری ہے۔ جنھیں اندر بیٹھنے کی جگہ نہیں مل پائی، وہ باہر صحن میں قطار بنائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ آج سہ پہر کا وقت بھکاریوں اور جیب کتروں کے لیے بہترین موقع ہے۔ اور میری طرح وہ سب اس ہجوم میں بکھرے ہوئے وہاں موجود ہیں۔

میں مسجد کے داخلی دروازے کے سامنے میپل کے درخت سے پشت ٹیک کر بیٹھ گیا۔ فضا میں بارش کی نم خوشبو تھی جو دُور کے باغات سے آتی مدھم میٹھی مہک کے ساتھ گھل مل رہی تھی۔ میں نے اپنا کشکول سامنے رکھ لیا۔ یہ کام کرنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کے برعکس مجھے کبھی کھل کر خیرات مانگنی نہیں پڑی۔ کسی کوڑھی کو گڑگڑانا اور التجا نہیں کرنی پڑتی، اُسے کہانیاں نہیں گھڑنی پڑتیں کہ اُس کی زندگی

کس قدر قابلِ رحم ہے یا اُس کی صحت کس قدر رُو بہ زوال ہے۔ لوگوں کو اپنے چہرے کی ایک جھلک دکھانا ہزاروں لفظوں کے برابر اثر رکھتا ہے۔ سو میں نے بس اپنا چہرہ کھولا اور بیٹھ گیا۔

اگلے گھنٹے میں میرے کشکول میں چند سکے گرے۔ وہ سب تانبے کے ٹیڑھے میڑھے سکے تھے۔ مجھے سورج، شیر اور ہلال کی علامتوں والی سونے کی اشرفی کی تمنا تھی۔ چوں کہ مرحوم علاؤالدین کیقباد نے کرنسی کے قانون نرم کر دیئے تھے، اس لیے حلب کے بیگ، قاہرہ کے فاطمی حکمرانوں اور بغداد کے خلفا کے جاری کردہ سکے، اطالوی فلورن کا توذکر ہی کیا، سب قانونی مانے جاتے تھے۔ قونیہ کے حکمران اس سب سکوں کو قبول کرتے تھے اور اسی طرح شہر کے گداگر بھی۔

سکوں کے ساتھ میری گود میں چند سوکھے پتے آ گرے۔ میپل کے درخت کے سرخی مائل سنہری پتے جھڑ رہے تھے اور جب طوفانی سی ہوا چلی تو ان کی بڑی تعداد میرے کشکول میں آ گری۔ یوں جیسے درخت مجھے خیرات دے رہا تھا۔ اچانک مجھے ادراک ہوا کہ میپل کے درخت اور مجھ میں کچھ مشترک تھا۔ خزاں میں اپنے پتے جھاڑتا درخت جذام کے آخری مراحل میں اپنے جھڑتے اعضا والے آدمی سے مشابہ تھا۔

میں ایک برہنہ درخت تھا۔ میری جلد، میرے اعضا، میرا چہرہ مسخ ہو رہے تھے۔ ہر روز میرے جسم کا کوئی حصہ میرا ساتھ چھوڑ جاتا۔ اور جہاں تک میری بات تھی، میپل کے درخت کے برعکس ایسا کوئی موسمِ بہار نہ تھا جس میں میرے نئے شگوفے پھوٹتے۔ میں نے جو کھو دیا، ابدی طور پر کھو دیا تھا۔ جب لوگ مجھ پر نظر ڈالتے تو وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ میں کون تھا بلکہ یہ کہ مجھ میں کیا کمی تھی۔ جب کبھی وہ میرے کشکول میں سکہ اچھالتے تو وہ اس قدر حیرت انگیز تیزی سے ایسا کرتے اور میری آنکھوں میں جھانکنے سے گریز کرتے، یوں جیسے میری نظر متعدی تھی۔ ان کی نگاہوں میں مَیں کسی چور یا قاتل سے بدتر تھا۔ اگرچہ جہاں تک میری بات تھی، وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ موت اُن سے نظریں ملا رہی تھی۔ اسی سے وہ دہشت زدہ ہوتے تھے... یہ پہچاننا کہ موت اس قدر قریب اور اتنی بدصورت ہو سکتی تھی۔

اچانک پس منظر میں ہل چل اٹھی۔ میں نے کسی کو چلاتے سنا، ''وہ آ رہے ہیں! وہ آ رہے ہیں!''

یقیناً وہ مولانا رومی تھے، دودھ جیسے سفید گھوڑے پر سوار، سونے کی تاروں اور چھوٹے موتیوں سے کشیدہ کاری کیے گئے ایک اعلیٰ عنبریں کافتان میں ملبوس، سیدھے اور متفاخر، دانش مند اور معزز، جن کے عقب میں اُن کے عقیدت مندوں کا اژدہام تھا۔ اپنی کرشماتی شخصیت اور اعتماد کی کرنیں بکھیرتے، وہ کسی عالم سے بڑھ کر کوئی حکمران دکھائی دے رہے تھے... باد و آتش، آب و خاک کے سلطان۔ حتیٰ کہ ان کا گھوڑا بھی قدآور اور مضبوط کھڑا تھا، یوں جیسے وہ خود پر سوار شخصیت کے امتیاز سے آگاہ تھا۔

میں نے کشکول کے سکے اپنی جیب میں ڈالے، اپنے سر کو یوں لپیٹا کہ میرا آدھا چہرہ کھلا رہ

جائے اور مسجد میں داخل ہو گیا۔ اندر اس قدر ہجوم تھا کہ سانس لینا محال تھا، کجا کہ بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنا۔ لیکن کوڑھی ہونے کا ایک فائدہ تو تھا کہ جگہ کتنی ہی پُر ہجوم ہوتی، مجھے بیٹھنے کی جگہ ہمیشہ مل ہی جاتی تھی کیوں کہ کوئی بھی میرے برابر میں ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔

''برادران!'' مولانا رومی نے بلند ہوتی اور دُور تک جاتی آواز میں کہا، ''کائنات کی وسعت کے سامنے ہم خود کو حقیر حتیٰ کہ غیر اہم محسوس کرتے ہیں۔ آپ میں سے بعض پوچھیں گے، اپنی محدودیت کے ساتھ میں خدا کے کیا معانی سمجھ سکتا ہوں؟ میرا خیال ہے کہ یہ سوال کئی لوگوں کے ذہن میں وقفوں سے ابھرتا ہوگا۔ آج کے خطبے میں مَیں اس بارے میں جواب دینا چاہوں گا۔''

رومی کے دونوں بیٹے پہلی قطار میں بیٹھے تھے... وجیہہ صورت، سلطان ولد جس کے بارے میں سب کہتے تھے کہ وہ اپنی مرحومہ ماں سے مشابہت رکھتا تھا اور نوجوان علاؤالدین جو شیلے چہرے مگر دزدیدہ متجسس نگاہوں والا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ دونوں کو اپنے باپ پر فخر تھا۔

''اولادِ آدم کو وہ علم عطا کیا گیا جس کا بوجھ پہاڑ اٹھا سکتے تھے نہ ہی آسمان اپنے کندھوں پر لے سکتے تھے۔'' مولانا رومی نے بات جاری رکھی، ''اسی وجہ سے قرآن میں ارشاد ہے، ''ہم نے بارِ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔'' (سورۃ احزاب، آیت 72) ایسا واجب تعظیم مقام عطا ہونے کے بعد انسانوں کو اپنا مقصد اُس سے کم تر نہیں رکھنا چاہیے جو خدا کا ارادہ تھا۔''

اپنے حروفِ علت اُس عجیب طور پر ادا کرتے ہوئے جیسا صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی کر پاتے ہیں، مولانا رومی نے خدا کے بارے میں بات کی، ہمیں یقین دلاتے ہوئے کہ وہ صرف آسمان کے دُور افتادہ تخت پر ہی متمکن نہیں بلکہ ہم میں سے ہر کسی کے قریب ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تکلیف و مصائب ہمیں خدا کے قریب تر کر دیتے ہیں۔

''آپ اپنے ہاتھوں کو کھول اور بند کر سکتے ہیں، اگر نہ کر پائیں تو آپ مفلوج ہو جائیں۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے سکڑاؤ اور پھیلاؤ میں آپ کی گہری ترین موجودگی شامل ہے۔ یہ دونوں اسی قدر خوب صورتی سے متوازن اور مربوط ہیں، جیسے کسی پرندے کے پَر۔''

جو کچھ انہوں نے کہا، پہلے تو مجھے پسند آیا۔ یہ سوچ کر میرے دل کو گرمائش ملی کہ خوشی اور غم ایک دوسرے پر اُسی طرح انحصار کرتے ہیں جیسے کسی پرندے کے پَر۔ لیکن تقریباً فوراً ہی مجھے اپنے حلق سے ابھرتی آزردگی کی لہر محسوس ہوئی۔ مولانا رومی کو تکلیف کا کیا علم تھا؟ ایک ممتاز شخصیت کے بیٹے اور امیر اور سرکردہ خاندان کے وارث کے طور پر زندگی ہمیشہ اُن پر مہربان رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے محروم ہو گئے تھے لیکن میرا نہیں خیال کہ انہیں کبھی کسی واقعتاً بدقسمتی کا تجربہ ہوا تھا۔ وہ اپنے منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئے، ممتاز اور نمایاں حلقوں میں پروان چڑھے، بہترین علما سے تعلیم حاصل

کی اور ہمیشہ ان سے محبت کی گئی، انہیں سراہا گیا اور ان کی تعریف و تحسین کی گئی تھی... کیوں کر انہیں تکلیف و مصائب پر تبلیغ کی جرأت ہوئی؟

اپنے ڈوبتے دل کے ساتھ مجھے ادراک ہوا کہ مولانا رومی اور میرے درمیان تضاد اس سے بڑھ کر نہ ہو سکتا تھا۔ خدا اس قدر نا انصاف کیوں تھا؟ جانب دار کیوں تھا؟ مجھے اس نے غربت، بیماری اور بدحالی دیئے جب کہ مولانا رومی کو دولت، کامیابی اور حکمت۔ اپنی بے داغ شہرت اور شاہانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ وہ اس دنیا کے لگتے ہی نہ تھے کم سے کم اس شہر کے تو بالکل نہیں۔ اگر میں چاہتا کہ لوگ مجھے دیکھ کر برگشتہ نہ ہوں تو مجھے اپنا چہرہ ڈھانپنا پڑتا تھا جب کہ مولانا رومی کسی قیمتی نگینے کی طرح لوگوں کے درمیان چمکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ میری جگہ ہوتے تو اُن کی کیا حالت ہوتی؟ کیا انہیں کبھی یہ خیال بھی آیا تھا کہ اُن جیسا کامل اور مراعات یافتہ شخص بھی کسی روز لڑکھڑا اور گر سکتا تھا؟ کیا انہوں نے کبھی اس پر غور کیا تھا کہ چاہے ایک روز کے لیے ہی سہی مگر بے خانماں ہونا اور دھتکارا جانا کیسا محسوس ہوگا؟ اگر انہیں وہ زندگی بخشی جاتی جو مجھے دی گئی تھی تو کیا پھر بھی وہ عظیم مولانا روم ہی ہوتے؟

ہر نئے سوال کے ساتھ میری آزردگی بڑھتی گئی اور وہ سب تحسین و تعریف رفع ہوتی گئی جو دوسری صورت میں میرے دل میں اُن کے لیے ہوتی۔ تلخ اور چڑچڑا ہو کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور دوسروں کو دھکیل کر اپنے باہر جانے کا راستہ بنانے لگا۔ سامعین میں سے کئی لوگوں نے مجھے متجسس ہو کر دیکھا، حیران ہوتے ہوئے کہ میں اُس وعظ کو چھوڑ کر کیوں جا رہا تھا جسے سننے کے لیے بہت سے دوسرے لوگ مرے جا رہے تھے۔

شمس

قونیہ، 17 اکتوبر 1244ء

بے انتہا مشکور ہوتے ہوئے اُس دہقان کا جس نے مجھے شہر کے مرکز میں لا اتارا تھا، میں نے اپنے اور اپنے گھوڑے کے لیے قیام کی جگہ تلاش کی۔ شکر فروشوں کی سرائے بالکل ویسی تھی جیسی مجھے ضرورت تھی۔ جو چار کمرے مجھے دکھائے گئے، ان میں سے میں نے سب سے کم سازوسامان والے کمرے کا انتخاب کیا جہاں سونے کے لیے پھپھوندی لگائی رضائی اور چٹائی، ایک تیل کا دیا جو اپنے آخری دموں پر پھڑ پھڑا رہا تھا، دھوپ میں خشک ایک اینٹ جسے میں تکیے کے طور پر استعمال کرسکتا تھا، موجود تھے اور وہاں سے پورے شہر کا گردونواح کے پہاڑوں تک نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

یوں وہاں قیام کے بعد میں نے گلیوں میں بے مقصد آوارہ گردی کی اور ماحول میں نفوذ مذاہب، روایات اور زبانوں کے امتزاج پر حیران ہوا۔ راستوں میں مجھے خانہ بدوش موسیقار، عرب سیاح، عیسائی زائرین، یہودی تاجر، بدھ مت کے مذہبی پیشوا، فرنگی عشقیہ شاعر، فارسی فنکار، چینی بازی گر، ہندوستانی سپیرے، زرتشتی ساحر اور یونانی فلسفی ملے۔ غلام بازار میں مجھے دودھیا سفید رنگت والی کنیزیں اور ہٹے کٹے سیاہ فام خواجہ سرا دکھائی دیئے جو اتنی سفا کی اور بے رحمی دیکھ چکے تھے کہ اپنی قوت گویائی سے محروم ہو چکے تھے۔ بازار میں مجھے فصد خون کھولنے کے آلے لیے گھومتے حجام نظر آئے، بلوریں گیند والے قسمت کا حال بتانے والے اور جادوگر جو آگ نگل لیتے تھے۔ یروشلم کی طرف جاتے زائرین تھے اور سیلانی آوارہ گرد جن کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ وہ آخری صلیبی جنگ کے بھگوڑے سپاہی تھے۔ میں نے لوگوں کو وینسی، فرنگی، سیکسن، یونانی، فارسی، ترکی، کردی، آرمینی، عبرانی اور کئی ایسی دوسری زبانیں بولتے سنا جنھیں میں پہچان بھی نہ پایا۔ اپنی بہ ظاہر نہ ختم ہونے والی عدم مطابقت یا تفریق کے باوجود وہ سب لوگ کسی طور ادھورے لگتے تھے، جیسے ان پر کام ابھی جاری تھا، ہر کوئی نامکمل شہ پارہ تھا۔

پورا شہر برج بابل تھا۔ سب کچھ مسلسل بدل رہا تھا، بکھر رہا تھا، روشنی میں آ رہا تھا، ظاہر ہو رہا

تھا، پھل پھول رہا تھا، تحلیل ہو رہا تھا، پگھل رہا تھا اور مر رہا تھا۔ اس انتشار کے بیچوں بیچ، میں ایک غیر مضطرب خاموشی اور طمانیت کے مقام پر دنیا سے بالکل بے تعلق کھڑا تھا اور پھر بھی اس میں موجود تمام لوگوں کی جدوجہد اور مصائب کے لیے ایک فروزاں محبت محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ارد گرد لوگوں کو دیکھتے ہوئے مجھے ایک اور اصول یاد آیا، ''ایک کامل، بے عیب اور بے خطا خدا سے محبت کرنا آسان ہے، جیسا کہ وہ بلاشبہ ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے اپنے ساتھی انسانوں سے ان کی تمام تر خامیوں اور نقائص کے ساتھ محبت کرنا۔ یاد رکھو، کوئی صرف وہی سب جان سکتا ہے جس سے وہ محبت کرنے کے قابل ہے۔ محبت کے بغیر کوئی دانش نہیں۔ جب تک کہ ہم خدا کی مخلوق سے محبت کرنا نہ سیکھ لیں، ہم خدا سے حقیقت میں محبت کر سکتے ہیں نہ ہی اُسے حقیقت میں جان سکتے ہیں۔''

میں تنگ گلیوں میں گھومتا رہا جہاں ہر عمر کے کاریگر اپنی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں مشقت میں مگن تھے۔ ہر جگہ جہاں میں گیا، میں نے شہر کے لوگوں کو مولانا رومی کے بارے میں گفتگو کرتے سنا۔ میں حیران ہوا کہ اس قدر مقبول ہونے پر کیسا محسوس ہوتا ہوگا؟ اس سے اُن کے نفس پر کیا اثر پڑا ہوگا؟ میرا دماغ جب ان سوالوں میں محو تھا، میں اُس مسجد سے مخالف سمت چلتا گیا جہاں مولانا رومی تبلیغ کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ گرد و پیش بدلنے لگے۔ جب میں شمال کی طرف بڑھتا گیا تو گھر زیادہ خستہ حال، باغوں کی دیواریں شکستہ اور بچے زیادہ غیر مہذب اور کرخت آوازوں والے ہوتے گئے۔ خوشبوئیں بھی بدل گئیں، زیادہ بوجھل، زیادہ لہسن بھری، زیادہ مصالحے دار۔ آخر کار میں ایک ایسی گلی میں داخل ہوا جہاں فضا میں تین طرح کی خوشبوئیں معلق تھیں: شیرینی، خوشبو اور حرص۔ میں شہر کے آخری سرے پر پہنچ چکا تھا۔

پتھر جڑی ڈھلانی گلی میں سب سے اوپر ایک خستہ حال مکان تھا، دیواروں کو بانس کے ستونوں سے سہارا دیا گیا تھا، چھت گھاس پھونس کی تھی۔ گھر کے سامنے کچھ عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ جب انہوں نے مجھے قریب آتے دیکھا تو اپنی متجسس نظریں مجھ پر جما دیں، وہ کچھ حیران تھیں۔ ان کے برابر میں ہر قابلِ تصور رنگ والے گلابوں اور حیرت انگیز خوشبوؤں سے مہکتا باغ تھا۔ میں حیران ہوا کہ اُس باغ کی دیکھ بھال کون کرتا ہوگا۔

مجھے جواب معلوم کرنے کے لیے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ جیسے ہی میں باغ کے قریب پہنچا، گھر کا داخلی دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکلی۔ وہ چوڑے چہرے والی، بلند قامت اور بے انتہا موٹی تھی۔ اگر وہ آنکھیں میچتی، جیسا کہ اس وقت کر رہی تھی، تو اس کی آنکھیں گوشت کی تہوں میں گم ہو جاتیں۔ اس کی ہلکی سی مونچھیں اور گھنی قلمیں تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر لگی کہ وہ مرد اور عورت دونوں تھی۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' اس دوجنسی شخص نے شبے کے عالم میں پوچھا۔ اس کا چہرہ مسلسل بدل رہا تھا: ایک لمحے وہ کسی عورت کا چہرہ لگتا اور پھر کوئی لہر واپس آتی اور اُسے کسی مرد کے چہرے میں بدل دیتی۔

میں نے اپنا تعارف کروایا اور اُس کا نام پوچھا مگر اُس نے میرا سوال نظر انداز کر دیا۔

''یہ جگہ تمہارے لیے نہیں۔'' وہ اپنے ہاتھ یوں ہلاتے ہوئے بولی جیسے میں کوئی مکھی تھا اور وہ مجھے یوں بھگا دے گی۔

''کیوں نہیں ہے؟''

''تم دیکھتے نہیں، یہ جگہ قحبہ خانہ ہے؟ کیا تم درویشوں نے حرص و ہوس سے دُور رہنے کا حلف نہیں اٹھایا ہوتا؟ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں گناہ میں لتھڑی پڑی ہوں لیکن میں خیرات دیتی ہوں اور رمضان کے مہینے میں اپنے دروازے بند کر لیتی ہوں۔ اور اب میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ ہم سے دُور رہو۔ یہ شہر کا غلیظ ترین گوشہ ہے۔''

''گندگی اندر ہوتی ہے، باہر نہیں۔'' میں نے اعتراض کیا۔ ''اصول بھی یہی کہتا ہے۔''

''تم کیا بات کر رہے ہو؟'' وہ بڑ بڑائی۔

''یہ چالیس اصولوں میں سے ایک ہے۔'' میں نے وضاحت کی کوشش کی، ''اصل غلاظت اندر ہوتی ہے۔ باقی سب کچھ تو آسانی سے دھل جاتا ہے۔ صرف ایک قسم کا گرد و غبار اور داغ ہے جو پاک پانی سے بھی نہیں دھلتا اور وہ روح کو داغ دار کرتا نفرت اور تعصب کا داغ ہے۔ تم اپنے بدن کو تو پرہیزگاری اور روزہ رکھ کر پاک کر سکتے ہو مگر قلب کا تزکیہ کرنے والی شے صرف محبت ہے۔''

اس دو جنسی شخص کو اس بات کی کچھ سمجھ نہ آئی۔ ''تم درویش، عقل سے پیدل دیوانے ہوتے ہو۔ یہاں میرے پاس ہر قسم کے گاہک آتے ہیں۔ لیکن درویش؟ جب مینڈکوں کے ڈاڑھی آنے لگے گی! اگر میں نے تمہیں یہاں منڈلانے دیا تو خدا اس جگہ کو تہ و بالا کر دے گا اور ایمان والوں کو بہکانے پر ہم پر عذاب نازل کرے گا۔''

میں خود کو بے ساختہ ہنسنے سے روک نہ پایا۔ ''یہ مضحکہ خیز باتیں تم نے کہاں سے سنی ہیں؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ خدا کوئی ناراض سنکی مذہبی پیشوا ہے جو آسمانوں سے ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے تاکہ جس لمحے بھی ہم کوئی غلطی کریں، وہ ہمارے سروں پر پتھر اور مینڈک برسا سکے؟''

اُس نے اپنی پتلی سی مونچھیں مروڑیں، برہم سی نظروں سے مجھے دیکھا جو کینگنی کو چھو رہی تھیں۔

''فکر مت کرو۔ میں یہاں تمہارے قحبہ خانے نہیں آیا۔'' میں نے اُسے تسلی دی۔ ''میں بس تمہارے گلابوں کے باغ کی تعریف کر رہا تھا۔''

''اوہ، وہ''... اُس نے بے پروائی سے شانے اچکائے... ''وہ تو میری لڑکیوں میں سے ایک گل صحرا کی تخلیق ہے۔''

اس کے ساتھ ہی قحبہ خانے کی نائکہ نے ہمارے سامنے بیٹھی طوائفوں میں سے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ نازک سی ٹھوڑی، موتی سی دمکتی جلد اور فکر و پریشانی کے بادلوں میں گھری گہری بادامی آنکھیں۔ وہ دل شکن حسینہ تھی۔ اُسے دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ کسی بڑی تبدیلی کے عمل سے گزر

رہی تھی۔

میں نے اپنی آواز دھیمی سرگوشی میں بدل دی تاکہ صرف نانگہ ہی سن سکے۔ ''وہ ایک نیک لڑکی ہے۔ ایک روز وہ خدا کی معرفت کے روحانی سفر کا آغاز کرے گی۔ وہ یہ جگہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گی۔ جب وہ دن آئے تو اسے روکنے کی کوشش مت کرنا۔''

اس مخنث نے پھٹ پڑنے سے پہلے مجھے سراسیمگی کے عالم میں دیکھا۔ ''تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ مجھے اپنی لڑکیوں کا کیا کرنا ہے، یہ کوئی دوسرا مجھے نہیں بتاتا! بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ یا پھر میں گیدڑ سر عیار کو بلاؤں!''

''وہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا یقین کرو، تم جاننا نہیں چاہو گے۔'' مخنث نے اپنی بات پر زور دیتے انگلیاں ہلاتے کہا۔

اس اجنبی کا نام سن کر میں ہلکے سے کپکپا گیا تھا لیکن میں نے اس پر غور نہ کیا۔ ''بہر حال، میں چلتا ہوں۔'' میں نے کہا، ''لیکن میں پھر آؤں گا، سو اگلی بار مجھے یہاں دیکھو تو حیران مت ہونا۔ میں ان نیکوکاروں میں سے نہیں ہوں جو اپنی تمام زندگیاں جائے نماز پر سجدہ ریز رہتے گزار دیتے ہیں جب کہ ان کی آنکھیں اور دل باہر کی دنیا سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہ قرآن پاک کو صرف سطح سے پڑھتے ہیں۔ لیکن میں قرآن کو کھلتے پھولوں اور ہجرتی پرندوں میں پڑھتا ہوں۔ میں انسانوں میں نہاں سانس لیتے ہوئے قرآن کو پڑھتا ہوں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم لوگوں کو پڑھتے ہو۔'' وہ ایک نیم دلانہ سی ہنسی ہنس دی۔ ''یہ کس قسم کی احمقانہ بات ہے؟''

''ہر آدمی ایک کھلی کتاب ہے، ہم میں سے ہر کوئی ایک چلتا پھرتا قرآن ہے۔ خدا کی جستجو ہم سب کے دلوں پر نقش ہے، وہ چاہے کوئی طوائف ہو یا ولی۔ جس لمحے ہم پیدا ہوتے ہیں، محبت تبھی سے ہمارے اندر اپنا وجود رکھتی ہے اور تب سے اپنی دریافت کیے جانے کی منتظر ہوتی ہے۔ چالیس میں سے ایک اصول اسی بارے میں ہے: 'ایک انسان کے اندر پوری کائنات موجود ہے... تمہارے اندر۔ ہر شے جو تم اپنے اردگرد دیکھتے ہو، بشمول ان کے جو تمہیں پسند نہیں اور حتیٰ کہ وہ لوگ جنہیں تم ناپسند کرتے ہو یا ان سے متنفر رکھتے ہو، وہ سب کسی نہ کسی درجے میں تمہارے اپنے اندر موجود ہے۔ اس لیے شیطان کو بھی اپنے باہر تلاش نہ کرو۔ شیطان باہر سے حملہ آور ہونے والی کوئی غیر معمولی طاقت نہیں ہے۔ وہ تمہارے اندر ہی موجود معمولی آواز ہے۔ اگر تم خود کو پوری طرح جان لو، اپنے تاریک اور روشن رخ دونوں کا ایمانداری اور شدت سے سامنا کر لو تو تم شعور کی اعلیٰ ترین صورت کو پہنچ جاؤ گے۔ جب کوئی شخص خود کو جان لیتا ہے تو وہ اپنے رب کو پہچان لیتا ہے۔''

اپنی بانہیں اپنے سینے پر باندھتے ہوئے مخنث آگے کو جھکی اور دھمکی آمیز انداز میں آنکھیں

سکیڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔

''درویش جو طوائفوں کو تبلیغ کرتا ہے!'' وہ غرا کر بولی، ''میں تمہیں تنبیہ کرتی ہوں۔ میں تمہیں یہاں کسی کو اپنے احمقانہ خیالوں سے ستانے کی اجازت نہیں دوں گی۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے قحبہ خانے سے دور رہو! کیوں کہ اگر تم دور نہ رہے تو میں خدا کی قسم کھاتی ہوں کہ گیدڑ سر تمہاری تیز طرار زبان کاٹ دے گا اور میں اسے بڑی خوشی سے بھون کر کھاؤں گی۔''

ایلا

نارتھمپٹن، 28 مئی 2008ء

ایلا بیدار ہوئی تو اپنے معمول کے مزاج سے موزوں، اداس تھی۔ لیکن ناخوش اور اشک بار ہونے کی حد تک افسردہ نہیں، بس اتنی سی اداس کہ اُس کا دل مسکرانے اور معاملات کو ہلکا لینے کو نہ چاہ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ایسے سنگِ میل پر پہنچ گئی تھی جس کے لیے وہ تیار نہ تھی۔ وہ کچن میں کافی تیار کر رہی تھی، اُس نے دراز سے اپنے ممکنہ عزائم کی فہرست نکالی اور اُس کا جائزہ لیا۔

<u>چالیس برس کی عمر سے پہلے کرنے کو دس چیزیں:</u>

1- اپنی ٹائم مینجمنٹ بہتر کرو، منظم ہو جاؤ اور اپنے بیشتر وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے پُرعزم بنو۔ نیا ڈے پلانر خریدو۔ (مکمل)

2- اپنی خوراک میں منرل سپلیمنٹ اور اینٹی آکسی ڈینٹ شامل کرو۔ (مکمل)

3- جھریاں کم کرنے کے لیے کچھ کرو۔ الفا ہائیڈروکسی پراڈکٹس استعمال کرو اور نئی لوریال کریم استعمال کر کے دیکھو۔ (مکمل)

4- فرنیچر بدلو، نئے پودے خریدو، نئے کشن خریدو۔ (مکمل)

5- اپنی زندگی، اقدار اور عقائد کو جانچو۔ (نصف مکمل)۔

6- اپنی خوراک سے گوشت نکال دو۔ ہر ہفتے صحت بخش مینو بناؤ اور اپنے بدن کو وہ عزت واحترام دو جس کا یہ مستحق ہے (نیم مکمل)۔

7- رومی کی نظمیں پڑھنا شروع کرو۔ (مکمل)

8- بچوں کو براڈوے میوزیکل لے جاؤ۔ (مکمل)

9- کُک بک لکھنا شروع کرو۔ (نامکمل)

10- محبت کے لیے اپنا دل کشادہ کرو!!!

ایلا ساکت کھڑی رہ گئی، اُس کی نگاہیں فہرست کے دسویں آئٹم پر جمی تھیں۔ نہ جانتے ہوئے کہ اُس کے آگے مکمل لکھے یا کیا لکھے۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جب اُس نے وہ لکھا تھا تو اس کی مراد کیا تھی۔ وہ کیا سوچ رہی تھی؟ ''یہ ضرور دلکش کفر کا اثر ہوگا۔'' اس نے خود کلامی کی۔ اس کے بعد اُس نے خود کو اکثر محبت کے بارے میں سوچتے پایا۔

☼

ڈیئر عزیز،

آج میری سالگرہ ہے! مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اپنی زندگی کے کسی سنگ میل پر پہنچ گئی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ چالیس برس کا ہونا ایک اہم فیصلہ کن لمحہ ہوتا ہے، خصوصاً عورتوں کے لیے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ چالیس کا مطلب ہے ایک نیا تیس (اور ساٹھ ہے ایک نیا چالیس)، لیکن میں جتنا بھی اس سب پر یقین کرنا چاہتی ہوں، اتنا ہی مجھے یہ دور از خیال لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے، ہم کسے بے وقوف بنا رہے ہیں؟ چالیس، چالیس ہی ہے! میرا خیال ہے کہ اب میرے پاس سب کچھ ''زیادہ'' ہوگا... زیادہ علم، زیادہ دانش اور یقیناً زیادہ جھریاں اور سفید بال۔

سالگرہیں مجھے ہمیشہ خوشی دیتی ہیں لیکن آج صبح میں اپنے سینے میں بوجھل پن کے ساتھ بیدار ہوئی، کسی ایسے شخص کے لیے بڑے بڑے سوالات پوچھتے ہوئے جس نے ابھی صبح کی کافی تک نہ پی ہو۔ میں یہ سوچتی رہی کہ آیا جیسی زندگی میں اب تک گزارتی آئی تھی، آگے بھی اسی طرح جیے چلے جانا چاہتی ہوں؟

اور پھر مجھ پر ایک خدشہ بھرا احساس طاری ہوگیا۔ کیا ہو اگر ہاں اور نہیں دونوں صورتوں میں ایک ہی طرح کا تباہ کن نتیجہ نکلے؟ سو میں نے ایک اور جواب تلاش کر لیا: شاید!

دعا کے ساتھ

ایلا

پس تحریر: معذرت کہ میں ذرا خوش باش ای میل نہیں لکھ سکی۔ معلوم نہیں آج میں کیوں اتنی اداس اور مایوس ہوں۔ میں تمہیں وجہ نہیں بتا سکتی۔ (یعنی چالیس برس کی ہونے کے علاوہ، میرا خیال ہے کہ اسی کو لوگ وسط عمری بحران کہتے ہیں)۔

☼

ڈیئر ایلا،

سالگرہ مبارک! چالیس برس، مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے انتہائی خوب صورت عمر ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ صوفیوں کے نزدیک چالیس ایک مقام سے دوسرے پر چڑھنے اور روحانی بیداری کی علامت ہے؟ جب ہم ماتم کرتے ہیں تو ہم چالیس روز ماتم کرتے ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو

اُسے زمین پر زندگی کے آغاز کی تیاری میں چالیس دن لگتے ہیں۔ اور جب ہم محبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو ہمیں اپنے احساسات کے بارے میں پر یقین ہونے کے لیے چالیس روز چاہیے ہوتے ہیں۔

طوفانِ نوحؑ چالیس روز جاری رہا اور پانیوں نے جہاں زندگی ختم کر دی، وہیں انہوں نے ساری کثافت اور ناپاکی بھی دھو دی اور انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ نیا آغاز کر سکے۔ اسلامی صوفی ازم میں خدا اور بندے کے درمیان چالیس درجے ہوتے ہیں۔ اسی طرح شعور کے چار بنیادی مرحلے ہیں اور ہر ایک میں دس درجے ہیں، اس طرح مجموعی طور پر چالیس لیول بنتے ہیں۔ عیسیٰؑ چالیس دن اور رات کے لیے بیابانوں میں نکل گئے تھے۔ محمد ﷺ چالیس برس کے تھے جب اُنہیں نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ گوتم بدھ نے شجر لائم تلے چالیس روز مراقبہ کیا تھا۔ شمس تبریز کے چالیس اصولوں کا تذکرہ ایک طرف۔

چالیس برس کی عمر میں تم نیا مشن وصول کرتے ہو، زندگی کی ایک نئی لیز! تم ایک مبارک ترین عدد کو پہنچ گئی ہو۔ مبارک ہو! اور عمر بڑھنے کی فکر مت کرو۔ کوئی جھریاں اور سفید بال ایسے نہیں جو چالیس کی طاقت کا مقابلہ کر سکیں یا اُسے للکار سکیں!

گرم جوشی سے

عزیز

طوائف، گُلِ صحرا

قونیہ، 17 اکتوبر 1244ء

بھلا کب قحبہ خانے موجود نہ تھے، دنیا جب سے معرضِ وجود میں آئی ہے، یہ موجود ہی ہیں۔ اسی طرح مجھ جیسی عورتیں بھی۔ لیکن ایک بات مجھے ہمیشہ حیران کرتی ہے۔ کیوں ہے کہ وہی لوگ جو طوائفوں کو دیکھ کر ان سے متنفر ہوتے ہیں، وہی اُن طوائفوں کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں جو نادم ہو کر توبہ کر کے سب کچھ چھوڑ چھاڑ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہیں؟ یوں ہے جیسے وہ ہمیں بتا رہے ہوں کہ انہیں افسوس ہے کہ ہم اتنا گر گئی ہیں لیکن اب ہم جہاں ہیں، سدا وہیں رہنا چاہیے۔ معلوم نہیں کہ ایسا ہی کیوں ہے۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ کچھ لوگ دوسروں کی بدبختی اور مصائب پر خوش ہوتے ہیں اور انہیں پسند نہیں کہ دنیا میں کسی ایک بدبخت یا مصیبت زدہ کے حالات سنور جائیں۔ لیکن لوگ کچھ بھی کہیں یا کریں، میں ضرور کسی روز اس جگہ سے فرار ہو جاؤں گی۔

آج صبح میں اپنے دل میں یہ تمنا لیے بیدار ہوئی کہ میں مولانا رومی کا خطاب سنوں۔ اگر میں اس قحبہ خانے کی نائکہ کو سچ بتا کر اس کی اجازت لینا چاہتی تو وہ میرا خوب مذاق اڑاتی۔ ''یہ طوائفیں کب سے مسجد جانے لگیں؟'' وہ اتنی شدت سے ہنستے ہوئے کہتی کہ اس کا گول چہرہ قرمزی ہو جاتا۔

اسی لیے میں نے جھوٹ بولا۔ اُس بالوں سے عاری درویش کے جانے کے بعد نائکہ اس قدر گم سم سی محسوس ہوئی کہ مجھے لگا کہ جا کر اس سے بات کرنے کا وہی مناسب وقت تھا۔ جب وہ یوں خیالوں میں گم ہو تو اس سے زیادہ آسانی سے بات کی جا سکتی ہے۔ میں نے اس سے بازار سے کچھ ضروری چیزیں خریدنے کے بہانے اجازت لی۔ اس نے میرا یقین کر لیا۔ کسی کتے کی طرح نو برس سے اُس کے لیے کام کرنے کے بعد اب وہ میرا اعتبار کر ہی لیتی ہے۔

''البتہ ایک شرط ہے۔'' وہ بولی، ''سمسم تمہارے ساتھ جائے گا۔''

یہ ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ سمسم مجھے پسند تھا۔ جسمانی طور پر صحت مند مگر دماغی طور پر وہ ایک بچہ تھا

جو قابل بھروسا اور سادگی کی حد تک ایمان دار تھا۔ وہ اس سفاک دنیا میں کیسے زندہ رہ گیا، یہ بات میرے لیے ایک معمہ ہی تھی۔ کسی کو اس کا اصل نام معلوم نہ تھا، شاید خود اُس کو بھی نہیں۔ اُسے حلوہ بے حد پسند تھا، اس لیے ہم نے اسے یہ نام دیا تھا۔ جب بھی قحبہ خانے کی کسی طوائف کو باہر جانا ہوتا تو وہ اس کے ساتھ کسی خاموش سائے کی مانند جاتا۔ وہ ایسا بہترین محافظ تھا جس کی کبھی میں آرزو کر سکتی۔

ہم دونوں باغوں کے درمیان سے بل کھا کر گزرتی گرد سے اٹی راہ گزر پر روانہ ہو گئے۔
جب ہم پہلے دوراہے پر پہنچے تو میں نے سمسم کو وہیں رک کر انتظار کرنے کو کہا اور خود ایک جھاڑی کے پیچھے غائب ہو گئی جہاں میں نے مردانہ لباس والا تھیلا چھپا رکھا تھا۔

مردانہ لباس پہننا میری سوچ سے مشکل کام تھا۔ لمبے سرپوش کو اپنے سینے پر لپیٹ کر میں نے مردانہ بہروپ بھرا۔ پھر میں نے ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، بنیان اور اس کے اوپر لمبا قرمزی چغہ پہنا اور سر پر دستار باندھ لی۔ آخر میں نے اپنا نصف چہرہ ایک نقاب سے ڈھک لیا، اس امید میں کہ کسی عرب مسافر جیسی ہی دکھائی دوں۔

جب میں اوٹ سے باہر آئی تو سمسم پریشان دکھائی دیتے ہوئے بوکھلا سا گیا۔

''آؤ چلیں۔'' میں نے اسے کہا اور جب وہ بالکل ٹس سے مس نہ ہوا تو میں نے نقاب ہٹا دیا۔

''میرے پیارے، کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟''

''تم؟ تم گل صحرا ہو؟'' سمسم کسی بچے کی طرح مرعوب ہو کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے بولا، ''تم نے ایسا لباس کیوں پہنا ہے؟''

''کیا تم راز کو راز ہی رکھو گے؟''

جوش و خروش سے پھیلی آنکھوں کے ساتھ سمسم نے سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سرگوشی کی، ''ہم مسجد جا رہے ہیں۔ لیکن نائکہ کو یہ مت بتانا۔''

سمسم کا نچلا لب کپکپایا۔ ''نہیں... نہیں۔ ہم بازار جا رہے ہیں۔''

''ہاں، مگر بعد میں۔ پہلے ہم مولانا رومی کا وعظ سنیں گے۔''

سمسم ذرا کشمکش کا شکار ہوا۔ میں جانتی ہی تھی کہ وہ گھبرائے گا۔ اسے منصوبے میں تبدیلی پریشان کر رہی تھی۔ ''خدارا، میرے لیے یہ بہت اہم ہے۔'' میں نے التجا کی، ''اگر تم راضی ہو جاؤ اور وعدہ کرو کہ کسی کو نہیں بتاؤ گے تو میں تمہیں بہت سا حلوہ خرید کر دوں گی۔''

''حلوہ؟'' سمسم نے چٹخارہ بھرا، یوں جیسے صرف لفظ ہی سے اس کا منہ مٹھاس سے بھر گیا ہو۔

اور ایک شیریں توقع کے عالم میں ہم اُس مسجد کی طرف بڑھے جہاں مولانا روم خطاب کرنے والے تھے۔

☼

میں نیقیہ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئی۔ میری ماں مجھ سے ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ ''تم صحیح جگہ پیدا ہوئی تھیں مگر مجھے خدشہ ہے کہ تم کسی غلط ستارے کے سائے میں پیدا ہوئی ہو۔'' وقت برا تھا اور بے یقینی بھرا۔ ایک سال سے اگلے تک کچھ بھی پہلے جیسا نہ رہتا تھا۔ پہلے افواہیں گرم تھیں کہ صلیبی واپس لوٹ رہے تھے۔ ہم نے ان کی قسطنطنیہ میں لوٹ مار اور مظالم کی بھیانک داستانیں سنی تھیں، محلات میں لوٹ مار کی، گرجا گھروں اور کلیساؤں میں مجسمے توڑ ڈالنے کی۔ دوسری جانب ہم نے سلجوقی حملوں کا بھی سنا۔ اور اس سے پہلے کہ سلجوقی سپاہ کی دہشت کی خبریں دم توڑتیں، منگولوں کی سفاکی شروع ہو گئی۔ دشمن کا نام اور چہرہ بدل گیا مگر بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہی و بربادی کی دہشت کو وا ایدا پر جمی برف کی طرح قائم رہی۔

میرے والدین نانبائی اور عیسائی تھے۔ میری اوّلین یادوں میں سے ایک ہے تازہ روٹی کی خوشبو۔ ہم زیادہ امیر کبیر نہیں تھے۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی مگر اس حقیقت سے پھر بھی آشنا تھی۔ ہم اتنے غریب بھی نہ تھے۔ میں نے اُن غریبوں کی نگاہ کا کرب دیکھا تھا جو روٹی کے ٹکڑے مانگنے ہمارے تندور پر آیا کرتے تھے۔ ہر رات سونے سے قبل میں اپنے خدا کا شکر ادا کرتی کہ اس نے کم از کم مجھے بھوکا تو نہیں سونے دیا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے میں اپنے کسی دوست سے بات کرتی تھی۔ کیوں کہ تب خدا میرا دوست ہوا کرتا تھا۔

میری عمر سات برس تھی، جب میری ماں حاملہ ہوئی۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھوں تو لگتا ہے جیسے ان کا حمل کئی بار پہلے گرا ہوگا، لیکن تب میں ایسی باتوں سے نا آشنا تھی۔ میں اس قدر معصوم تھی کہ اگر تب کوئی مجھ سے پوچھتا کہ بچے کیسے اس دنیا میں آتے تھے تو میں کہتی کہ خدا انہیں نرم گندھے آٹے سے بناتا تھا۔

تاہم، خدا میری ماں کے لیے جو بچہ گوندھ کر تخلیق کر رہا ہوگا، وہ ضرور خاصا بڑا تھا کیوں کہ ماں کا جسم پھیلتا چلا گیا۔ ماں اتنی موٹی ہو گئی کہ وہ ٹھیک طرح سے ہل جل بھی نہ پاتی تھیں۔ دایہ نے بتایا کہ ان کے جسم میں پانی جمع ہوتا جا رہا تھا، لیکن مجھے یہ کوئی غلط بات نہ لگی۔

ایک بات جو میری ماں کو معلوم تھی نہ ہی ان کی دایہ کو، یہ کہ بچہ ایک نہیں بلکہ تین تھے۔ تینوں ہی لڑکے تھے۔ میرے بھائی میری ماں کی کوکھ میں جنگ لڑ رہے تھے۔ تینوں جڑواں میں سے ایک نے اپنی آنول سے دوسرے کا گلا گھونٹ دیا تھا، اور پھر جیسے انتقام لینے کو مردہ بچے نے رستہ روک دیا اور یوں پیدائش مشکل ہو گئی۔ میری ماں چار روز کرب و اذیت کے عالم میں رہی۔ دن رات ہم ان کی چیخیں سنتے رہے، یہاں تک وہ چیخیں سنائی دینا بند ہو گئیں۔

میری ماں کی جان بچانے میں ناکام ہو کر دایہ نے میرے بھائیوں کو بچانے کی پوری کوشش کی۔ لیکن اس دوران صرف ایک بچہ ہی زندہ بچ پایا۔ یوں میرے بھائی کی پیدائش ہوئی۔ میرے بابا نے اسے کبھی معاف نہ کیا اور جب بچے کو بپتسمہ دیا گیا تو وہ تقریب میں شریک بھی نہ ہوئے۔

ماں کی وفات اور باپ کے ایک تلخی بھرے آزردہ شخص میں ڈھل جانے کے بعد زندگی بالکل بھی پہلے جیسی نہ رہی۔ تندور کے حالات بھی تیزی سے خراب ہوتے چلے گئے۔ ہمارے گاہک کم ہوتے گئے۔ کسی روز غریب ہونے اور بھیک مانگنے سے خائف ہو کر میں روٹی اپنے بستر کے نیچے چھپانے لگی جہاں وہ خشک اور پھپھوندی زدہ ہو جاتی۔ لیکن اصل مصیبت میرے بھائی نے جھیلی۔ مجھ سے تو کم از کم ماضی میں محبت کی جاتی اور میرا خیال رکھا جاتا رہا تھا۔ اسے یہ سب پیار کبھی نہ ملا۔ اپنے بھائی سے برا سلوک ہوتے دیکھ کر میرا دل ٹوٹ جاتا تھا اور پھر بھی میرا کوئی حصہ شکر ادا کرتا کہ اپنے باپ کے غصے کا ہدف بننے والی میں نہیں تھی۔ کاش میں نے اپنی بھائی کی حفاظت کی ہوتی۔ تب حالات مختلف ہوتے اور میں آج تو یہ کے قحبہ خانے میں نہ ہوتی۔ زندگی بہت عجیب ہے۔

ایک سال بعد میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ میرے بھائی کی زندگی میں صرف یہ فرق آیا کہ پہلے اس سے برا سلوک صرف بابا کرتے تھے اور اب ان کی نئی بیوی بھی اس میں حصہ ڈالنے لگی۔ وہ گھر سے بھاگنے لگا اور ہر بار بدتر عادتوں اور برے دوستوں کے ساتھ ہی واپس آتا۔ ایک روز میرے باپ نے اسے اتنا مارا پیٹا کہ اس کی تقریباً جان ہی لے لی۔ اس کے بعد اس کا روپ ہی بدل گیا۔ اس کی نگاہ ایسی سرد اور بے رحم ہو گئی جو پہلے کبھی نہ تھی۔ میں جانتی تھی کہ اس کے دماغ میں کچھ تھا لیکن مجھے کبھی خیال تک نہ آیا کہ وہ کیسا دہشت انگیز منصوبہ بنا رہا تھا۔ کاش کہ میں جانتی۔ کاش کہ میں اُس اکیلے کو روک پاتی۔

پھر موسم بہار کی ایک صبح میرا باپ اور سوتیلی ماں مُردہ حالت میں ملے، انہیں چوہے مار زہر سے ہلاک کیا گیا تھا۔ لوگوں کو جیسے ہی اس حادثے کی خبر ہوئی، ہر کسی کا شک فوراً میرے بھائی کی جانب گیا۔ جب سپاہیوں نے سوالات پوچھنا شروع کیے تو وہ گھبرا کر بھاگ اٹھا۔ میں نے اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔ اور اس طرح میں اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔ گھر میں ٹھہرنے کے ناقابل جہاں مجھے اب بھی اپنی ماں کی خوشبو آتی تھی، تندور میں کام کرنے کے ناقابل جہاں کی فضا میں پریشان کن یادیں منڈلاتی تھیں، میں نے قسطنطنیہ جا کر اپنی ایک بوڑھی غیر شادی شدہ خالہ کے پاس رہنے کا فیصلہ کیا جو اَب میری قریب ترین رشتے دار تھیں۔ میری عمر تب صرف تیرہ برس تھی۔

میں قسطنطنیہ جانے کی خاطر ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہوئی، میں سب سے کم عمر مسافر تھی اور واحد جو تنہا سفر کر رہی تھی۔ چند گھنٹوں کے سفر کے بعد ہمیں ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے روک لیا۔ انہوں نے مسافروں سے سب کچھ لوٹ لیا، صندوق، کپڑے، جوتے، زیورات، حتیٰ کہ گاڑی بان کا کھانا بھی لوٹ لے گئے۔ میرے پاس انہیں دینے کو کچھ بھی نہ تھا، میں ایک طرف خاموشی سے کھڑی رہی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ لیکن جب وہ جانے کو ہی تھے کہ یکا یک ان کا سرغنہ میری طرف مڑا اور پوچھا، ''کیا تم کنواری ہو، اے حسینہ؟''

میں سرخ پڑ گئی اور ایسے نامناسب سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا

کہ میرا سرخ پڑنا ہی وہ جواب تھا جو وہ چاہتا تھا۔

''آؤ چلیں!'' ڈاکوؤں کا سرغنہ چلایا، ''گھوڑے اور لڑکی ساتھ لے چلو!''

جب میں روتے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی تو کسی مسافر نے میری مدد کی کوشش نہ کی۔ ڈاکو مجھے جنگل میں لے گئے جہاں مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے پورا گاؤں بسا رکھا تھا۔ وہاں عورتیں اور بچے تھے۔ ہر طرف بطخیں، بکریاں اور سؤر تھے۔ وہ ایک دلکش گاؤں دکھائی دیتا تھا، ماسوائے اس کے کہ وہاں مجرم بستے تھے۔

جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ ڈاکوؤں کے سرغنہ نے یہ کیوں پوچھا تھا کہ میں کنواری تھی۔ گاؤں کا سردار کسی شدید اعصابی بخار میں مبتلا تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے علیل تھا اور اس کے سارے جسم پر سرخ دھبے نمودار ہو چکے تھے، اس کا بہت علاج کیا گیا مگر بے سود۔ حال ہی میں کسی نے اُسے قائل کیا تھا کہ اگر وہ کسی کنواری لڑکی سے قربت رکھے تو اس کی بیماری اس لڑکی میں منتقل ہو جائے گی اور وہ صحت یاب ہو جائے گا۔

میری زندگی کی کچھ بھیانک یادیں ہیں جنہیں میں کبھی نہیں دہرانا چاہتی۔ جنگل میں گزرے میرے وہ ایام بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ حتیٰ کہ آج بھی جب میرے ذہن میں جنگل کا خیال آتا ہے تو میں صنوبر کے درختوں کا تصور کرتی ہوں۔ میں عورتوں کے ساتھ جنگل میں ان درختوں تلے بیٹھنے کو ترجیح دیا کرتی تھی، بیشتر عورتیں ان ڈاکوؤں کی بیویاں تھیں یا بیٹیاں۔ وہاں پر کئی طوائفیں بھی تھیں جو اپنی خوشی سے آئی تھیں۔ میں کبھی سمجھ نہیں پائی کہ وہ بھاگتی کیوں نہ تھیں۔ میں تو وہاں سے فرار کے لیے بے تاب تھی۔

جنگل سے اکثر بگھیاں گزرا کرتی تھیں، جن میں سے زیادہ تر شرفا کی ہوتیں۔ میرے لیے یہ بڑی پُراسرار بات تھی کہ انہیں لوٹا نہ جاتا تھا، پھر مجھے معلوم ہوا کہ ان کے گاڑی بان ڈاکوؤں کو رشوت دیتے تھے کہ انہیں وہاں سے بہ حفاظت گزرنے دیا جائے۔ ایک بار سب کچھ جان لینے کے بعد میں نے وہاں سے فرار کی منصوبہ بندی کی۔ بڑے شہر جاتی ایک بگھی کو روک کر میں نے اس کی کوچوان سے التجا کی کہ مجھے ساتھ لے چلے۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ میرے پاس کچھ نہ تھا، پھر بھی اس نے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ میں نے مجبوراً ادائیگی اُسی ایک طریقے سے کی جس سے میں واقف تھی۔

قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد ہی مجھے سمجھ آسکی کہ جنگل میں طوائفیں وہاں سے بھاگتی کیوں نہ تھیں۔ شہر بدتر تھا۔ شہر سفاک اور بے رحم تھا۔ میں نے اپنی بوڑھی خالہ کو بھی تلاش نہ کیا۔ اب جب کہ میں اپنے مقام سے گر چکی تھی، میں جانتی تھی کہ اُن جیسی شریف خاتون مجھے کبھی ساتھ نہ رکھنا چاہتی۔ میں تن تنہا تھی۔ شہر کو میری روح کو کچلنے اور میرے جسم کو برباد کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ اچانک میں ایک بالکل مختلف دنیا میں تھی... بغض و عداوت، عصمت دری، سفاکی اور بیماری کی دنیا۔ میرے لگاتار اسقاطِ حمل ہوئے، یہاں تک میں اب میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔

میں نے ان گلیوں میں وہ کچھ دیکھا جو میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس شہر کو خیر باد کہنے کے بعد میں نے سپاہیوں، اداکاروں اور خانہ بدوشوں کے ساتھ سفر کیا، سب کی ضرورتیں پوری کرتے ہوئے۔ پھر گیدڑ سر نامی ایک شخص نے مجھے تلاش کرلیا اور قونیہ کے اس قحبہ خانے میں لے آیا۔ نائکہ کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ میں کہاں سے آئی تھی، جب تک کہ میری صورت اچھی تھی۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے اب بچے نہیں ہو سکتے اور یوں اُسے اس سلسلے میں اب کسی مسئلے کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ میرے بانجھ پن کی نسبت سے اُس نے میرا نام ''صحرا'' رکھ دیا اور اس نام کو کسی طور سجانے کو اُس نے اِس میں ''گل'' کا اضافہ کر دیا، جو مجھے اچھا لگا کیوں کہ مجھے گلاب کے پھول پسند تھے۔

''ایمان'' کے بارے میں بھی میں ایسا ہی سوچتی ہوں... گلابوں کا کوئی مخفی باغ جہاں میں کبھی گھومتی پھرتی اور اس کی خوشبوؤں سے محظوظ ہوتی تھی مگر اب وہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ خدا ایک بار پھر میرا دوست بن جائے۔ اس آرزو کے ساتھ میں اس باغ کا طواف کرتی ہوں، داخلی دروازے کی جستجو میں، ایسے در کی تلاش میں جو خود کو مجھ پر وا کر دے۔

☼

جب سمسم اور میں مسجد پہنچے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ ہوا۔ ہر گوشے میں ہر عمر اور ہر پیشے سے تعلق رکھنے والے مرد موجود تھے، حتیٰ کہ عقب میں موجود جگہ پر بھی جو عموماً عورتوں کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ میں جگہ کی تلاش میں ہار مان کر باہر نکلنے کو ہی تھی جب میں نے ایک فقیر کو اپنی نشست چھوڑ کر باہر نکلتے دیکھا۔ اپنی خوش نصیبی کا شکر کرتے ہوئے میں سمسم کو باہر ہی چھوڑ کر اس جگہ پر جا بیٹھی۔

یوں میں نے خود کو مردوں سے بھری مسجد میں مولانا رومی کا خطبہ سنتے پایا۔ میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ ان کے درمیان ایک عورت موجود تھی تو کیا ہو سکتا تھا، کجا کہ ایک طوائف۔ تمام تاریک سوچوں کو بھگا کر میں نے اپنی پوری توجہ خطبے پر مرکوز کر دی۔

''خدا نے مصائب کو تخلیق کیا تا کہ اس کے متضاد خوشی ابھر سکے۔'' مولانا رومی نے کہا، ''چیزیں اپنے متضاد کے ذریعے ہی عیاں و آشکار ہوتی ہیں۔ چوں کہ خدا کا کوئی متضاد نہیں، اس لیے وہ مخفی رہتا ہے۔''

خطاب کے دوران مبلغ کی آواز بلند ہوئی اور پگھلتی برف سے بھرتی پہاڑی ندی کی طرح گمبھیر ہوتی چلی گئی۔ ''زمین کی پستی اور آسمانوں کی رفعت پر نظر کریں۔ جان لیں کہ دنیا کی تمام حالتیں اسی طرح ہیں: سیلاب اور خشک سالی، امن اور جنگ۔ کچھ بھی ہو، کبھی فراموش مت کریں کہ اللہ نے کچھ بھی رائیگاں تخلیق نہیں کیا، چاہے وہ طیش ہو یا تحمل، ایمان داری ہو یا مکر و فریب۔''

وہاں بیٹھے میں نے جانا کہ کچھ بھی حکمت کے بغیر نہیں۔ میری ماں کا حمل اور اُن کی کوکھ میں جنگ، میرے بھائی کا ناقابلِ رفع اکیلا پن، حتیٰ کہ میرے باپ اور سوتیلی ماں کا قتل، جنگل میں میرے

بھیانک ایام، اور یہاں تک کہ وہ سفاکی جو میں نے قسطنطنیہ کی گلیوں میں دیکھی... اُن سب نے اپنے اپنے طور پر میری زندگی کی کہانی میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ میں اسے پوری طرح بیان تو نہ کرسکتی تھی مگر میں اسے اپنے پورے دل سے محسوس ضرور کرسکتی تھی۔ اس سہ پہر کھچا کھچ بھری مسجد میں مولانا رومی کا خطبہ سنتے ہوئے مجھے خود پر سکون و آشتی کا ایک بادل سایہ فگن ہوتا محسوس ہوا، اتنا ہی پُرمسرت اور سکون بخش جیسے میری ماں کے ہاتھ سے پکتی روٹیوں کا نظارہ۔

حسن گداگر

قونیہ، 17 اکتوبر 1244ء

بیزاری، کوفت اور جھنجلاہٹ سے بھرا میں مینپل کے درخت تلے جا بیٹھا۔ میں مولانا رومی کی مصائب پر زرق برق تقریر سے اُن پر خفا رہا... ایک ایسا موضوع جس کے بارے میں وہ واضح طور پر زیادہ نہ جانتے تھے۔ مینار کا سایہ گلی میں آگے بڑھتا رہا۔ تقریباً اونگھتے ہوئے، راہگیروں پر اپنی نیم وا نظریں جمائے، میں سونے ہی والا تھا جب مجھے اس درویش کی صورت دکھائی دی جسے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کالے چیتھڑوں میں ملبوس اپنے ہاتھ میں ایک لمبا عصا تھامے، اُس کے چہرے پر کوئی بال نہ تھے اور ایک کان میں چاندی کی ایک چھوٹی سی بالی تھی، وہ اس قدر مختلف دکھائی دیا کہ میں خود کو اس پر نظریں جمانے سے روک نہ پایا۔

جب اُس کی نگاہیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں، درویش کو مجھ پر توجہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ میری موجودگی کو نظرانداز کرنے کی بجائے، جیسا کہ مجھے پہلی بار دیکھنے والے لوگ ہمیشہ کرتے تھے، اُس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے دل کے مقام پر رکھا اور مجھے یوں سلام کیا جیسے ہم دونوں کوئی پرانے دوست تھے۔ میں اِس قدر ہکا بکا رہ گیا کہ میں نے اس یقین دہانی کو اپنے اردگرد نظر دوڑائی کہ وہ کہیں کسی دوسرے کو تو سلام نہ کر رہا تھا۔ لیکن وہاں صرف میں تھا یا پھر مینپل کا درخت۔ اگرچہ میں بدحواس اور الجھن میں تھا، میں نے اپنا ہاتھ دل کے مقام پر رکھا اور اس کے سلام کا جواب دیا۔

درویش آہستہ آہستہ میری جانب بڑھا۔ میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں، اس توقع میں کہ ابھی وہ میرے کشکول میں تانبے کا سکہ اچھالے گا یا پھر مجھے روٹی کا ٹکڑا دے گا۔ لیکن اس کی بجائے وہ میری نگاہوں کی سطح تک جھک گیا۔

''سلام علیکم، گداگر۔'' اُس نے کہا۔

''وعلیکم سلام درویش۔'' میں نے جواب دیا۔ میری آواز خود مجھے عجیب اور بھرائی ہوئی لگی۔

ایک لمبا عرصہ گزر چکا تھا جب سے مجھے کسی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی کہ مجھے تقریباً بھول ہی چکا تھا کہ میری آواز تھی کیسی۔

اُس نے اپنا نام شمس تبریز بتایا اور میرا نام پوچھا۔

میں ہنس دیا۔ ''مجھ جیسے آدمی کو کسی نام کی کیا ضرورت؟''

''ہر کسی کا کوئی نام ہوتا ہے۔'' اُس نے اعتراض کیا۔ ''خدا کے لاتعداد نام ہیں، جن میں سے ہم صرف ننانوے نام جانتے ہیں۔ اگر خدا کے اتنے بہت سے نام ہیں تو کوئی انسان جو کہ اُس ذاتِ باری تعالیٰ کا عکس ہے، بے نام کیسے ہو سکتا ہے؟''

مجھے معلوم نہ تھا کہ اس بات کا کیا جواب دوں اور یوں میں نے جواب دینے کی کوشش بھی نہ کی۔ اس کی بجائے میں نے تسلیم کیا، ''کبھی میری ایک بیوی اور ایک ماں تھی۔ وہ مجھے حسن کہا کرتی تھیں۔''

''حسن نام ہے پھر۔'' درویش نے سر ہلایا۔ پھر مجھے حیرانی ہوئی کہ اُس نے مجھے ایک نقرئی آئینہ دیا۔ ''اسے رکھ لو۔'' اُس نے کہا، ''یہ بغداد کے ایک نیک آدمی نے مجھے دیا تھا لیکن تمھیں مجھ سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔ یہ تمھیں یاد دلائے گا کہ خدا تمہاری رگِ جاں سے بھی قریب ہے۔''

اس سے پہلے کہ مجھے جواب میں کچھ کہنے کا موقع ملتا، پسِ منظر میں ہنگامہ سا اٹھا۔ پہلا خیال جو مجھے آیا، یہ تھا کہ مسجد میں کوئی جیب تراش پکڑا گیا تھا۔ لیکن جب چیخیں بلند تر ہوتی گئیں اور اُن میں شدت آتی گئی تو میں سمجھ گیا کہ کوئی بڑی بات ہوئی تھی۔ کوئی جیب تراش اس قدر شور و غوغا نہ کرتا۔

ہمیں جلد ہی معلوم ہو گیا۔ ایک عورت، ایک مشہور طوائف، مسجد میں مردانہ حلیے میں پکڑی گئی تھی۔ لوگوں کا ایک گروہ اُسے یہ چلاتے ہوئے دھتکار کر باہر نکال رہا تھا، ''اس دغاباز کو دُرّے لگاؤ! طوائف کو دُرّے لگاؤ!''

اس حالت میں مشتعل ہجوم گلی میں نکل آیا۔ مجھے مردانہ لباس میں ملبوس ایک عورت کی جھلک دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر موت کی سی زردی تھی اور اُس کی بادامی آنکھیں دہشت زدہ تھیں۔ میں نے پہلے کئی لوگوں کو گھیر کر مارے جاتے دیکھا تھا۔ میری اس بات پر حیرت کبھی ختم نہ ہوئی کہ لوگ ہجوم میں شامل ہو کر کیسے ڈرامائی طور پر بدل جاتے تھے۔ عام آدمی جو ماضی میں کبھی شدت پسند نہ رہے ہوتے تھے... کاریگر، پھیری والے یا ٹھیلے والے... جب آپس میں مل جاتے تو قتل کرنے کی حد تک جارح ہو جاتے تھے۔ ہجوم کے ہاتھوں ہلاکتیں عام تھیں اور ان کے آخر میں دوسروں کی تنبیہ کے لیے لاشوں کو نمائش کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔

''بے چاری عورت!'' میں نے شمس تبریز سے آہستہ سے کہا لیکن جب میں جواب کے لیے اُس کی طرف مڑا تو وہاں کوئی کھڑا نہ تھا۔

مجھے کمان سے نکلے کسی آتشیں تیر کی طرح ہجوم کی طرف لپکتے درویش کی جھلک دکھائی دی۔

میں اچھل کر کھڑا ہوا اور اس کی طرف لپکا۔

جب شمس تبریز اُس جلوس کے سر پر پہنچے تو انہوں نے اپنا عصا کسی علم کی طرح بلند کر لیا اور پوری طاقت سے چلائے، ''رکو لوگو! رک جاؤ!''

ہکا بکا اور یک دم خاموش ہو کر لوگ حیرت سے اُنہیں گھورنے لگے۔

''تم سب کو شرم آنی چاہیے!'' شمس تبریز نے اپنی لاٹھی زمین پر مارتے ہوئے کہا، ''ایک عورت کے خلاف تیس مرد۔ کیا یہ انصاف ہے؟''

''یہ انصاف کی حق دار نہیں۔'' چوکور چہرے، بھینگی آنکھوں والے ہٹے کٹے آدمی نے کہا جو اس وقت بپے گروہ کا خود ساختہ سرغنہ لگتا تھا۔ میں اُسے فوراً ہی پہچان گیا۔ وہ بیبرس نامی محافظ تھا، ایک ایسا شخص جسے شہر کے تمام گداگر اُس کے بے رحمی اور حرص وطمع کے حوالے سے جانتے تھے۔

''یہ عورت، اس نے مردوں کا سا لباس پہنا اور نیکوکار مسلمانوں کو دھوکا دینے کی خاطر مسجد میں گھس آئی۔'' بیبرس نے کہا۔

''کیا تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ تم کسی شخص کو مسجد میں آنے کے باعث سزا دینا چاہتے ہو؟ کیا یہ جرم ہے؟'' شمس تبریز نے پوچھا۔ اُن کا لہجہ استہزا سے بھرا ہوا تھا۔

اس سوال پر عارضی طور پر خاموشی چھا گئی۔ بہ ظاہر کسی نے اِس طرح سے نہیں سوچا تھا۔

''یہ ایک طوائف ہے!'' ایک اور آدمی چلایا، جو اس قدر مشتعل دکھائی دیتا تھا کہ اُس کا چہرہ گہرے سرخ رنگ کا ہو چکا تھا۔ ''آؤ اس طوائف کو سزا دیں!''

یوں جیسے یہ کوئی حکم تھا، ایک لڑکا چھلانگ لگا کر آگے بڑھا اور عورت کی پگڑی پکڑی اور اُسے جھٹک کر پوری طاقت سے کھینچنے لگا۔ پگڑی ڈھیلی ہوئی اور عورت کے سورج مکھی کے سے رنگ کے لمبے سنہری بال، دل فریب لہروں کی صورت کھل گئے۔ اس کی نوجوانی اور حُسن پر دم بہ خود ہو کر ہم سب نے اپنی سانسیں روک لیں۔

شمس تبریز ماحول میں موجود ملے جلے احساسات کو پہچان گئے ہوں گے کیوں کہ ایک لحظہ بھی ضائع کیے بغیر انہوں نے لوگوں کو سرزنش کی، ''تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا بھائیو۔ تم واقعی اس عورت سے نفرت کرتے ہو یا درحقیقت تم اس کی چاہ رکھتے ہو؟''

یہ کہتے ہوئے درویش نے طوائف کا ہاتھ تھاما اور اُسے اُس نوجوان لڑکے اور ہجوم سے پرے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اُن کے پیچھے چھپ گئی، کسی ننھی بچی کی طرح جو اپنی ماں کے لباس کے پیچھے چھپ رہی ہو۔

''تم بڑی غلطی کر رہے ہو۔'' گروہ کے سرغنہ نے اپنی آواز ہجوم کی بڑبڑاہٹ سے بلند کرتے ہوئے کہا، ''تم اس شہر میں اجنبی ہو اور ہمارے طور طریقے سے واقف نہیں ہو۔ اس معاملے سے دُور

رہو۔''

ایک دوسرے شخص نے دخل دیا۔ ''تم کس قسم کے درویش ہو؟ کسی طوائف کے مفادات کے دفاع سے بہتر تمہارے پاس کرنے کو کچھ نہیں؟''

شمس تبریز لمحے بھر کو خاموش ہو گئے، یوں جیسے سوال پر غور کر رہے ہوں۔ انہوں نے بالکل پرسکون رہتے ہوئے کوئی اشتعال نہ دکھایا۔ پھر وہ بولے، ''لیکن تمہاری اس پر توجہ گئی کیسے؟ تم مسجد جاتے ہو مگر خدا سے زیادہ آس پاس لوگوں پر توجہ دیتے ہو؟ اگر تم اچھے مسلمان ہوتے، جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو تمہاری توجہ اس عورت پر کبھی نہ جاتی، چاہے یہ بالکل برہنہ ہی ہوتی۔ اب جاؤ اور وعظ سنو اور اس بار بہتر طریقے سے سننا۔''

پوری گلی پر ایک بے ڈھنگی سی خاموشی چھا گئی۔ اطراف کے راہ گیروں کے راستے پر پتے سرسرائے اور لمحے بھر کو حرکت میں آنے والی شے صرف وہی پتے تھے۔

''چلو، تم سب! بھاگو واپس، وعظ سننے جاؤ۔'' شمس تبریز نے اُن آدمیوں کو مکھیوں کی طرح پرے ہٹانے کو اپنی لاٹھی گھمائی۔

لوگ مڑ کر واپس تو نہ گئے مگر انہوں نے چند الٹے قدم ضرور اٹھائے، ڈگمگاتے ہوئے، یوں جیسے الجھن میں ہوں کہ اب کیا کریں۔ اُن میں سے چند ایک مسجد کی سمت دیکھ رہے تھے جیسے واپس جانے کا سوچ رہے ہوں۔ عین اُسی وقت طوائف نے درویش کے پیچھے سے نکلنے کا حوصلہ جمع کیا۔ کسی خرگوش کی سی پھرتی سے وہ کھڑی ہوئی اور قریب ترین گلی میں گھسنے سے پہلے اُس کے لمبے بال ہر سمت میں اڑے جا رہے تھے۔

صرف دو لوگوں نے اُس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن شمس تبریز نے اُن کا راستہ روک لیا اور یوں اچانک ان کے پیروں میں اپنی لاٹھی اٹکا دی اور گھمائی کہ وہ اس میں الجھ کر گر پڑے۔ کچھ راہ گیر یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑے اور میں بھی۔

خجل اور حواس باختہ دونوں آدمی اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑے ہوئے لیکن تب تک طوائف کب کی غائب ہو چکی تھی اور درویش بھی جا رہا تھا، اُس کا یہاں کام ختم ہو چکا تھا۔

سلیمان مدہوش

قونیہ، 17 اکتوبر 1244ء

بڑھتے ہنگامے سے پہلے میں مے خانے کی دیوار سے ٹیک لگائے آرام سے اونگھ رہا تھا۔ پھر اچانک باہر سے آتے شوروغوغا پر میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' آنکھیں کھلتے ہی میں چیخا، ''کیا ہم پر منگولوں نے حملہ کر دیا ہے؟''

ہنسی کا فوارہ پھوٹا۔ مڑا تو میں نے کئی گاہکوں کو اپنا مذاق اڑاتے دیکھا۔ غلیظ حرامی!

''تم فکر مت کرو، بوڑھے شرابی!'' مے خانے کا مالک ہرستوس پکار کر بولا، ''کوئی منگول تمہارے تعاقب میں نہیں آ رہا۔ اپنے مداحوں کی فوج کے ساتھ مولانا روم گزر رہے تھے۔''

میں اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور باہر جھانکا۔ یقیناً وہ یہیں تھے... شاگردوں اور مداحوں کا ایک پرجوش جلوس متواتر نعرے لگا رہا تھا، ''اللہ اکبر! اللہ اکبر!'' ان کے درمیان سفید گھوڑے کی پشت پر سوار، طاقت اور اعتماد چھلکاتی ستواں شخصیت مولانا رومی کی ہی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول کر اپنا سر باہر نکالا اور انہیں دیکھا۔ کسی گھونگھے کی سی رفتار سے حرکت کرتا جلوس قریب آ گیا۔ درحقیقت ہجوم کے کچھ لوگ تو اتنے قریب تھے کہ میں بہ آسانی ان کے سروں کو چھو سکتا تھا۔ اچانک مجھے ایک شاندار خیال آیا۔ میں کچھ لوگوں کی پگڑیاں اور دستاریں جھپٹنے والا تھا!

میں نے لکڑی کا کمر پر خارش کرنے والا ڈنڈا اٹھایا جو ہرستوس کی ملکیت تھا۔ ایک ہاتھ سے کھڑکی کھول کر اور دوسرے ہاتھ میں ڈنڈا لیے میں آگے کو جھکا اور ہجوم میں ایک شخص کی پگڑی تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ میں اس کی پگڑی کھینچنے والا ہی تھا کہ ایک شخص نے بے توجہی سے اوپر نظر اٹھائی اور مجھے دیکھ لیا۔

''سلام علیکم۔'' میں نے ایک سے دوسرے کان تک پھیلی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا۔

''مے خانے میں مسلمان! تمہیں شرم آنی چاہیے!'' وہ آدمی گرجا، ''کیا تم جانتے نہیں کہ

شراب شیطان کے ہاتھوں بنتی ہے؟''

میں نے جواب دینے کے لیے اپنا منہ کھولا مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی آواز نکالتا، میرے سر کے پاس سے شوں سے کوئی تیز چیز گزری۔ مجھے دہشت سے ادراک ہوا کہ وہ پتھر تھا۔ اگر میں آخری لمحے ذرا جھک نہ گیا ہوتا تو وہ میری کھوپڑی پھاڑ چکا ہوتا۔ اس کی بجائے وہ کھلی کھڑکی سے گزر کر میرے پیچھے بیٹھے ایرانی تاجر کی میز پر جا گرا۔ تاجر نشے میں اس قدر بدمست تھا کہ سمجھ ہی نہ پایا کہ ہوا کیا تھا، اس نے پتھر اپنے ہاتھ میں لیا اور اُس کا یوں جائزہ لینے لگا جیسے وہ آسمانوں سے بھیجا گیا کوئی مبہم پیغام ہو۔

''سلیمان، کھڑکی بند کرو اور اپنی میز پر واپس جاؤ۔'' ہرسٹوس نے دھاڑ کر کہا۔ اُس کی آواز مارے تشویش کے بھرائی ہوئی تھی۔

''تم نے دیکھا، ابھی کیا ہوا ہے؟'' اپنی میز کی طرف لڑکھڑا کر جاتے ہوئے میں نے کہا، ''کسی نے میری طرف پتھر اچھالا۔ وہ میری جان لے سکتے تھے!''

ہرسٹوس نے بھنویں اچکائیں۔ ''مجھے افسوس ہے، مگر تم کیا توقع کر رہے تھے؟ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ کچھ لوگ کسی مسلمان کو کسی مے خانے میں نہیں دیکھنا چاہتے؟ اور تم یہاں اپنے منہ میں شراب کی بُو لیے اور کسی سرخ لالٹین کی طرح چمکتی اپنی ناک کے ساتھ اپنی نمائش کر رہے ہو۔''

''ت... ت... تو کیا ہوا؟'' میں ہکلایا، ''کیا میں انسان نہیں؟''

ہرسٹوس نے میرے شانے پر تھپکی دی جیسے کہتا ہو، اتنے جذباتی مت بنو۔

''تم جانتے ہو، یہی وجہ ہے کہ مجھے مذہب ناگوار گزرتا ہے۔ ہر قسم کے مذہب! مذہبی لوگ اس قدر پُراعتماد ہوتے ہیں کہ خدا اُن کی طرف ہے کہ وہ سوچتے ہیں کہ وہ ہر کسی سے برتر ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہرسٹوس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مذہبی تھا، لیکن مے خانے کا تجربہ کار مالک بھی تھا جو جانتا تھا کہ کسی برہم اور خفا گاہک کو کیسے ٹھنڈا یا پُرسکون کرے۔ وہ میرے لیے مے سرخ کی اور ایک صراحی لایا اور مجھے وہ چڑھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ باہر کھڑکیوں کو زور سے بجاتی اور خشک پتوں کو دائیں بائیں بکھیرتی ہوئی تیز ہوا چلنے لگی۔ لمحے بھر کو ہم ساکت کھڑے رہ گئے، غور سے سنتے یوں جیسے سننے کو کوئی دُھن تھی۔

''مجھے نہیں معلوم کہ اس دنیا میں شراب ممنوع کیوں کی گئی لیکن جنت میں اسے دینے کا وعدہ کیا گیا۔'' میں نے کہا، ''اگر یہ اتنی ہی بری ہے جتنا لوگ دعویٰ کرتے ہیں تو اسے جنت میں کیوں پیش کیا جائے گا؟''

''سوالات، سوالات...'' ہرسٹوس اپنے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بڑبڑایا، ''تم ہمیشہ سوالوں سے بھرے رہتے ہو۔ کیا تمھیں ہر شے کے بارے میں سوال کرنے ہوتے ہیں؟''

''یقیناً میں کرتا ہوں سوال۔ ہمیں دماغ اسی لیے بخشا گیا تھا۔ کیا تمھارا یہی خیال نہیں۔''

''سلیمان، میں تمہیں ایک عرصے سے جانتا ہوں۔تم میرے لیے کوئی گاہک نہیں ہو بلکہ تم میرے دوست ہو۔اور مجھے تمہاری فکر ہوتی ہے۔''

''میں ٹھیک رہوں گا...'' میں نے کہا مگر ہرسٹوس نے میری بات کاٹ دی۔

''تم ایک اچھے آدمی ہو لیکن تمہاری زبان کسی خنجر کی طرح تیز ہے۔ مجھے اسی کی فکر ستاتی ہے۔قونیہ میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ اور یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ اُن میں سے کچھ لوگ ایسے کسی مسلمان کو اچھا نہیں سمجھتے جو مے نوشی کرتا ہو۔ تمہیں لوگوں کے درمیان محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔اپنے طور طریقے کھلے عام مت دکھاؤ اور دیکھ بھال کر بولا کرو۔''

میں نے دانت نکالے۔''کیا ہم اِس تقریر کے آخر میں خیام کی نظم سنا سکتے ہیں؟''

ہرسٹوس نے گہری سانس بھری مگر ایرانی تاجر جس نے اتفاقاً میری بات سن لی تھی، بے ساختہ خوشی سے بولا،''ہاں، ہمیں خیام کی نظم چاہیے۔''

دوسرے گاہک بھی آشریک ہوئے اور تالیاں بجا کر مجھے داد دی۔ تحریک اور کسی قدر اکساہٹ میں آ کر میں میز پر چڑھا اور سنانے لگا:

''کیا خدا نے انگور پروان چڑھائے،تمہارا کیا خیال ہے،
اور اسی وقت مے نوشی کو گناہ بھی قرار دے دیا؟''

ایرانی تاجر پکارا،''بالکل نہیں! یہ بات عقل میں ہی نہیں آتی!''

''اُس کا شکریہ ادا کرو جس نے اسے یوں پہلے سے ہی مقدر میں لکھا...
یقیناً اُسے جام ٹکرانے کی آواز پسند ہے!''

اگر اتنے برسوں کی مے نوشی میں کوئی بات میں نے سیکھی تھی تو یہ کہ مختلف لوگ مختلف طرح سے مے نوشی کرتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہر شب سیروں کے حساب سے چڑھا جاتے ہیں اور بس خوش ہوتے، گیت گاتے ہیں اور پھر گر کر اونگھ جاتے ہیں۔ پھر ایسے دوسرے لوگ بھی ہیں جو چند قطرے پی کر عفریت بن جاتے ہیں۔اگر ایک ہی مشروب کسی کو خوش اور مدہوش کر دیتا ہے اور دوسروں کو جارح اور فاسق بنا دیتا ہے، تو کیا ہمیں مشروب کی بجائے پینے والوں کو ذمے دار نہیں ٹھہرانا چاہیے؟

''پیو! کیوں کہ تم نہیں جانتے کہ تم کدھر سے آئے اور کیوں،
پیو! کہ تم نہیں جانتے تم کیوں جاؤ گے اور کہاں۔''

داد میں ایک بار پھر تالیاں بجیں۔حتیٰ کہ اس جوش وخروش میں ہرسٹوس بھی شامل ہو گیا۔قونیہ کے یہودی محلے میں، ایک عیسائی کے مے خانے میں، ہم تمام مذہبوں کے ماننے والے مے نوشوں کا ملا جلا گروہ، ہم نے اپنے جام ٹکرائے۔ اگرچہ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ خدا جو ہم سے محبت کرتا اور ہمیں معاف کر سکتا تھا، حتیٰ کہ تب بھی جب ہم خود ایسا کرنے میں واضح طور پر ناکام تھے۔

ایلا

نارتھمپٹن، 31 مئی 2008ء

''بعد میں افسوس کرنے سے بہتر ہے پہلے ہی محفوظ رہنا۔'' ویب سائٹ کہتی تھی، ''اس کی قمیصوں پر لپ سٹک کے نشان چیک کرو، دیکھو کہ کیا وہ کسی نامانوس پرفیوم کی مہک لیے گھر واپس آتا ہے۔''

یہ پہلی مرتبہ تھی کہ ایلا روبن سٹین نے اس نام کا آن لائن ٹیسٹ کیا تھا، ''کیسے معلوم کیا جائے کہ تمہارا شوہر تم سے بے وفائی کر رہا ہے!'' اگرچہ اُسے سوالات عجیب پٹے ہوئے سے لگے تھے، مگر اب وہ جانتی تھی کہ کبھی کبھار خود زندگی بھی کسی بڑے کلیشے جیسی محسوس ہو سکتی تھی۔

اپنے فائنل ٹیسٹ سکور کے باوجود، ایلا اس معاملے پر ڈیوڈ کے مقابل نہیں آنا چاہتی تھی۔ اُس نے تو ابھی تک اُس سے یہ بھی نہ پوچھا تھا کہ جس رات وہ گھر نہیں آیا تھا تو کہاں رہا تھا۔ اِن دنوں وہ اپنا بیشتر وقت ''دلکش کفر'' پڑھتے گزارتی تھی، یوں وہ ناول کو اپنی خاموشی کو ڈھانپنے کا عذر بنائے ہوئے تھی۔ اس کا دماغ اس قدر منتشر خیال تھا کہ اُسے کتاب ختم کرنے کے لیے معمول سے زیادہ وقت لگ رہا تھا۔ پھر بھی وہ کہانی سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور شمس کے ہر نئے اصول کے ساتھ وہ اپنی زندگی پر غور و فکر کرتی۔

جب بچے آس پاس ہوتے تو وہ نارمل نظر آتی۔ وہ بھی نارمل نظر آنے کی کوشش کرتے۔ تاہم جب وہ اور ڈیوڈ اکیلے ہوتے تو وہ اپنے شوہر کو خود کو متجسس نظروں سے دیکھتے پاتی، یوں جیسے وہ سوچتا ہو کہ کس قسم کی بیوی اپنے شوہر سے یہ پوچھنے سے گریز کرے گی کہ اُس نے اپنی رات کہاں گزاری تھی۔ لیکن سچ یہ تھا کہ ایلا ایسی کوئی معلومات لینا ہی نہ چاہتی تھی جس کے بارے اُسے پتا نہ ہو کہ اُس سے وہ نمٹے گی کیسے۔ جتنا کم وہ اپنے شوہر کے دل پھینک ہونے کے متعلق جانتی، اتنا ہی اُس کا دماغ اِن باتوں سے آزاد رہتا، اُس نے سوچا۔ بے خبری کے بارے میں لوگ جو کچھ کہتے ہیں، وہ سچ ہی تھا۔ لاعلمی رحمت تھی۔

واحد مرتبہ جب یہ رحمت تہ و بالا ہوئی، وہ گزشتہ کرسمس کی بات تھی، جب اُن کے میل باکس میں ایک مقامی ہوٹل کا سروے پہنچا، جس میں براہ راست ڈیوڈ کو مخاطب کیا گیا تھا۔ کسٹمر سروس جاننا چاہتی

تھی کہ کیا وہ ہوٹل میں اپنے قیام سے مطمئن تھے۔ ایلا نے وہ خط میز پر ڈاک کے ڈھیر کے اوپر چھوڑ دیا اور اُس شام اُس نے ڈیوڈ کو پہلے سے کھلے لفافے سے خط نکال کر پڑھتے دیکھا۔

''آہ، مہمانوں کی طرف سے جائزے کا فارم! آخری چیز جس کی مجھے ضرورت تھی۔'' ڈیوڈ نے اُس کے سامنے مسکرانے میں ذرا کامیاب ہوتے کہا، ''پچھلے سال ہم نے ایک ڈینٹل کانفرنس کروائی تھی۔ انہوں نے سب شرکا کو اپنی گاہکوں کی فہرست میں شامل کر لیا ہوگا۔''

اُس نے اپنے شوہر کی بات پر یقین کر لیا۔ اُس کے کم از کم اُس حصے نے یقین کر لیا جسے یوں زندگی کا ڈگر سے ہٹنا پسند نہ آیا تھا۔ اُس کا دوسرا حصہ قنوطی اور بدگمان تھا۔ وہی حصہ تھا جس نے اگلے روز ہوٹل کے نمبر پر فون کیا اور وہی کچھ سنا جو وہ پہلے سے ہی جانتی تھی: انہوں نے اِس سال نہ ہی گزشتہ سال کسی ڈینٹل کانفرنس کی میزبانی کی تھی۔

اندر کہیں گہرائی میں ایلا نے خود کو الزام دیا۔ اُس کی عمر ابھی اتنی نہ ہوئی تھی مگر پچھلے چھے برسوں میں اُس نے اپنا وزن خاصا بڑھا لیا تھا۔ ہر نئے پاؤنڈ کے ساتھ اُس کی جنسی خواہش میں کمی آتی گئی۔ کوکنگ کلاسز نے اس اضافی وزن کو کم کرنا مزید مشکل بنا دیا، اگرچہ اُس کے گروپ میں ایسی عورتیں بھی تھیں جو اُس سے زیادہ اکثر و بیشتر کھانا پکاتی اور بہتر پکاتی تھیں اور پھر بھی سائز میں اُس سے آدھی رہتی تھیں۔

اپنی زندگی کو مڑ کر دیکھنے پر اُسے ادراک ہوا کہ بغاوت اُس کے لیے کچھ موزوں نہ رہی تھی۔ اُس نے بند دروازوں کے پیچھے لڑکوں کے ساتھ مل کر کبھی سگریٹ نہ سلگائے تھے، بارز سے باہر نہ نکالی گئی تھی، کبھی مارننگ آفٹر گولیاں استعمال نہ کی تھیں، اپنی ماں کو غصہ دلایا تھا نہ کبھی اُس سے جھوٹ بولا تھا۔ کبھی کلاسز نہ چھوڑی تھیں۔ نوعمری میں کسی سے قربت نہ رکھی تھی۔ اُس کے اردگرد ہر عمر کی لڑکیاں ابارشن کروا رہی تھیں یا پھر شادی کے بغیر پیدا ہونے والے اپنے بچوں کو دوسروں کو گود دے رہی تھیں جب کہ وہ ان کی کہانیوں کا مشاہدہ یوں کرتی تھی جیسے ٹی وی پر ایتھوپیا میں قحط کا پروگرام دیکھ رہی ہو۔ ایلا کو ایسی بات افسردہ کر دیتی تھی کہ دنیا میں اتنے المیے وقوع پذیر ہو رہے تھے لیکن سچ یہ تھا کہ اُس نے اُن بدنصیبوں کے ساتھ خود کو ایک ہی دنیا یا کائنات میں شریک نہیں پایا۔

وہ کبھی پارٹی گرل نہ تھی، اپنی ٹین ایج میں بھی نہیں۔ وہ جمعہ کی رات کو کسی بے لگام پارٹی میں اجنبیوں کے ساتھ اونچی آواز میں ہوہا کرنے کی بجائے گھر رہنے اور کوئی اچھی کتاب پڑھنے کو ترجیح دیتی تھی۔

''تم ایلا جیسی کیوں نہیں بن سکتیں؟'' اُس کے آس پڑوس کی مائیں اپنی بیٹیوں سے پوچھتی تھیں۔ ''دیکھو، وہ کبھی خود کو مشکل میں نہیں ڈالتی۔''

جہاں اُن کی مائیں اُسے پسند کرتی تھیں، وہیں بچے اُسے حسِ مزاح سے عاری ایک گاؤدی لڑکی سمجھتے تھے۔ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ وہ ہائی سکول میں زیادہ مقبول نہ تھی۔ ایک بار اُس کی کلاس فیلو

نے اُسے بتایا، ''تم جانتی ہو تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تم زندگی کو بڑی سنجیدگی سے لیتی ہو۔ تم بے انتہا بیزار کن ہو!''

اُس نے غور سے سنا اور کہا کہ وہ اس بارے میں سوچے گی۔ حتیٰ کہ برسوں میں اُس کا ہیئر سٹائل تک نہ بدلا تھا... لمبے، سیدھے، شہد رنگ بال جنہیں وہ کس کر جوڑے کی شکل دے دیتی یا پھر اپنی پشت پر چٹیا کی صورت چھوڑ دیتی۔ وہ ہلکا سا میک اَپ کرتی تھی، ہلکی سی سرخی مائل براؤن لپ سٹک اور کاہی رنگ آئی لائنر جو اُس کی بیٹی کے مطابق اُس کی آنکھوں کے سرمئی مائل نیلے رنگ کو ابھارنے کی بجائے چھپا زیادہ دیتا تھا۔ کسی صورت میں کبھی ایک سے آئی لائنر دونوں آنکھوں پر لگانے میں وہ ناکام رہی تھی اور یوں اُس کی آنکھوں کا ایک پپوٹا دوسرے سے بھاری دکھائی دیتا۔

ایلا کو شک ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ غلط تھا۔ وہ بے حد مداخلت کرنے والی اور جارح تھی (جیسا کہ جینٹ کی شادی کے منصوبے کے سلسلے میں) یا پھر بے حد غیر متحرک اور اطاعت گزار (اپنے شوہر کے معاشقوں کے سلسلے میں)۔ ایک ایلا جو دوسروں پر کنٹرول کے لیے دیوانی تھی اور دوسری مسکین اور بے بس ایلا۔ وہ کبھی نہ بتا سکتی تھی کہ کون سی والی ایلا کب ابھرنے کو تھی۔

اور پھر ایک تیسری ایلا تھی۔ سب کچھ خاموشی سے مشاہدہ کرتی، اپنا وقت آنے کی منتظر۔ یہ وہ ایلا تھی جس نے اُسے بتایا کہ وہ بے حسی کی حد تک پُرسکون تھی لیکن اس کے نیچے ایک دَم گھٹی ہوئی شخصیت تھی، جو غصے اور بغاوت کے ایک تیز رَو سیلاب پر بند باندھے ہوئے تھی۔ تیسری ایلا نے متنبہ کیا کہ اگر وہ اسی طرح چلتی رہی تو کسی روز وہ پھٹ پڑے گی۔ یہ بس کچھ وقت ہی کی بات تھی۔

مئی کے آخری روز ان معاملات پر سوچتے ہوئے ایلا نے کچھ ایسا کیا جو ایک لمبے عرصے سے اُس نے نہ کیا تھا۔ اُس نے دعا کی۔ اس نے خدا سے التجا کی کہ وہ اُسے محبت سے نوازے جو اُس کی پوری ذات کو جذب کر لے یا پھر وہ اُسے اس قدر مضبوط، سخت جان اور بے پروا بنا دے کہ اس کو اپنی زندگی میں محبت کی عدم موجودگی کی پروا ہی نہ رہے۔

''آپ جس کا بھی انتخاب کریں، پلیز جلدی کریں۔'' اُس نے بعد میں آنے والے خیال پر اضافہ کیا۔ ''آپ شاید بھول چکے ہوں مگر بات یہ ہے کہ میں پہلے ہی چالیس برس کی ہو چکی ہوں۔ اور جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، میں نے اپنی عمر خوبی سے نہیں گزاری۔''

طوائف۔۔۔گُلِ صحرا

قونیہ،17اکتوبر1244ء

بغیر مڑ کر دیکھے، میں تنگ گلی کوچوں میں ہانپتے ہوئے بھاگتی رہی، بھاگتی رہی۔ میرے پھیپھڑے دُکھ رہے تھے، میرا دل سینے میں تیز تیز دھڑک رہا تھا، جب میں آخرکار ایک معروف بازار میں پہنچی اور تقریباً گرتے ہوئے، ایک دیوار کے پیچھے جا چھپی۔ تبھی تھا کہ مجھے مڑ کر اپنے پیچھے دیکھنے کا حوصلہ ہو پایا۔

مجھے بے حد حیرت اور سکون محسوس ہوا کہ میرا پیچھا صرف ایک شخص کر رہا تھا: سمسم۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ میرے برابر آ کر رک گیا، اس کے بازو اُس کے پہلوؤں میں بے جان ہو کر لٹک رہے تھے، تاثرات تحیر بھرے اور آزردہ، یہ سمجھنے میں ناکام کہ میں آخر کیوں اچانک کسی پاگل کی طرح قونیہ کی گلیوں میں سرپٹ بھاگنے لگی تھی۔

سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ بازار میں پہنچ کر ہی میں سب سمجھنے کی کوشش کر سکی۔ ایک لمحے میں مسجد میں بیٹھی تھی، وعظ میں گم، مولانا رومی کے حکمت کے موتیوں میں پیتے ہوئے۔ اپنی بے خودی کے عالم میں میں یہ دیکھنے میں ناکام رہی کہ میرے برابر بیٹھے لڑکے نے اتفاق سے اُس سرپوش کے کونے پر پیر رکھ دیا تھا جو میرا چہرہ ڈھانپے ہوئے تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ پاتی، رومال ڈھیلا ہوا اور میری پگڑی پھسل گئی جس سے میرا چہرہ اور میرے بالوں کا کچھ حصہ کھل گئے۔ میں نے جلدی سے اپنا سرپوش درست کیا اور رومی کو سنتی رہی، مجھے بھروسا تھا کہ کسی نے بھی توجہ نہ دی ہوگی۔ لیکن جب میں نے دوبارہ اپنی نگاہیں اٹھائیں تو اپنے سے اگلی قطار میں موجود نوجوان کو خود کو غور سے گھورتے پایا۔ چوکور چہرہ، ٹیڑھی آنکھیں، تیکھی ناک، چہرے پر استہزا۔ میں اُسے پہچان گئی۔ وہ عبرس تھا۔

عبرس اُن پریشان کرنے والے گاہکوں میں سے ایک تھا، قحبہ خانے کی کوئی لڑکی بھی جس کے

قریب نہ جانا چاہتی تھی۔ کچھ مرد طوائفوں کے ساتھ قربت رکھنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی توہین اور بے عزتی بھی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ ہمیشہ غلیظ لطیفے سناتا ہوا، اس کا مزاج اور غصہ بھی تکلیف دہ تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے ایک لڑکی کو اتنے برے طریقے سے مارا کہ حتیٰ کہ نائکہ بھی جسے ہر شے سے زیادہ دولت پیاری تھی، اُسے ھورس کو کہنا پڑا کہ وہ دفع ہو جائے اور دوبارہ کبھی ادھر نہ پھٹکے۔ لیکن وہ آتا رہا۔ کم سے کم چند اور مہینے تو ضرور آتا رہا۔ پھر کسی ایسی وجہ سے جو مجھے معلوم نہیں، اُس نے قحبہ خانے آنا چھوڑ دیا اور ہمیں دوبارہ اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ اب یہاں تھا وہ، اگلی قطار میں بیٹھا ہوا، کسی نیک پرہیزگار کی طرح باریش، لیکن پھر بھی اُس کی آنکھوں میں وہی خوف ناک چمک تھی۔

میں نے نگاہ پھیر لی۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ مجھے پہچان چکا تھا۔

ھورس نے اپنے برابر بیٹھے شخص سے سرگوشی میں کچھ کہا اور پھر وہ دونوں مڑے اور مجھے گھورنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے کسی تیسرے کے سامنے میری طرف اشارہ کیا اور پھر اس قطار میں ایک کے بعد ایک مرد مڑ کر مجھے گھورنے لگے۔ مجھے اپنا چہرہ سرخ پڑتا محسوس ہوا اور میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا لیکن میں سرک نہ پائی۔ اس کی بجائے میں اس بچگانہ امید میں رہی کہ اگر میں بے حرکت رہی اور آنکھیں بند رکھیں تو تاریکی ہم سب کو نگل جائے گی اور فکر کی کوئی بات نہ رہے گی۔

جب میں نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولنے کی جرأت کی تو ھورس ہجوم میں جگہ بناتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی مگر فرار ناممکن تھا کیوں کہ میں لوگوں کے سمندر میں گھری ہوئی تھی۔ پلک جھپکنے میں ھورس مجھ تک آ پہنچا، اس قدر دھمکی آمیز طریقے سے قریب کہ میں اس کی سانسوں کی بُو تک محسوس کر سکتی تھی۔ جھپٹ کر میرا بازو پکڑتے اس نے دانت پیستے ہوئے کہا، ''ایک طوائف یہاں کیا کر رہی ہے؟ تمہیں کوئی شرم نہیں؟''

''خدارا... خدارا... مجھے جانے دو۔'' میں نے ہکلا کر کہا لیکن میرا نہیں خیال کہ اس نے میری بات سنی بھی تھی۔

اُس کے دوست اُس سے آن ملے۔ بٹے کٹے، دہشت انگیز، پُراعتماد، نفرت انگیز، غصے اور سرکے کی بدبُو دیتے، مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے اُس کے ساتھی۔ آس پاس ہر کوئی یہ دیکھنے مڑا کہ یہ شور کس لیے تھا اور کچھ لوگوں نے ناپسندیدگی سے تت تت کیا مگر کسی نے بھی مداخلت نہ کی۔

میرا بدن گندھے ہوئے آٹے کی طرح مجہول تھا، میں نے فرمانبرداری سے انہیں خود کو دروازے کی طرف دھکیلنے دیا۔ ایک بار گلی میں پہنچ جاتے تو مجھے امید تھی کہ شمس میری مدد کو آئے گا اور وہ اس سے بھی بدتر پر تیار ہوئے تو میں بھاگ جاؤں گی۔ لیکن گلی میں قدم رکھتے ہی وہ آدمی زیادہ مشتعل اور جارح ہونے لگے۔ مجھے دہشت بھرا ادراک ہوا کہ مسجد میں انہوں نے مبلغ اور حاضرین کے احترام میں احتیاط سے اپنی آوازیں بلند نہ ہونے دی تھیں یا مجھے دھکے نہ دیئے تھے لیکن باہر گلی میں انہیں روکنے

والا کوئی نہ تھا۔

میں زندگی میں اس سے مشکل حالات سے گزری تھی اور پھر بھی مجھے شک تھا کہ میں نے خود کو اس قدر رنجیدہ پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ برسوں کی ہچکچاہٹ کے بعد آج میں نے خدا کی طرف قدم بڑھایا تھا اور اُس نے کیسے جواب دیا تھا؟ اپنے گھر سے باہر نکال دیا تھا!

''مجھے وہاں کبھی نہیں جانا چاہیے تھا۔'' میں نے سمسم سے کہا۔ میری آواز برف کی طرح چیخ رہی تھی۔ ''لوگ ٹھیک کہتے ہیں، تم جانتے ہو۔ مسجد یا گرجا یا خدا کے کسی بھی گھر میں کسی طوائف کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''ایسا مت کہو!''

جب میں یہ دیکھنے کے لیے مڑی کہ ایسا کہنے والا کون تھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ وہی تھا، سرگرداں درویش، بالوں سے محروم۔

سمسم اُسے دوبارہ دیکھ کر خوشی سے مسکرانے لگا۔ میں اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دینے آگے بڑھی لیکن اُس نے مجھے بیچ راہ میں روک دیا۔ ''ایسا مت کرو۔''

''لیکن میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں؟ میں تمہاری بہت مقروضِ احسان ہوں۔'' میں نے استدعا کی۔

اُس نے کندھے اچکائے اور عدم دلچسپی دکھائی۔ ''تم پر میرا کوئی احسان نہیں۔'' وہ بولا، ''ہم صرف خدا کے مقروضِ احسان ہیں۔''

اُس نے خود کو شمس تبریز کے طور پر متعارف کروایا اور پھر ایک عجیب ترین بات کی: ''کچھ لوگ اپنی زندگی کا آغاز ایک شان دار چمکتے ہوئے ہالے کے ساتھ کرتے ہیں مگر پھر رنگ کھو دیتے ہیں اور دھندلا جاتے ہیں۔ تم ان ہی میں سے ایک لگتی ہو۔ کبھی تمہارا ہالہ گلِ نرگس کی طرح سفید تھا جس میں زرد اور گلابی دھبے تھے لیکن وقت کے ساتھ مرجھا کر اس کے رنگ اڑ گئے۔ اب وہ ہلکا بھورا ہو چکا ہے۔ کیا تمہیں اپنے اصلی رنگوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی؟ کیا تم اپنے اصل سے ملنا پسند نہ کرو گی؟''

میں نے اُس کے لفظوں میں پوری طرح گم ہوتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''تمہارا ہالہ اپنی چمک اس لیے کھو چکا ہے کہ ان تمام برسوں میں تم نے خود کو قائل کر لیا کہ تم اندر اور باہر سے میلی ہو چکی ہو۔''

''میں ناپاک ہوں۔'' میں نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا، ''کیا تم نہیں جانتے کہ میں روزی کمانے کے لیے کیا کرتی ہوں؟''

''اجازت دو کہ میں تمہیں ایک قصہ سناؤں۔'' شمس تبریز نے کہا اور پھر انہوں نے مجھے بتایا: ''کسی روز ایک طوائف کسی آوارہ کتے کے قریب سے گزری۔ جانور سخت دھوپ میں ہانپ

رہا تھا، پیاسا اور بے بس تھا۔ طوائف نے فوراً اپنا جوتا اتارا اور قریب ترین کنویں سے اُس میں کتے کے لیے پانی بھر لائی۔ پھر اُس نے اپنا راستہ لیا۔ اگلے روز اُس کا آمنا سامنا ایک صاحب بصیرت صوفی سے ہوا۔ صوفی نے اُسے دیکھتے ہی احترام سے سلام کیا۔ وہ سخت حیرت زدہ رہ گئی۔ لیکن انہوں نے اُسے بتایا کہ کتے کے لیے اُس کی مہربانی اتنی کھری اور بے میل تھی کہ تمہارے سب کے سب گناہ موقع پر ہی معاف کر دیئے گئے۔"

میں سمجھ گئی کہ شمس تبریز مجھے کیا بتانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن میرے اندر کسی شے نے ان کا یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے میں نے کہا، "میں آپ کو یقین دلا دوں، چاہے میں قونیہ کے سارے کتوں کو ہی کھانا کھلاؤں، یہ میرے گناہوں کے کفارے کے لیے پھر بھی کافی نہیں ہوگا۔"

"تم یہ نہیں جان سکتیں، صرف خدا جان سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہیں یہ کیسے خیال آیا کہ آج جن آدمیوں نے تمہیں دھکے دے کر مسجد سے نکالا، وہ خدا کے مقرب ہیں؟"

"چاہے وہ خدا کے قریب نہ بھی ہوں۔" میں نے قائل ہوئے بغیر کہا، "انہیں یہ کون بتائے گا؟ کیا آپ بتائیں گے؟"

درویش نے اپنا سر ہلایا۔ "نہیں، نظام اس طرح سے نہیں چلتا۔ وہ تم ہو جسے انہیں یہ بتانا چاہیے۔"

"آپ کا خیال ہے کہ وہ میری بات سنیں گے؟ وہ لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔"

"وہ سنیں گے۔" اُنہوں نے عزم سے کہا، "کیوں کہ "اُن" یا "وہ" نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں، بالکل جیسے کوئی "میں" نہیں ہے۔ تمہیں اپنے دماغ میں صرف یہ رکھنے کی ضرورت ہے کہ کیسے اس کائنات کی ہر شے اور ہر کوئی باہم مربوط ہیں۔ ہم سب سینکڑوں اور ہزاروں مختلف وجود یا ہستیاں نہیں ہیں۔ ہم سب ایک واحد ہیں۔"

میں منتظر رہی کہ وہ اس کی وضاحت کریں مگر اُنہوں نے بات جاری رکھی: "یہ چالیس اصولوں میں سے ایک ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تم سے مختلف طرح سے سلوک کریں تو پہلے تمہیں اپنے سے خود روا رکھے سلوک کو بدلنا ہوگا۔ جب تک کہ تم خود اپنے آپ سے بھرپور طرح سے اور خلوص سے محبت کرنا نہ سیکھ لو، کوئی صورت نہیں کہ تم سے محبت کی جا سکے۔ اگرچہ جب تم اس مرتبے کو پہنچ جاؤ تو ہر اس کانٹے کے لیے شکر گزار ہونا جو دوسرے تم پر پھینکیں گے۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ جلد ہی تم پر گلاب نچھاور ہوں گے۔" وہ ذرا دیر کو رکے اور پھر مزید کہنے لگے، "تم دوسروں کو اپنی بے عزتی کا الزام کیسے دے سکتی ہو جب کہ تم خود اپنے آپ کو احترام کا مستحق نہیں سمجھتیں؟"

میں اس بات پر اپنی گرفت محسوس کرتے ہوئے جو حقیقت میں پھسل گئی تھی، لاجواب کھڑی رہ گئی۔ میں نے اُن تمام مردوں کے بارے میں سوچا جن کے ساتھ میری قربت رہی تھی... جس طرح اُن

سے بو آتی تھی، اُن کے سخت کھردرے ہاتھوں کا لمس جیسا محسوس ہوتا تھا، جب وہ آتے تو کس طرح روتے تھے... میں نے اچھے لڑکوں کو عفریت میں اور عفریت کو اچھے لڑکے میں بدلتے دیکھا تھا۔ ایک بار میرے پاس ایسا گاہک آیا تھا جسے قربت کے دوران طوائفوں پر تھوکنے کی عادت تھی۔ ''غلیظ۔'' وہ میرے منہ پر اور میرے پورے چہرے پر قربت کے دوران تھوکتے ہوئے کہتا تھا، ''غلیظ ناپاک فاحشہ۔''

اور یہاں یہ درویش کہتا تھا کہ میں تازہ چشمے کے پانی سے بھی زیادہ پاک صاف تھی۔ یہ ایک بے مزہ لطیفہ محسوس ہوا۔ جب میں نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی تو میرے حلق سے آواز نہ نکلی اور میں سسکیاں بھرنے لگی۔

''ماضی ایک بھنور ہے۔ اگر تم نے اُسے اپنے حال پر غالب آنے کی اجازت دے دی تو وہ تمہیں نگل جائے گا۔'' شمس تبریز نے یوں کہا جیسے اُنہوں نے میری سوچیں پڑھ لی تھیں۔ ''وقت محض ایک فریب خیال ہے۔ تمہیں حال میں، اِس موجودہ لمحے میں جینے کی ضرورت ہے۔ بس یہی اہم ہے۔''

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے لبادے کی جیب سے ایک ریشمی رومال نکالا۔ ''اسے رکھ لو۔'' وہ بولے، ''بغداد میں ایک نیک آدمی نے یہ مجھے دیا تھا لیکن مجھ سے زیادہ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ یہ تمہیں یاد دلائے گا کہ تمہارا دل خالص ہے اور خدا تمہارے اندر بستا ہے۔''

یہ کہہ کر درویش نے اپنا عصا اٹھایا اور کھڑا ہو گیا، جانے کو تیار۔ ''بس اُس قحبہ خانے سے نکل آؤ۔''

''کہاں؟ کیسے؟ میرے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں میں جا سکوں۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں۔'' شمس تبریز نے اپنی چمکتی نظروں کے ساتھ کہا، ''اس پر پریشان مت ہو کہ راہ تمہیں کدھر لے جائے گی۔ اس کی بجائے اپنے پہلے قدم پر توجہ مرکوز رکھو۔ یہ مشکل ترین کام ہے اور تم اس کی ذمے دار ہو۔ ایک بار تم پہلا قدم اٹھا لو تو سب کچھ (عناصر) کو وہ کرنے دو جو وہ قدرتی طور پہ کرتے ہیں اور باقی سب کچھ ہوتا چلا جائے گا۔ بہاؤ کے ساتھ مت ہو۔ خود بہاؤ بن جاؤ۔''

میں نے سر ہلا دیا۔ مجھے یہ سمجھنے کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی کہ یہ بھی اصولوں میں سے ایک اصول تھا۔

سلیمان مدہوش

قونیہ،17اکتوبر1244ء

بادۂ سرخ کا آخری جام چڑھا کر میں نصف شب سے پہلے مے خانے سے باہر نکل آیا۔

''میرا کہا یاد رکھنا۔ اپنی زبان سنبھال کر بولنا۔'' ہرسٹوس نے الوداع میں ہاتھ ہلاتے پھر خبردار کیا۔

میں نے، ایک ایسا دوست رکھنے پر خود کو خوش نصیب محسوس کرتے ہوئے سر ہلا دیا جسے میری اتنی پرواہ تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے خالی گلی میں اندھیرے میں قدم رکھا، مجھ پر ایک اس قسم کی تھکن طاری ہوگئی جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ میں نے خواہش کی کہ کاش میں مے سرخ کی صراحی ساتھ اٹھا لایا ہوتا۔ میں تب مشروب استعمال کر سکتا تھا۔

شکستہ گول پتھروں پر اپنے جوتوں کی چاپ کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے چلتے میرے ذہن میں مولانا رومی کے جلوس کے آدمیوں کا نظارہ گھوم گیا۔ ان کی نگاہوں میں موجود نفرت اور گھن کی جھلک یاد کر کے مجھے تکلیف ہوئی۔ اگر کسی چیز سے مجھے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت تھی تو وہ تھی، دکھاوے کی شرم وحیا۔ مجھے سنجیدہ اور اچھے لوگوں نے اتنی بار تنبیہ کی تھی کہ صرف ان کی یاد ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑانے کو کافی تھی۔

ان ہی سوچوں میں گھرے ہوئے میں ایک موڑ مڑا اور ایک ذیلی گلی میں گھس گیا۔ گھنے اور بلند وبالا درختوں کے باعث یہاں زیادہ اندھیرا تھا۔ یوں جیسے یہی کافی نہ تھا، چاند بھی اچانک مجھے گھنی اور گہری تاریکی میں ڈھانپتے ہوئے بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا۔ دوسری صورت میں، میں اپنی طرف بڑھتے دو ضابطہ سپاہیوں کو دیکھ لیتا۔

''سلام علیکم۔'' میں نے کہا، میرا لہجہ میرے اضطراب کو چھپانے کی کوشش میں خاصا خوش باش ہوگیا۔

لیکن سپاہیوں نے میرے سلام کا جواب نہ دیا۔ اس کی بجائے انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں اتنی دیر گئے باہر گلیوں میں کیا کر رہا تھا۔

''بس چل پھر رہا تھا۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

ہم بے ڈھنگی سی خاموشی میں گھرے کھڑے رہ گئے جسے کبھی کبھار صرف دور سے آتی کتوں کے بھونکنے کی آواز چھیدتی تھی۔ ایک محافظ نے میری طرف قدم بڑھایا اور ہوا میں سونگھا۔ ''یہاں سے بدبو آرہی ہے۔'' وہ اچانک بول اٹھا۔

''ہاں، اس سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔'' دوسرے محافظ نے تصدیق کی۔

میں نے صورت حال سے نرمی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ ''تم لوگ فکر مت کرو۔ بو صرف مجازی ہے۔ چوں کہ ہم مسلمانوں کو صرف مجازی یا استعارہ کی شراب پینے کی اجازت ہے، اس لیے بدبو بھی مجازی ہی رہی ہوگی۔''

''تم آخر کیا بک بک کر رہے ہو؟'' پہلا محافظ غرا کر بولا۔

تبھی چاند بادلوں کے عقب سے نکل آیا اور ہمیں اپنی نرم پھیکی سی چاندنی میں لپیٹ لیا۔ اب میں اپنے سامنے کھڑے آدمی کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا چہرہ چوکور تھا، ٹھوڑی باہر کو نکلی ہوئی، نیلی آنکھیں اور تیکھی ناک۔ وہ وجیہہ ہو سکتا تھا کہ اگر اس کی آنکھیں بھینگی نہ ہوتیں اور اُس کے چہرے پر مستقل تیوری نہ ہوتی۔

''تم رات کے اس پہر گلیوں میں کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' آدمی نے دہرا کر کہا، ''تم کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جارہے ہو؟''

میں خود کو بولنے سے روک نہ پایا۔ ''یہ گہرے سوالات ہیں بیٹے۔ اگر مجھے ان کے جواب معلوم ہوتے تو میں اس دنیا میں ہمارے مقصد کا اسرار حل کر چکا ہوتا۔''

''کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو، غلیظ آدمی؟'' محافظ نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا اور اس سے پہلے کہ مجھے خبر ہوتی کہ ہو کیا رہا تھا، اُس نے کوڑا نکال کر ہوا میں لہرایا۔

اُس کے تاثرات اور حرکتیں اتنے مبالغہ آمیز تھے کہ میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ اگلا کام اُس نے یہ کیا کہ دُرّہ میرے سینے پر دے مارا۔ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ میرا توازن بگڑ گیا اور میں گر پڑا۔

''شاید یہ تمہیں کچھ آداب اور تمیز سکھا دے۔'' محافظ نے کوڑا ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ترکی بہ ترکی کہا، ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مے نوشی گناہِ کبیرہ ہے؟''

اگرچہ میں اپنے ہی خون کی حدت محسوس کر سکتا تھا اور میرا سر تکلیف کے سمندر میں ڈبکیاں کھا رہا تھا، پھر بھی مجھے یقین نہ ہو پایا کہ گلی کے عین درمیان مجھے میرے بیٹے کی عمر کے نوجوان نے کوڑا مارا تھا۔

''پھر آؤ اور مجھے سزا دو۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، ''اگر خدا کی جنت تم جیسے لوگوں کے لیے مخصوص ہے تو پھر میں جہنم میں جلنا پسند کروں گا۔''

غیظ وغضب کے دورے میں نوجوان محافظ پوری قوت سے مجھے دڑے لگانے لگا۔ میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا لیکن اس سے زیادہ مدد نہ ملی۔ ایک پرانے خوشی بھرے گیت کے بول میرے دماغ میں ابھرے اور میرے خون میں نہائے لبوں سے نکلنے لگے۔ اس بارے میں پرعزم کہ میں اپنی لاچارگی عیاں نہ کروں گا، کوڑے کی ہر ضرب پر میں اونچی سے اونچی آواز میں گاتا گیا۔

''مجھے بوسہ دو میری محبوب، میرا دل درمیان تک چیر ڈالو،

تمہارے ہونٹ چیری کی شراب جیسے شیریں ہیں، کچھ اور انڈیلو۔''

میرے طنز پر محافظ مزید مشتعل ہو گیا۔ جتنی اونچی آواز میں مَیں نے گایا، اُسی قدر زور سے اس نے ضرب لگائی۔ مجھے کبھی اندازہ نہ تھا کہ کسی آدمی کے اندر اس قدر غصہ اور اشتعال جمع ہو سکتا تھا۔

''کافی ہو گئی بھرس!'' میں نے دوسرے محافظ کو گھبراہٹ سے چلاتے سنا۔ ''رک جاؤ!''

دڑے لگانا جتنی اچانک شروع ہوا تھا، ویسے ہی رک گیا۔ میں کوئی آخری بات کہنا چاہتا تھا، کچھ طاقت ور اور بے باک مگر میرے منہ میں جمع خون نے میری آواز گھونٹ دی۔ میرے پیٹ میں بل پڑے اور اس سے پہلے کہ مجھے خبر ہوتی، میں نے قے کر دی۔

''تم برباد ہو جاؤ'' بھرس نے سرزنش کی، ''میں نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا، اس کے ذمے دار خود تم ہی ہو۔''

انہوں نے میری طرف سے رخ موڑا اور تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں کتنی دیر پڑا رہا۔ ہو سکتا ہے وہ عرصہ چند گھڑیوں سے زیادہ نہ رہا ہو یا پھر شب بھر۔ وقت نے اپنا وزن کھو دیا تھا اور یوں ہر دوسری شے نے بھی۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا، مجھے نہ صرف اپنی چاندنی کے بغیر چھوڑ کر بلکہ اس احساس کے بھی بغیر کہ میں کون تھا۔ جلد ہی میں زندگی اور موت کے درمیان برزخ میں تیر رہا تھا اور مجھے کوئی پرواہ نہ تھی کہ میں کہاں پہنچتا۔ پھر بے حسی محو ہونے لگی اور میرے جسم کی ہر خراش، ہر زخم میں دیوانہ وار درد ہونے لگا، تکلیف کی ایک کے بعد دوسری لہر اٹھتی گئی۔ میرا سر گھوم رہا تھا اور میرے اعضا میں سوجن تھی۔ اس حالت میں مَیں کسی زخمی جانور کی طرح کراہا۔

میں ضرور بے ہوش ہو گیا ہوں گا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میری شلوار پیشاب میں بھیگی ہوئی تھی اور میرے جسم کا ہر عضو خوف ناک طریقے سے دُکھ رہا تھا۔ میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ وہ مجھے بے حس کر دے یا پھر کہیں سے مجھے شراب مہیا ہو جائے، جب میں نے قریب آتے قدموں کی چاپ سنی۔ میرا دل لنطے بھر کو رکا۔ وہ کوئی بدمعاش یا ڈاکو ہو سکتا تھا، حتیٰ کہ قاتل۔ لیکن پھر میں نے سوچا، مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں رات میں مزید کچھ بھی سامنے آتا اس سے زیادہ دہشت خیز نہیں ہو سکتا تھا۔

تاریکی سے ایک لمبا دبلا پتلا درویش نمودار ہوا جس کے چہرے اور سر پر کوئی بال نہ تھے۔ وہ

میرے برابر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور مجھے اٹھ کر بیٹھنے میں مدد دی۔ اُس نے شمس تبریز کے نام سے اپنا تعارف کروایا اور میرا نام پوچھا۔

''تمہاری خدمت میں قونیہ کا سلیمان مدہوش حاضر ہے۔'' میں نے اپنا ٹوٹا ہوا دانت منہ سے کھینچ کر نکالتے ہوئے کہا، ''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔''

''تمہارا خون بہ رہا ہے۔'' شمس تبریز میرے چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے زیرلب بڑبڑائے، ''نہ صرف باہر بلکہ اندر سے بھی۔''

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے لبادے کی جیب سے نقرئی صراحی نکالی۔ ''اپنے زخموں پر یہ مرہم لگالو۔'' وہ بولے، ''مجھے بغداد کے ایک نیک آدمی نے یہ دیا تھا مگر مجھ سے زیادہ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ تاہم تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے باطن کا زخم گہرا ہے اور اُس کی تمہیں فکر ہونی چاہیے۔ یہ تمہیں یاددلائے گا کہ خدا تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے ان کی مہربانی سے متاثر ہو کر خود کو ہکلا کر کہتے سنا۔ ''وہ محافظ... اُس نے مجھے کوڑے لگائے۔ اُس نے کہا کہ میں اس کا مستحق تھا۔'' یہ الفاظ ادا کرتے ہی، میں اپنے لہجے میں بچوں کی سی شکایت اور تسلی اور ہمدردی پانے کی اپنی ضرورت پر حیران رہ گیا۔

شمس تبریز نے اپنا سر ہلایا۔ ''انہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہر فرد اپنی الہامی جستجو میں خود کفیل ہے۔ اس بارے میں ایک اصول ہے: ''ہم سب خدا کی صورت پر تخلیق کیے گئے تھے اور پھر بھی ہم میں سے ہر کسی کو مختلف اور منفرد بنایا گیا۔ کوئی سے دو انسان بھی ایک جیسے نہیں۔ کوئی دو دل ایک ہی لے پر نہیں دھڑکتے۔ اگر خدا سب کو ایک جیسا بنانا چاہتا تو بنا دیتا۔ اس لیے اختلافات کا عدم احترام اور اپنے خیالات دوسروں پر مسلط کرنا، خدا کی مقدس حکمت کے عدم احترام کے برابر ہے۔''

''یہ خوب بات کہی۔'' میں نے اپنی آواز میں موجود سکون پر حیران ہوتے کہا، ''لیکن کیا تم صوفی اُس خدا کے بارے کسی بات پر کبھی شک بھی کرتے ہو؟''

شمس تبریز ایک تھکن زدہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے، ''ہم شک بھی کرتے ہیں اور شکوک اچھے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تم زندہ ہو اور جستجو میں ہو۔''

وہ اتار چڑھاؤ والے خوش الحان لہجے میں بات کرتے تھے، یوں جیسے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔

''اس کے ساتھ ساتھ کوئی رات بھر میں مومن نہیں بن جاتا۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ صاحب ایمان ہے، پھر اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے کہ وہ منکر الٰہی ہو جاتا ہے، اس کے بعد وہ دوبارہ سے ایمان والا بن جاتا ہے اور پھر دوبارہ منکر اور یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم ایک خاص مقام پر نہ پہنچ جائیں، ہم مسلسل متزلزل رہتے ہیں۔ آگے بڑھنے کا یہ واحد راستہ ہے۔ ہر نئے قدم پر ہم حق کے قریب تر پہنچ جاتے ہیں۔

''اگر ہرسٹوس نے تمہیں اس طرح بولتے سنا تو وہ تمہیں دیکھ بھال کر بولنے کا کہے گا۔'' میں نے کہا،''وہ کہتا ہے کہ ہر لفظ ہر کان کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔''

''خیر، اس کی بات میں زور ہے۔'' شمس تبریز اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے ہولے سے ہنسے۔

''آؤ، میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔ ہمیں تمہارے زخموں کی دیکھ بھال کرنی ہوگی اور کوشش کرنی ہوگی کہ تم کچھ دیر سو جاؤ۔''

انہوں نے مجھے اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد دی لیکن میں بہ مشکل چل سکتا تھا۔ ہچکچائے بغیر درویش نے مجھے یوں اٹھا لیا جیسے میرا کچھ وزن نہ تھا اور اپنی پشت پر سوار کر لیا۔

''میں تمہیں خبردار کرتا ہوں، مجھ سے بدبو آ رہی ہے۔'' میں نے مارے شرم کے زیرِ لب کہا۔

''کوئی بات نہیں، سلیمان، فکر مت کرو۔''

اس طرح، خون، پیشاب یا بدبو کی پرواہ کیے بغیر درویش، قونیہ کی تنگ گلیوں میں مجھے پشت پر اٹھائے چلتا رہا۔ ہم گہری نیند میں ڈوبے گھروں اور جھونپڑوں کے قریب سے گزرے۔ کتے اونچی آواز میں اور دہشت خیز طریقے سے، باغوں کی دیواروں کے پیچھے سے، ہر کسی کو ہماری موجودگی سے مطلع کرتے ہوئے، ہم پر بھونکے۔

''میں صوفی شاعری میں شراب کے تذکرے پر ہمیشہ متجسس رہا ہوں۔'' میں نے کہا،''صوفی جس کی تعریف کرتے ہیں، وہ اصلی شراب ہے یا استعارہ؟''

''اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے، میرے دوست؟'' شمس تبریز نے مجھے میرے گھر کے سامنے پشت سے اتارنے سے پہلے کہا،''ایک اصول اس بات کی وضاحت کرتا ہے! جب خدا کا کوئی سچا عاشق مے خانے میں جاتا ہے، تو مے خانہ اُس کا حجرۂ عبادت بن جاتا ہے لیکن جب کوئی بادہ خوار اُسی حجرے میں چلا جائے تو وہ اُس کا مے خانہ بن جاتا ہے۔ جو کچھ بھی ہم کرتے ہیں، اس میں فرق ہمارے دل اور نیت سے پڑتا ہے، ہمارے ظاہری حلیوں سے نہیں۔ صوفی دوسرے لوگوں کو اُن کے ظاہری حلیوں سے یا وہ کون ہیں، اس سے نہیں جانچتے۔ جب صوفی کسی پر نگاہیں جماتا ہے تو وہ اپنی دونوں آنکھیں بند رکھتا ہے اور اس کی بجائے اپنی تیسری آنکھ کھول لیتا ہے... قلب کی نگاہ، جو باطن کو دیکھتی ہے۔''

ایک لمبی اور تھکا دینے والی رات کے بعد اپنے گھر میں تنہا، میں نے اُس سب پر غور کیا، جو رونما ہوا تھا۔ میں جس قدر خود کو خستہ حال اور کم نصیب محسوس کر رہا تھا، اتنا ہی میرے اندر کہیں گہرائی میں ایک مسرت بھرا اطمینان تھا۔ لمحے بھر کو مجھے اس اطمینان کی جھلک دکھائی دی اور مجھے ہمیشہ اسی میں رہنے کی تمنا محسوس ہوئی۔ اُس لمحے میں میں جانتا تھا کہ آخر کہیں خدا موجود تھا اور وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔

اگرچہ میرا پورے کا پورا بدن زخمی اور سوجا ہوا تھا، عجیب بات تھی کہ مجھے مزید کوئی درد یا تکلیف محسوس نہ ہو رہی تھی۔

ایلا

نارتھمپٹن، 3 جون 2008ء

کھلی کھڑکیوں سے Beach Boys کی دُھنیں اندر آ رہی تھیں، یونیورسٹی طلبا کہیں قریب سے گزرے تھے، ان کے چہرے ابتدائے بہار کی دھوپ میں سنولائے ہوئے تھے۔ ان کی خوشی سے بے حس ایلا نے انہیں دیکھا، اُس کا دماغ گزشتہ چند روز کے واقعات کی طرف پلٹ گیا۔ پہلے اُسے کچن میں سپرٹ مُردہ حالت میں ملا تھا اور اگرچہ اُس نے خود کو کئی مرتبہ اس لمحے کے لیے تیار رہنے کا کہا تھا، اُس پر نہ صرف گہرا غم طاری ہو گیا بلکہ زد پذیر اور اکیلے ہونے کا احساس بھی۔ اپنے پالتو کتے سے محرومی کا اس پر یوں اثر ہوا تھا جیسے اُس کو دنیا میں تن تنہا چھینک دیا گیا ہو۔ پھر اُسے معلوم ہوا کہ اورلی کو شدید بھوک کی بیماری ہو گئی تھی اور یہ کہ اُس کی کلاس میں تقریباً ہر کوئی اس بارے میں جانتا تھا۔ اس پر ایلا کو احساسِ جرم ہوا جس کے نتیجے میں اُسے اپنی چھوٹی بیٹی سے اپنے تعلقات پر شک ہونے لگا اور ماں کی حیثیت سے اپنے ریکارڈ پر وہ سوال اٹھانے لگی۔ ایلا کے احساسات کے ذخیرے میں احساسِ جرم کوئی نیا عنصر نہ تھا لیکن اپنی مامتا پر اپنے اعتماد سے محرومی ضرور نیا تھا۔

اس دوران ایلا اور عزیز اے ظہارا میں روزانہ کئی بار ای میلز کا تبادلہ ہونا شروع ہوا۔ دو، تین، کبھی کبھار پانچ مرتبہ۔ وہ اُسے ہر چیز کے بارے میں لکھتی تھی اور اُسے حیرانی ہوئی کہ وہ ہمیشہ فوراً ہی جواب دیتا تھا۔ اُسے ان دُور افتادہ علاقوں میں سفر کے دوران وقت یا حتیٰ کہ ای میلز چیک کرنے کے لیے انٹرنیٹ کنکشن کیسے مل جاتا تھا، یہ ایلا کی سمجھ سے باہر تھا۔ لیکن اُس کے لفظوں کا عادی ہونے میں اُسے دیر نہ لگی۔

وہ موقع ملتے ہی ای میل چیک کرنے لگی... صبح اٹھتے ہی پہلا کام اور پھر ناشتے کے بعد، جب وہ صبح کی سیر سے واپس آتی اور جب وہ لنچ تیار کر رہی ہوتی، سودا سلف لانے کے لیے جانے سے پہلے اور حتیٰ کہ ان کے دوران بھی کہیں کسی انٹرنیٹ کیفے میں رک کر وہ ای میلز چیک کیا کرتی۔ جب اپنے پسندیدہ ٹی وی پروگرام دیکھ رہی ہوتی یا فیوژن کوکنگ کلب میں ٹماٹر کاٹ رہی ہوتی، اپنی دوستوں سے فون پر باتیں کر رہی

ہوتی یا پھر اپنے جڑواں بچوں کی سکول اور ہوم ورک کے بارے میں بک جھک سن رہی ہوتی، وہ اپنا لیپ ٹاپ ساتھ رکھتی اور اس کا ای میل باکس کھلا رہتا۔ جب عزیز کی طرف سے نیا کوئی پیغام نہ آیا ہوتا تو وہ پرانی ای میلو ہی کھول کر پڑھتی۔ اور ہر مرتبہ اُسے اُن سے کوئی نیا پیغام ملتا تھا، وہ خود کو مسکرانے پر مجبور پاتی تھی۔ جو کچھ رونما ہو رہا تھا اُس پر کچھ مسرور، کچھ خجل۔ کیوں کہ کچھ تھا ضرور جو رونما ہو رہا تھا۔

جلد ہی عزیز کے ساتھ ای میلو کے تبادلے پر ایلا کو محسوس ہونے لگا کہ یہ اُسے کس قدر اپنی متین اور پرسکون زندگی سے جدا کر رہا تھا۔ اپنی زندگی کے کینوس پر بہت سے ہلکے سرمئی اور بھورے رنگوں والی عورت سے وہ ایک بھید بھرے رنگ کی عورت میں بدل رہی تھی۔ ایک شوخ، تر سانے والا سرخ رنگ۔ اور اُسے یہ بہت اچھا لگا۔

عزیز چھوٹی چھوٹی دل لگیوں والا شخص نہ تھا۔ اُس کے نزدیک، لوگ جنھوں نے اپنے دل کو اپنا بنیادی رہنما نہ بنایا ہو، جو محبت کے لیے کھل نہ سکے ہوں اور اُس راہ پر نہ چلے ہوں جیسے سورج مکھی کا پھول سورج کی پیروی کرتا ہے، وہ واقعتاً زندہ نہ تھے۔ (ایلا نے سوچا کہ آیا وہ بھی اُس کی بے جان چیزوں کی فہرست میں شامل تھی)۔ عزیز، موسم اور اپنی تازہ دیکھی گئی کسی فلم کے بارے میں نہ لکھتا تھا۔ وہ دوسری چیزوں، گہری باتوں کے بارے لکھتا تھا، جیسے زندگی اور موت اور سب سے بڑھ کر محبت کے بارے میں۔ ایلا ایسے معاملات پر اپنے جذبات کے اظہار کی عادی نہ تھی، خصوصاً کسی اجنبی کے سامنے لیکن شاید اُس جیسی کوئی عورت کسی اجنبی کے سامنے ہی اپنے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔

اگر اُن کی خط و کتابت میں کہیں فلرٹ یا محبت کے دکھاوے کا نشان تھا تو، ایلا نے سوچا، وہ معصومانہ فلرٹ تھا جو ان دونوں کو فائدہ دیتا۔ وہ سائبر سپیس کی لامتناہی بھول بھلیوں میں دور دراز گوشوں میں خود کو بٹھا کر ایک دوسرے سے فلرٹ کر سکتے تھے۔ ای میلو کے اسی تبادلے کی بدولت اُسے اپنی ذات کی قدر یا وقار کے دوبارہ ملنے کی امید تھی جو وہ اپنی شادی کے برسوں کے درمیان کھو چکی تھی۔ عزیز مردوں کی اُس نایاب قسم میں سے تھا جس سے کوئی عورت اپنی عزتِ نفس سے محروم ہوئے بغیر محبت کر سکتی تھی۔ اور شاید وہ بھی درمیانی عمر کی امریکی عورت کی توجہ کا مرکز بن کر کچھ خوشی حاصل کر سکتا تھا۔ سائبر سپیس، کسی احساسِ جرم کے بغیر فلرٹ کرنے کا موقع مہیا کر کے آف لائن رویوں کو بڑھاتی بھی ہے اور دھیما بھی کر دیتی ہے، (احساسِ جرم جو وہ نہیں چاہتی تھی کیوں کہ پہلے ہی اُس کے پاس بہت تھا) اور کسی خطرے میں گھرے بغیر مہم جوئی (جو وہ واقعی چاہتی تھی کیوں کہ اُس نے کبھی بھی نہ کی تھی)۔ یہ اضافی کیلوریز کی پرواہ کیے بغیر کوئی ممنوعہ پھل کتر کر کھانے کے مترادف تھا... اس کے کوئی برے بھلے نتائج نہ تھے۔

سو شاید یہ بچوں والی ایک شادی شدہ عورت کے لیے ارتکاب کفر تھا کہ وہ ایک اجنبی کو بے تکلفی سے قلبی نوعیت کی ای میلو لکھے لیکن ان کے رشتے کی افلاطونی نوعیت کو دیکھا جاتا تو ایلا نے نتیجہ اخذ کیا کہ یہ ایک ''دلکش کفر'' تھا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 5 جون 2008ء

میرے محبوب عزیز،

اپنی پچھلی ایک ای میل میں تم نے کہا تھا کہ یہ خیال کہ ہم اپنی عقل سے اپنی زندگی کی راہ کو کنٹرول کر سکتے ہیں، یہ اسی قدر مہمل ہے جیسے کسی مچھلی کا کسی ایسے سمندر کو کنٹرول کرنا جس میں وہ تیرتی ہو۔ میں نے تمہارے اگلے جملے کے بارے میں بہت سوچا: ''ہم سب جانتے ہیں، کے خیال نے نہ صرف غلط توقعات پیدا کی ہیں بلکہ ان جگہوں پر مایوسیاں بھی جہاں زندگی ہماری توقعات سے موزوں نہیں ہوتی۔''

اور اب وقت ہے کہ میں اعتراف کرلوں: میں خود کسی قدر کنٹرول کی عادی ہوں۔ کم سے کم یہی وہ لوگ تمہیں بتائیں گے جو مجھے خوب جانتے ہیں۔ آج کل میں ایک خاصی سخت ماں تھی۔ میرے بہت سے اصول تھے (اور یقین کرو، وہ تمہارے صوفی اصولوں جیسے نفیس نہیں ہیں!) اور میرے ساتھ کوئی مول تول نہ ہوتا تھا۔ میری بیٹی مجھے گوریلا حکمت عملی اختیار کرنے کا الزام دیتی تھی۔ اس نے کہا کہ میں ان کی زندگیوں میں مورچہ کھود کر بیٹھتی ہوں اور وہاں سے ہر اس بھٹکی ہوئی سوچ یا خواہش کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہوں جو اُن کے دماغ میں کبھی آسکے!

یاد ہے وہ گیت، Que Sera, Sera؟ اچھا، میرا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی میرا گیت نہیں رہا۔ ''جو ہونا ہے، وہ ہوگا۔'' یہ میرے معاملے میں کبھی ٹھیک نہیں رہا، میں بہاؤ کے ساتھ کبھی نہیں بہ سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ تم ایک مذہبی آدمی ہو مگر میں ایسی نہیں ہوں۔ اگرچہ ایک خاندان کی حیثیت سے ہم یوم سبت اکثر مناتے ہیں لیکن ذاتی طور پر مجھے یہ یاد بھی نہیں کہ آخری مرتبہ میں نے کب عبادت کی تھی۔ (اوہ، اب میں کرتی ہوں۔ اپنے کچن میں، صرف دو روز پہلے۔ لیکن یہ کسی شمار میں نہیں کیوں کہ یہ کسی برتر ذات سے محض شکایت کرنے جیسا ہی تھا)۔

کالج کے زمانے میں بھی مجھے مشرقی روحانیت کا بڑا شوق ہوا تھا اور میں نے بدھ مت اور

تاؤمت کا کچھ مطالبہ بھی کیا تھا۔ میں نے حتیٰ کہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ انڈیا کے کسی آشرم میں ایک مہینہ گزارنے کے منصوبے بھی بنائے تھے، لیکن وہ میری زندگی کا ایک ایسا فیز تھا جو لمبا عرصہ نہیں چلا۔ صوفی تعلیمات جتنی پرکشش تھیں، اتنی ہی وہ بے حد مطیع قسم کی اور جدید زندگی میں ناقابل اطلاق بھی تھیں۔ تب سے میں نے اپنی سوچ بدل لی۔

مجھے امید ہے کہ مذہب سے میری بیزاری تمہیں بری نہ لگے گی۔ پلیز اسے کسی ایسے شخص کی طرف سے لمبے عرصے سے مؤخر ایک اعتراف ہی سمجھو جو تمہاری پرواہ کرتا ہے۔

گرم جوشی سے

ایلا

☼

پیاری گوریلا ایلا،

تمہاری ای میل جب مجھے ملی، میں ملاوی جانے کے لیے ایمسٹرڈیم سے رخصت ہو رہا تھا۔ مجھے ایک ایسے گاؤں میں لوگوں کی تصویریں کھینچنے کی ذمہ داری ملی ہے جہاں ایڈز کی بیماری کی شرح خاصی زیادہ ہے اور بیشتر بچے یتیم ہیں۔

اب، اگر سب کچھ ٹھیک رہتا ہے تو میں چار روز میں واپس آجاؤں گا۔ کیا میں امید کر سکتا ہوں؟ ہاں۔ کیا میں اسے کنٹرول کر سکتا ہوں؟ نہیں! میں بس یہ کر سکتا ہوں کہ اپنا لیپ ٹاپ اپنے ساتھ اٹھا لے جاؤں، ایک اچھے انٹرنیٹ کنکشن کی تلاش کروں اور امید رکھوں کہ میں ایک اور روز زندہ رہوں گا۔ باقی کچھ بھی میرے ہاتھ میں نہیں۔ پانچواں عنصر، خلا میں، غیب میں موجود اشیا، اور یہی ہے جسے صوفیا مسئلہ جبر و قدر کہتے ہیں... ناقابل توجیہ اور سرکش الہامی عنصر جو ہم انسان ہونے کی حیثیت سے کچھ نہیں سکتے اور پھر بھی ہمیں ہمیشہ اس سے آگاہ رہنا چاہیے۔ میں ''بے عملی'' پر یقین نہیں رکھتا، اگر اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ کچھ بھی نہ کیا جائے اور زندگی میں کوئی گہری دلچسپی نہ دکھائی جائے۔ لیکن میں پانچویں عنصر کے احترام پر ضرور یقین رکھتا ہوں۔

میرا ماننا ہے کہ ہم سب خدا کے ساتھ ایک عہد کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے کیا۔ جب میں صوفی بنا تو میں نے خدا سے وعدہ کیا کہ میں اپنی قابلیت کے مطابق اسے بہترین طور پر نبھاؤں گا اور باقی اس پر اور صرف اسی پر چھوڑ دوں گا۔ میں نے اس حقیقت کو قبول کیا کہ کچھ چیزیں میری حدود سے باہر ہیں۔ میں صرف کچھ حصے دیکھ سکتا ہوں، کسی فلم کے ایکٹروں کی طرح، لیکن عظیم تر حکمت میری فہم کی حد سے باہر ہے۔ اب تمہارا خیال ہے کہ میں کوئی مذہبی آدمی ہوں۔ لیکن ایسا ہے نہیں۔

میں روحانیت پسند ہوں، جو کہ مختلف بات ہے۔ مذہبیت اور روحانیت ایک ہی چیز نہیں اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان دراڑ آج سے پہلے کبھی اتنی گہری نہ تھی۔ جب میں دنیا کو دیکھتا

ہوں تو ایک بڑھتے ہوئے معمے یا گومگو کی حالت دیکھتا ہوں۔ ایک طرف تو ہم خدا، حکومت یا معاشرے سے بالاتر، فرد کی آزادی اور طاقت پر یقین رکھتے ہیں۔ کسی طرح سے انسان زیادہ خود پرست ہوتا جارہا ہے اور دنیا زیادہ مادہ پرست ہوتی جارہی ہے۔ دوسری طرف، مجموعی طور پر نسل انسانی زیادہ روحانیت پسند ہورہی ہے۔ عقل وخرد پر بہت عرصے انحصار کرتے رہنے کے بعد، لگتا ہے کہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہم ذہن کی حدود کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔

آج، بالکل قرونِ وسطیٰ کی طرح روحانیت میں دلچسپی میں یک دم اضافہ ہوا ہے۔ مغرب میں پہلے سے کہیں زیادہ لوگ اپنی مصروف زندگیوں میں روحانیت کے لیے گنجائش نکال رہے ہیں۔ لیکن اگرچہ ان کی نیت و ارادہ درست ہی، ان کے طریقِ کار اکثر نامناسب ہیں۔ روحانیت اُسی پرانی مچھلی کی نئی ڈریسنگ کا نام نہیں۔ یہ ایسا کچھ نہیں کہ ہم اپنی زندگی میں بڑی تبدیلیاں لائے بغیر کسی شے کا اضافہ کرسکیں۔

مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کھانا پکانا پسند ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ شمس تبریز نے کہا تھا کہ زندگی ایک بڑا سا دیگچہ ہے اور اس میں کوئی بڑی شے پک رہی ہے؟ ابھی ہمیں علم نہیں کہ کیا۔ ہم جو کچھ کرتے، محسوس کرتے یا سوچتے ہیں، وہ سب اس پکوان کے آمیزے کے اجزا ہیں۔ ہمیں خود سے پوچھنے کی ضرورت ہے کہ ہم دیگچے میں کیا ڈال رہے ہیں۔ کیا ہم اس میں ناراضیاں، عداوتیں، غصہ اور تشدد ڈال رہے ہیں؟ یا ہم اس میں محبت اور ہم آہنگی ملا رہے ہیں؟

تمہارا کیا معاملہ ہے، پیاری ایلا؟ تم انسانیت کے اجتماعی پکوان میں کیا اجزا ملا رہی ہو؟ میں جب بھی تمہارے بارے میں سوچتا ہوں تو جو جزو میں شامل کرتا ہوں، وہ ہے مسکراہٹ۔

محبت کے ساتھ

عزیز

حصہ سوم

ہوا

اشیا جو جگہ بدلتی، ارتقا پذیر ہوتی اور للکارتی ہیں



متعصب

قونیہ، 19 اکتوبر 1244ء

بھونکتے اور غراتے کتے، میری کھلی کھڑکی کے نیچے۔ یہ شور سن کر میں یہ شبہ کرتے ہوئے بستر میں ٹیک لگا کر اٹھ بیٹھا کہ انہوں نے کسی گھر میں چھپ کر گھستے کسی چور یا پھر کسی غلیظ شرابی کو گزرتے دیکھ لیا ہوگا۔ مہذب لوگ مزید سکون سے نہ سو سکتے تھے۔ ہر طرف شراب نوشی اور عیاشی و بدکاری کا دور دورہ تھا۔ ہمیشہ ایسا نہ رہا تھا۔ چند سال پہلے تک یہ شہر ایک پُرامن محفوظ جگہ تھی۔ اخلاقی ابتری کسی وحشت ناک بیماری سے کم نہیں ہوتی جو بغیر بتائے بے خبری میں آتی ہے اور تیزی سے پھیلتی ہے، امیر و غریب کو جلا کرتی، بوڑھوں اور جوانوں کو یکساں طور پر۔ ہمارے شہر کا حال اب ایسا ہی ہے۔ اگر میرے رتبے اور مدرسے کی بات نہ ہوتی تو میں بہ مشکل ہی گھر سے نکلتا۔

شکر خدا کا کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے مفادات پر سماج کے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں اور قانون کے نفاذ کے لیے دن رات کام کرتے ہیں۔ میرے نوجوان بھتیجے بیبرس جیسے لوگ۔ میری بیوی اور مجھے اُس پر فخر ہے۔ یہ جاننا بے حد باعث تسلی ہے کہ اتنی رات گئے جب بدمعاش، مجرم اور شرابی آپے سے باہر ہو کر کھلے عام پھرتے ہیں تو بیبرس اور اس کے ساتھی ضابطہ سپاہی ہمارے تحفظ کے لیے شہر میں گشت کرتے ہیں۔

میرے بھائی کی جوانی میں موت کے باعث بیبرس کا سرپرست میں بن گیا تھا۔ نوجوان، اہل اور بے لچک بیبرس نے چھے مہینے پہلے ضابطہ سپاہی کے طور پر کام شروع کیا۔ افواہ ساز فضول گو لوگ کہتے ہیں کہ مدرسہ استاد کی حیثیت سے میرے رتبے کے باعث وہ یہ نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ بکواس! بیبرس کسی نوکری کے حصول کے لیے خاصا مضبوط اور بہادر ہے۔ وہ ایک شان دار فوجی بھی بن سکتا تھا۔ وہ صلیبیوں کے خلاف جنگ کے لیے یروشلم جانا چاہتا تھا مگر میری بیوی اور میں نے سوچا کہ اب وقت تھا کہ وہ اپنا گھر بار بسائے اور خاندان بنائے۔

''ہمیں تمہاری یہاں ضرورت ہے بیٹے۔'' میں نے اسے کہا، ''یہاں بھی لڑنے کو بہت سی جنگیں ہیں۔''

کوئی شک نہیں کہ تھیں۔ ابھی صبح میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ ہم ایک مشکل دَور میں جی رہے تھے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں کہ ہم روزانہ کسی نئے سانحے کے بارے میں سنتے ہیں۔ اگر منگول اتنے فتح مند ہوئے، اگر عیسائی اپنے مقصد کو آگے بڑھانے میں کامیاب رہے، اگر شہر بہ شہر، گاؤں بہ گاؤں، دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں برباد ہوئے تو اس لیے کہ ہم صرف نام کے مسلمان ہیں۔ جب لوگ خدا کی رسّی کو چھوڑ دیتے ہیں تو لازم ہے کہ وہ بھٹک جائیں۔ منگول ہمارے گناہوں کی سزا کے طور پر بھیجے گئے تھے۔ اگر منگول نہ ہوتے تو کوئی زلزلہ کوئی قحط یا پھر سیلاب بھیجا جاتا۔ ہمیں اور کتنی آفات سے گزرنا پڑے گا کہ اس شہر کے گناہ گاروں کو پیغام مل جائے اور وہ اپنے طور طریقوں سے توبہ کرلیں؟ اس کے بعد مجھے خدشہ ہے کہ ہم پر پتھر برسائے جائیں گے۔ سدوم اور عمورہ کی بستیوں کے باسیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کسی روز ہمیں نابود کیا جاسکتا ہے۔

اور یہ صوفی، یہ اتنے برے طریقے سے اثر انداز ہوئے۔ یہ خود کو مسلمان کہنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں جب کہ یہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کسی مسلمان کو سوچنا بھی نہیں چاہئیں؟ جب وہ اپنے احمقانہ خیالات کے فروغ کے لیے نبی کریم ﷺ کا نام لیتے ہیں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ ایک غزوہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے اعلان کیا تھا کہ اب اُن کے پیروکار جہادِ اکبر کے لیے جہادِ اصغر کو ترک کردیں گے... جہادِ اکبر یعنی نفس کے خلاف جہاد۔ صوفیوں کا کہنا ہے کہ تب سے نفس ہی وہ واحد دشمن ہے جس کے خلاف مسلمانوں کو لڑنا چاہیے۔ سننے میں یہ بات خوب ہے لیکن دشمنانِ اسلام سے لڑنے میں اس سے کیا مدد ملے گی؟ میں حیران ہوں۔

صوفیا تو یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ شریعت کے راستے میں صرف ایک مرحلہ ہے۔ کیسا مرحلہ یا مقام، میں کہتا ہوں، تم بات کیا کررہے ہو؟ یوں جیسے یہ خطر انگیز نہ تھا، وہ بحث کرتے ہیں کہ کوئی روشن دماغ یا صاحب بصیرت شخص ابتدائی مراحل کے اصولوں کا پابند نہیں ہوسکتا۔ اور چوں کہ انھیں یہ سوچنا پسند ہے کہ وہ پہلے ہی برتر سطح کو پہنچ چکے ہیں، وہ اسے شریعت کے قوانین کے عدم احترام کے لیے ایک بودے عذر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مے نوشی، رقص، موسیقی، شاعری اور مصوری ان کے نزدیک لگتا ہے کہ مذہبی فرائض سے بڑھ کر اہم ہیں۔ وہ یہ تبلیغ کرتے رہتے ہیں کہ کیوں کہ اسلام میں کوئی سلسلہ وراثت نہیں، تو ہر کوئی خدا کی انفرادی جستجو یا معرفت حق کا مستحق ہے۔ یہ سب غیر جارحانہ اور بے ضرر سا لگتا ہے لیکن اگر کوئی بیزار کن لفاظی کو ذرا پرے ہٹائے تو اُسے معلوم ہوگا کہ اس پیغام کا ایک نامبارک پہلو بھی ہے: یعنی مذہبی شرعی احکامات پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں!

جہاں تک صوفیا کی بات ہے، ان کے نزدیک قرآن پاک مبہم علامات اور درِ در اشاروں

کنایوں سے لبریز ہے، جن میں سے ہر کسی کی صوفی طرز پر تعبیر کی جانی چاہیے۔ سو وہ تجزیہ کرتے ہیں کہ کیسے ہر حرف کسی عدد پر مرتعش ہوتا ہے، پھر وہ اعداد کے مخفی معانی کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر متن میں مخفی اور در پردہ حوالے تلاش کرتے ہیں، خدا کے سادہ اور واضح پیغام کو پڑھنے سے گریز کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں۔

کچھ صوفی یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان، کلام کرتے ہوئے قرآن ہیں۔ اگر یہ صریحاً کفر نہیں تو پھر مجھے نہیں معلوم کہ اور کفر کیا ہے۔ پھر یہ سرگرداں درویش ہیں، اپنے ماحول سے ناموزوں لوگوں کی ایک اور قسم۔ قلندری، حیدری، جامی... وہ مختلف ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ میں کہوں گا، یہ بدترین ہیں۔ آدمی جو کہیں ایک جگہ رہ بس نہیں سکتا، وہ کیا بھلائی کر سکتا ہے؟ اگر انسان کو کسی ملکیت کا، کسی نسبت کا احساس نہ ہو، تو وہ کسی بھی سمت میں بہ سکتا ہے، جیسے ہوا میں خشک پتا۔ شیطان کا پکا شکار۔

فلسفی، صوفیوں سے بہتر نہیں۔ وہ غور و فکر کرتے اور کیے چلے جاتے ہیں، یوں جیسے اُن کے محدود دماغ کائنات کے بعید الفہم ہونے کو سمجھ سکیں گے! فلسفیوں اور صوفیوں کے درمیان سازباز کی دلالت کرتی ایک حکایت ہے۔

''ایک روز کوئی فلسفی کسی درویش سے ملا اور وہ دونوں فوراً ہی اچھے دوست بن گئے۔ دونوں کئی روز باتیں کرتے، ایک دوسرے کے کہے جملے مکمل کرتے رہے۔

آخرکار جب وہ جدا ہونے لگے تو فلسفی نے گفتگو کے بارے کہا، ''وہ سب کچھ جو میں جانتا ہوں، یہ دیکھتا ہے۔''

اس کے بعد صوفی نے اپنی رُوداد بیان کی: ''میں جو کچھ دیکھتا ہوں، یہ جانتا ہے۔''

صوفی خیال کرتا ہے کہ وہ ''دیکھتا'' ہے اور فلسفی سمجھتا ہے کہ وہ ''جانتا ہے۔'' میری رائے میں وہ دونوں ہی کچھ نہیں دیکھتے اور کچھ نہیں جانتے۔ کیا وہ سمجھتے نہیں کہ سادہ، محدود اور انجام کار فانی انسان کے طور پر ہم سے اُس سے زیادہ جاننے کی توقع نہیں کی جاتی، جتنا ہمیں جاننا چاہیے؟ زیادہ سے زیادہ کوئی انسان جو حاصل کر سکتا ہے، وہ ہے خدائے باری تعالیٰ کے بارے میں سرسری علم۔ بس۔ ہماری ذمے داری خدا کی تعلیمات کی تعبیر کرنا نہیں بلکہ اُن تعلیمات کی پیروی کرنا ہے۔

جب جیرس گھر آئے تو ہم ان معاملات پر بات کریں گے۔ یہ عادت سی بن گئی ہے، ہماری چھوٹی سی روایت۔ ہر شب اپنی ذمہ داری سے واپسی کے بعد وہ میری بیوی کا پیش کیا گیا شوربہ اور روٹی کھاتا ہے اور ہم حالات پر گفتگو کرتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اُس کی اشتہا کس قدر خوب ہے۔ اُسے مضبوط اور تنا ور رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہے۔ اُس جیسے ایک نوجوان با اصول لڑکے کے پاس اس بداعمال شہر میں کرنے کو بہت کام ہے۔

شمس

قونیہ، 30 اکتوبر 1244ء

بس شب بھر ہی پہلے اس سے جب مولانا رومی سے میری پہلی ملاقات ہوئی، میں شکرفروشوں کی سرائے میں شہ نشیں پر بیٹھا تھا۔ میرا دل خدا کی بنائی اس کائنات کے جاہ وجلال پر مسرور تھا جسے اُس نے اپنے عکس پر تخلیق کیا تا کہ ہم جس طرف بھی رُخ کریں، اُسی کی تلاش وجستجو کرسکیں اور اُس کی معرفت پاسکیں۔ اور پھر بھی انسانوں نے شاذ ہی ایسا کیا۔

میں نے اُن افراد کو یاد کیا جن سے میں ملا تھا... گداگر، طوائف اور شرابی۔ عام لوگ جو ایک مشترک اور عام عارضے کا شکار تھے: خدائے واحد سے جدائی۔ وہ اُس قسم کے لوگ تھے جنہیں علما اپنے مرمریں منبروں سے دیکھنے میں ناکام رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ آیا رومی ان علما سے مختلف تھے۔ اگر نہیں، تو میں نے خود سے عہد کیا کہ مجھے اُن کے اور سماج کے نچلے طبقے کے درمیان آبی گزرگاہ کا کام کرنا ہوگا۔

شہر خوابیدہ تھا۔ یہ رات کا وہ پہر تھا جب شب خیز جانور بھی طاری سکون وامن میں مخل ہونے سے ہچکچاتے تھے۔ شہر کو خوابیدہ دیکھ اور سن کر میں بے پناہ اداس اور انتہائی شاداں وفرحاں بھی ہوجاتا تھا، حیران ہوتے اور سوچتے ہوئے کہ بند دروازوں کے پیچھے کون سی کہانیاں جی جا رہی ہوں گی۔ اگر میں نے کسی اور راستے کا انتخاب کیا ہوتا، میں کس قسم کی کہانیاں جی سکتا تھا۔ لیکن میں نے کوئی انتخاب نہ کیا تھا۔ اگر کوئی انتخاب ہوا تھا، تو میں نے نہیں بلکہ اس راہ نے مجھے منتخب کیا تھا۔

مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک سرگرداں درویش ایک ایسے شہر میں پہنچا جس کے باسی اجنبیوں پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔ ''بھاگ جاؤ!'' وہ اس پر چلائے ''یہاں تمہیں کوئی نہیں جانتا!''

درویش نے سکون سے جواب دیا، ''ہاں، لیکن میں خود کو جانتا ہوں اور میرا یقین کرو، اگر اس کے برعکس ہوتا تو بدتر ہوتا۔''

جب تک کہ میں خود سے واقف ہوں، میں ٹھیک ہوں گا۔ جو کوئی خود کو جان لیتا ہے، وہ گویا خدا کو جان لیتا ہے۔

چاند نے اپنی چاندنی میں مجھے نہلا دیا۔ ریشمی چادر جیسی نازک، ہلکی سی بارش شہر پر برسنے لگی۔ میں نے اس مبارک لمحے کے لیے خدا کا شکر ادا کیا اور خود کو اس کے سپرد کر دیا۔ زندگی کی تازگی اور اختصار نے مجھے ایک بار پھر حیران اور جذباتی کیا اور مجھے ایک اور اصول یاد دلایا: ''زندگی ایک عارضی قرضے کی طرح ہے اور یہ دنیا حقیقت کے ایک سرسری عکس جیسی ہے۔ صرف بچے ہی اصل کو چھوڑ کر کھلونے سے بہل سکتے ہیں۔ اور پھر بھی انسان، کھلونے پر فریفتہ ہو جاتے ہیں یا بے قدری سے اسے توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ اس زندگی میں ہر قسم کی انتہا سے دُور رہو کیوں کہ وہ تمہارے اندرونی توازن کو برباد کر دے گی۔

صوفی کسی بھی انتہا پر نہیں جاتا۔ صوفی ہمیشہ دھیما اور اعتدال پسند ہوتا ہے۔''

کل صبح میں جامع مسجد جاؤں گا اور مولانا رومی کا وعظ سنوں گا۔ وہ اتنے ہی عظیم مبلغ ہو سکتے ہیں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں مگر آخر میں کسی بھی خطیب کی وسعت اور دسترس کا ثبوت اُس کے سامعین ہوتے ہیں۔ مولانا رومی کے الفاظ کسی خودرَو باغ جیسے ہو سکتے ہیں، گوکھرو، جڑی بوٹیوں، جھاڑیوں اور سفیدوں سے بھرے، مگر یہ ہمیشہ سننے والے پر منحصر ہے کہ وہ ان سے کیا لیتا ہے۔ خوب صورت پھول فوراً ہی چُن لیے جاتے ہیں جب کہ چند لوگ ہی ہوتے ہیں جو خار اور کانٹوں سے پُر پودوں پر توجہ دیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اکثر انہی خاردار پودوں سے اعلیٰ ادویات تیار کی جاتی ہیں۔

کیا باغِ محبت کا بھی یہی معاملہ نہیں؟ محبت اپنے شہرے کی کیسے حق دار ہو سکتی ہے، اگر کوئی صرف خوب صورت چیزوں کو ہی منتخب کرے اور مشکلات کو چھوڑ دے؟ اچھے سے لطف اٹھانا اور برے کو ناپسند کرنا آسان ہے۔ کوئی بھی ایسا کر سکتا ہے۔ اصل دعوتِ مہارزت تو یہ ہے کہ اچھے اور برے سے یکساں محبت کی جائے، اس لیے نہیں کہ آپ کو کھردرے کے ساتھ ہموار کو بھی رکھنا ہے بلکہ اس لیے کہ آپ کو ان تشریحات سے آگے جانے اور محبت کو پوری طرح سے قبول کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک روز اور باقی ہے کہ میں اپنے ساتھی، اپنے رفیق سے ملوں گا۔ میں سو نہیں پا رہا۔

اوہ رومی! الفاظ و معانی کی سلطنت کے بادشاہ!

کیا تم جب مجھے دیکھو گے تو پہچان لو گے؟

مجھے دیکھو!

رومی

قونیہ، 31 اکتوبر 1244ء

بلاشبہ مبارک ہے یہ روز کہ میں اس روز شمس تبریز سے ملا ہوں۔ اکتوبر کے اس آخری روز، فضا میں ایک نئی خنکی ہے اور خزاں کی رخصتی کا اعلان کرتی ہوا تیزی سے چل رہی ہے۔

اس سہ پہر مسجد معمول کے مطابق پُر ہجوم تھی۔ ایک بڑے ہجوم کو تبلیغ کرتے ہوئے میں ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہوں کہ سامعین کو بھول جاؤں نہ ہی یاد رکھوں۔ اور ایسا کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے: ہجوم کو ایک فردِ واحد کے طور پر تصور کرنا۔ ہر ہفتے سینکڑوں لوگ میرا وعظ سنتے ہیں لیکن میں ہمیشہ صرف ایک شخص سے بات کرتا ہوں... وہ جو میرے الفاظ کو اپنے دل میں گونجتے سنتا ہے اور وہ جو مجھے ہر کسی سے بڑھ کر جانتا ہے۔

جب میں وعظ کے بعد مسجد سے نکلا تو میں نے اپنے گھوڑے کو اپنے لیے تیار پایا۔ گھوڑے کی ایال میں سونے کی لڑیاں اور ننھی نقرئی گھنٹیاں پروئی گئی تھیں۔ مجھے ہر قدم پر گھنٹیوں کی جھنکار سنائی دی لیکن راستہ روکتے اتنے بہت سے لوگوں کے باعث تیزی سے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ نپی تلی رفتار سے ہم خستہ حال دکانوں اور گھاس پھونس کی چھتوں والے گھروں کے قریب سے گزرے۔ سائلوں کی پکاریں، بچوں کی چیخ و پکار اور چند سکے کمانے کی خاطر گداگروں کی صدا کے ساتھ گھل مل گئیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ چاہتے تھے کہ میں ان کے لیے دعا کروں، کچھ بس میرے قریب ہو کر چلنا چاہتے تھے۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو زیادہ بڑی توقعات کے ساتھ آئے تھے، جو مجھ سے چاہتے تھے کہ میں انہیں ان کی دائمی بیماری سے، سحر یا کالے جادو سے نجات دلا دوں۔ یہی لوگ مجھے پریشان کرتے تھے۔ وہ کیوں کر یہ دیکھ نہ پاتے کہ میں کوئی پیغمبر ہوں نہ ولی، کیوں نہیں سمجھ پاتے کہ میں معجزے کر دکھانے کے قابل نہیں؟

جب ہم ایک موڑ مڑے اور شکر فروشوں کی سرائے کے قریب پہنچے تو مجھے ہجوم میں سے راہ بناتا اک سرگرداں درویش دکھائی دیا، جو اپنی چھیدتی نگاہیں مجھ پر جمائے سیدھا میری جانب آ رہا تھا۔ اُس کی

حرکات سبک تھیں اور توجہ مرکوز اور اس کے گرد خود کفیل صلاحیت کا ایک ہالہ تھا۔ اس کے کوئی بال نہ تھے۔ نہ ڈاڑھی۔ نہ بھنویں۔ اور اگرچہ اُس کا چہرہ اس قدر چوڑا تھا جتنا کسی آدمی کا ہو سکتا تھا، مگر اُس کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

لیکن وہ اس کا ظاہری حلیہ نہ تھا جس پر میرا تجسس بیدار ہوا۔ اتنے برسوں میں مَیں نے ہر قسم کے درویشوں کو معرفت حق کے سفر میں قونیہ سے گزرتے دیکھا تھا۔ گدے ہوئے جسم کے ساتھ، کانوں میں بالیوں اور ناک میں نتھ کے ساتھ، ان میں سے بیشتر لوگ لطف اٹھاتے تھے کہ ان کے پورے وجود پر ''سرکش'' لکھا تھا۔ وہ اپنے بال بہت بڑھا لیتے تھے یا پھر بالکل ہی سر ڈاڑھی منڈوا لیتے۔ بعض قلندری درویش تو اپنی زبان اور پستان تک چھدوا لیتے تھے۔ سو جب میں نے اس درویش کو پہلی بار دیکھا تو وہ اس کا بیرونی خول نہ تھا جس نے مجھے چونکایا۔ اگر میں کہنے کی جرأت کروں تو وہ اُس کی نگاہ تھی۔ اُس کا نظر جما کر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا۔

اُس کی سیاہ نگاہیں مجھ میں کسی خنجر سے زیادہ تیزی سے گزر رہی تھیں۔ وہ سڑک کے عین درمیان کھڑا ہو گیا اور اپنے بازو بلند کر لیے، یوں جیسے وہ نہ صرف جلوس کو بلکہ وقت کے بہاؤ کو بھی روکنا چاہتا تھا۔ کسی اچانک وجدان کی طرح، مجھے اپنے جسم کو ایک دھچکا سا لگتا محسوس ہوا۔ میرا گھوڑا گھبرا گیا اور اپنے سر کو اوپر نیچے جھٹکتے ہوئے اونچی آواز میں ہنہنانے لگا۔ میں نے اُسے پُرسکون کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا بدک گیا کہ مجھے بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔

میری نظروں کے سامنے درویش میرے گھوڑے کے قریب پہنچا جو بدک رہا تھا اور سم مار رہا تھا اور بے حد دھیمی سرگوشی مجھ سے کی۔ جانور ہانپنے لگا مگر جیسے ہی درویش نے آخری بار ہاتھ ہلایا، وہ فوراً پُرسکون ہو گیا۔ ہجوم میں ایک جوش سا دوڑ گیا اور میں نے کسی کو زیر لب بڑبڑاتے سنا، ''یہ کالا جادو ہے!''

اپنے گرد و پیش سے غافل درویش نے مجھے تجسس سے دیکھا۔ ''اے مشرق و مغرب کے عظیم عالم، میں نے آپ کے بارے میں بہت سنا ہے۔ میں آج یہاں ایک سوال پوچھنے آیا ہوں، کیا مجھے پوچھنے کی اجازت ہے؟''

''پوچھیے۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''خوب، اس کے لیے آپ کو گھوڑے سے اتر کر میری سطح پر میرے برابر کھڑا ہونا پڑے گا۔''

میں یہ سن کر اس قدر حیرت زدہ ہوا کہ لمحے بھر کو تو میں کچھ بول ہی نہ پایا۔ میرے ارد گرد لوگ بھی اسی طرح حیران تھے۔ اس سے پہلے کوئی بھی کبھی یوں مجھ سے مخاطب ہونے کی جرأت نہ کر پایا تھا۔

مجھے اپنا چہرہ سرخ پڑتا ہوا اور پیٹ میں کوفت اور جھلاہٹ سے بل پڑتے محسوس ہوئے لیکن میں اپنی انا اور نفس پر قابو پانے میں کامیاب رہا اور اپنے گھوڑے سے اتر آیا۔ درویش پہلے ہی رخ

موڑ کر چلنا شروع ہو چکا تھا۔

''ارے رکیے، برائے مہربانی۔'' میں اس کے برابر پہنچتے ہوئے پکار کر بولا، ''میں آپ کا سوال جاننا چاہتا ہوں۔''

وہ رکا اور مڑا، پہلی بار مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا، ''ٹھیک ہے، مجھے بتایئے کہ آپ کے خیال میں ان دونوں میں سے کون عظیم تر ہے: پیغمبر محمد ﷺ یا صوفی بسطامی؟''

''یہ کس قسم کا سوال ہے؟'' میں نے کہا، ''آپ واجب تعظیم پیغمبر ﷺ، نبی آخرالزماں کا موازنہ ایک بدنام صوفی سے کیسے کر سکتے ہیں؟''

ہمارے گرد ایک متجسس ہجوم جمع ہو چکا تھا لیکن درویش کو لگتا تھا اُن حاضرین کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ابھی بھی غور سے میرے چہرے کو پڑھتے اُس نے اصرار کیا، ''برائے مہربانی اس بارے میں سوچیے۔ کیا پیغمبر ﷺ نے کہا نہیں تھا، ''اے خدا مجھے معاف فرما دے، میں تجھے ویسے نہیں جان سکا جیسا کہ مجھے جاننا چاہیے۔'' جب کہ بسطامی نے کہا تھا، ''تعریف ہے میرے لیے، میں خدا کو اپنی چادر تلے رکھتا ہوں؟'' اگر ایک خود کو خدا کے مقابلے میں اس قدر حقیر سمجھتا ہے جب کہ دوسرا خدا کو اپنے اندر رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے تو دونوں میں سے کون عظیم ہے؟''

میرا دل میرے حلق میں دھڑکنے لگا۔ سوال اب مزید مبہم نہ رہا تھا۔ درحقیقت یوں محسوس ہوا جیسے پردہ اٹھایا جا چکا ہو اور اس کے نیچے ایک پیچیدہ معمہ میرا منتظر تھا۔ گزرتی ہوا کی طرح ایک وزدیدہ مسکراہٹ درویش کے چہرے کو چھو کر گزری۔ اب میں جان گیا تھا کہ وہ کوئی دیوانہ نہیں تھا۔ وہ ایک سوال لیے آدمی تھا... ایک سوال جس کے بارے میں مَیں نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔

''میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔'' میں نے بات شروع کی، نہ چاہتے ہوئے کہ وہ میری آواز میں موجود لرزش کو محسوس کرے۔

''میں دونوں بیانات کا موازنہ کر کے بتاؤں گا کہ کیوں، اگرچہ بسطامی کا بیان بلند تر لگتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔''

''میں سننے کو بے تاب ہوں۔'' درویش نے کہا۔

''آپ جانتے ہیں کہ خدا کی محبت ایک بحرِ بے کنار ہے اور انسان جتنا پانی اس سے لے سکتے ہیں، لینے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن انجام کار ہم میں سے ہر کوئی جتنا پانی لے سکتا ہے، وہ ہمارے پیالے پر منحصر ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس بڑا برتن ہوتا ہے جب کہ کچھ کے پاس ڈول جب کہ کچھ ایسے ہیں جن کے پاس صرف پیالے ہوتے ہیں۔''

بات کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ درویش کے چہرے کے تاثرات استہزا سے کھلی تحسین میں بدلے اور پھر کسی ایسے شخص کی سی دوستانہ مسکراہٹ میں جس نے کسی دوسرے کے الفاظ میں اپنے

خیالات کو پہچان لیا ہو۔

''بسطامی کا برتن نسبتاً چھوٹا تھا اور ان کی پیاس گھونٹ بھر کے بعد بجھ گئی۔ وہ جس مرحلے پر تھے، اُسی میں خوش تھے۔ یہ شان دار بات ہے کہ انہوں نے اپنے اندر خدا کو پہچان لیا مگر پھر بھی خدا اور ذات کے درمیان امتیاز کی باقیات تو موجود تھیں۔ وحدت حاصل نہ ہوئی۔ جہاں تک پیغمبر ﷺ کی بات ہے، وہ مصطفیٰ تھے، چنے گئے اور ان کا پیالہ کہیں بڑا تھا۔ اس وجہ سے خدا اُن سے قرآن پاک میں پوچھتا ہے، ''کیا ہم نے تمہاری خاطر تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟ (سورۃ الم نشرح، آیت 1)'' یوں ان کا دل کھول دیا گیا، ان کا پیالہ لامحدود تھا، ان کے لیے پیاس کے بعد پیاس تھی۔ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ انہوں نے فرمایا، ''ہم تجھے ویسے نہیں جانتے، جیسا ہمیں جاننا چاہیے۔'' اگرچہ یقیناً وہ خدا کو یوں جانتے تھے جیسے اور کوئی نہیں جانتا۔''

خوش دلی سے ہنستے ہوئے درویش نے سر ہلایا اور میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر اُس نے اظہار تشکر میں اپنا ہاتھ اپنے دل کے مقام پر رکھا اور کچھ لمحے اسی طرح کھڑا رہا۔ لیکن ہماری نگاہیں دوبارہ ملیں، میں نے دیکھا کہ اب اُس کی نگاہ میں نرمی کا شائبہ سا آ گیا تھا۔

میں اُس سرمئی نظارے میں درویش کے پاس سے گزر کر آگے بڑھا، جو سال کے ان دنوں ہمارے شہر کے لیے مخصوص تھا۔ ہمارے قدموں میں چند خشک پتے بکھر گئے۔ درویش نے ایک نئی دلچسپی کے ساتھ مجھے دیکھا اور ڈھلتے سورج کی مدہم پڑتی دھوپ میں، ایک لمحے بھر کو، میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اُس کے گرد عنبریں ہالہ دیکھا۔

وہ احتراماً میرے سامنے جھکا۔ اور میں اُس کے سامنے جھکا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنی دیر ہم اسی طرح رہے، ہمارے سروں پر معلق آسمان گہرا نیلا ہو گیا۔ ہماری گفتگو کے تبادلے کو ایسی حیرانی سے دیکھتے ہوئے جس کی حدیں ناپسندیدگی کو چھوتی تھیں، کچھ دیر بعد ہمارے گرد موجود ہجوم میں گھبراہٹ بھری کھلبلی سی شروع ہوئی۔ انہوں نے مجھے اس سے پہلے کبھی کسی کے سامنے جھکتے نہ دیکھا تھا اور یہ حقیقت کہ میں ایک سادہ سے سرگرداں درویش کے سامنے جھکا تھا، اس پر میرے قریب ترین شاگردوں سمیت کچھ لوگ سخت حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

درویش نے ضرور فضا میں موجود ناراضی کو محسوس کر لیا ہوگا۔

''بہتر ہوگا کہ میں اب چلوں اور آپ کو آپ کے عقیدت مندوں کے ہمراہ چھوڑ دوں۔'' اُس نے کہا۔ اس کی آواز گھٹ کر مخملیں دف تک محدود رہ گئی تھی، تقریباً ایک سرگوشی۔

''ٹھہریے۔'' میں نے ٹوکا، ''ابھی مت جایئے، برائے مہربانی۔ رکیے!''

مجھے اس کے چہرے پر تفکر کی جھلک دکھائی دی۔ اُس نے سنجیدگی سے ہونٹ سکیڑے، یوں جیسے وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا یا وہ کہنا ہی نہیں۔ اور اُس لمحے، اُس توقف میں، میں نے وہ سوال

سنا جو اُس نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں تھا۔

''اور آپ کے متعلق کیا معاملہ ہے عظیم مبلغ؟ مجھ بتایئے، آپ کا پیالہ کتنا بڑا ہے؟''

پھر کہنے کو اور کچھ باقی نہ رہا۔ ہمارے پاس الفاظ کم پڑ گئے۔ میں نے درویش کی طرف قدم بڑھایا، اتنے قریب کہ میں اُس کی سیاہ آنکھوں میں موجود سنہری دھبے دیکھ سکتا تھا۔ اچانک مجھ پر ایک عجیب احساس غالب آ گیا، یوں جیسے میں یہ لمحہ پہلے بھی گزار چکا تھا۔ ایک بار نہیں بلکہ درجن سے زائد مرتبہ۔ مجھے چھوٹی چھوٹی تفصیلات یاد آنے لگیں۔ اپنے چہرے پر نقاب ڈالے، ایک قد آور، دبلا پتلا شخص، اس کی فروزاں انگلیاں۔ اور تب میں جان گیا! درویش جو میرے سامنے کھڑا تھا، وہ کوئی اور نہیں، وہی آدمی تھا جسے میں اپنے خوابوں میں دیکھتا رہا تھا۔

میں جان گیا کہ میں نے اپنا رفیق تلاش کر لیا تھا۔ لیکن خوشی و مسرت سے بے خود ہونے کی بجائے، جیسا کہ میں نے ہمیشہ خیال کیا تھا کہ ایسے موقع پر میں ہو جاؤں گا، مجھے ایک سرد سی دہشت اور رعب نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 8جون2008ء

سوالوں میں محصور اور جوابوں سے محروم، ایلا کو معلوم ہوا کہ عزیز سے خط و کتابت سے متعلق کئی باتیں اُسے حیرت زدہ کرتی تھیں، خصوصاً یہ حقیقت کہ ایسا ہو رہا تھا۔ دونوں ہر طرح سے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھے کہ اسے حیرت تھے کہ ان میں ایسا کیا مشترک تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اتنے تواتر سے ای میل کرتے تھے۔

عزیز کسی جگسا پزل کی طرح تھا، جسے وہ ٹکڑے ٹکڑے مکمل کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اُس کی ہر نئی ای میل کے ساتھ، پزل کا ایک اور ٹکڑا اپنی جگہ پر رکھا جاتا تھا۔ ایلا کو ابھی پوری تصویر دیکھنا تھی لیکن اب تک وہ جس شخص کے ساتھ خط و کتابت کر رہی تھی، اُس کے بارے چند باتیں ہی دریافت کر پائی تھی۔

عزیز کے بلاگ سے اُسے معلوم ہوا تھا کہ وہ پیشہ ور فوٹو گرافر اور دنیا گھومنے کا شوقین تھا۔ وہ دنیا کے دُور افتادہ گوشوں میں سفر کرنا اسی قدر فطری اور آسان محسوس کرتا تھا جیسے اپنے آس پڑوس کے کسی پارک میں سیر کرنا۔ اپنے اندر وہ ایک پکا خانہ بدوش تھا جو ہر کہیں کا سفر کر چکا تھا اور سائبیریا، شنگھائی، کولکتہ اور کیسابلانکا میں بھی خود کو جیسے اپنے گھر پر پُرسکون محسوس کرتا تھا۔ صرف بیک پیک اور بانسری کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اُس نے ایسی ایسی جگہوں پر دوست بنا رکھے تھے جنہیں ایلا نقشے پر بھی نہیں ڈھونڈ پائی تھی۔ سخت گیر سرحدی محافظ، مخالفانہ حکومتوں سے ویزا حاصل کرنے کی مشکلات، پانی کے ذریعے ہونے والی بیماریاں، آلودہ کھانے کے باعث آنتوں میں کوئی خرابی، حملہ کیے جانے کا خطرہ، حکومتی فوجوں اور باغیوں کے درمیان جھڑپیں... اُسے مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب کے سفر سے کوئی بات نہ روک سکتی تھی۔

ایلا نے سوچا کہ عزیز ایک طوفانی آبشار تھا۔ جہاں وہ قدم رکھنے سے بھی خائف ہوتی، وہ وہاں پوری قوت سے تلاطم میں آتا تھا۔ جہاں وہ کچھ کرنے سے پہلے ہچکچاتی اور فکر مند ہوتی، وہاں وہ پہلے کام کرتا اور فکر مند بعد میں ہوتا تھا، اگر وہ کبھی فکر مند ہوتا بھی تھا تو۔ اس کی شخصیت جوشیلی تھی، ایک جسم میں بے انتہا

مثالیت پسندی اور جوش وجذبہ۔ وہ کئی طرح کے کام ایک ساتھ کر لیتا تھا اور خوبی سے کرتا تھا۔

ایلا خود کو ایک روشن خیال، خود رائے ڈیموکریٹ، غیر عملی یہودی اور سبزی خور بننے کی خواہش مند کے طور پر دیکھتی تھی جو کسی روز اپنے کھانے سے ہر قسم کے گوشت کو ختم کرنے کے لیے پُرعزم تھی۔ اُس نے معاملات کو واضح کیٹگریز میں تقسیم کیا، اپنے جہان کو تقریباً ویسے منظم کرتے ہوئے جیسے وہ اپنے گھر کو رکھتی تھی، صاف ستھرا اور آراستہ۔ اُس کا دماغ دو باہم غیر مربوط اور ایک سی ہی طویل فہرستوں پر کام کرتا تھا: اُس کی پسندیدہ چیزیں اور ناپسندیدہ چیزیں۔

اگرچہ وہ کسی طرح سے بھی بے دین نہ تھی اور کبھی کبھار چند مذہبی رسومات کی ادائیگی سے لطف اٹھاتی تھی، ایلا کا ماننا تھا کہ آج کی دنیا کا بڑا مسئلہ، بالکل ماضی کی طرح، مذہب تھا۔ اپنے بے مثال تکبر اور خود اعلان کردہ عقیدے کے ساتھ اپنے طور اطوار کی فوقیت یا برتری میں، مذہبی لوگ اُس کے اعصاب پر سوار ہو جاتے تھے۔ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے انتہا پسند، برے اور ناقابل برداشت تھے لیکن اندر کہیں گہرائی میں اُس کا خیال تھا کہ اسلام کے متعصب یا انتہا پسند تو بدترین تھے۔

عزیز مگر ایک روحانی آدمی تھا، جو مذہب اور عقیدے کے معاملات کو سنجیدگی سے لیتا تھا، ساری ہمعصر سیاست سے دور رہتا اور کسی چیز یا کسی شخص سے بھی ''نفرت'' نہیں کرتا تھا۔ گوشت کھانے کا شوقین، اس نے بتایا کہ وہ کبھی اچھے بنے ہوئے شیش کباب کی پلیٹ سے انکار نہ کرے۔ وہ 1970ء کی دہائی کے وسط میں الحاد چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا، جیسا کہ وہ مذاقاً کہا کرتا تھا، ''کریم عبدالجبار کے بعد اور کیٹ سٹیونز سے پہلے کسی وقت۔'' تب سے وہ ہر ملک اور مذہب کے سینکڑوں صوفیوں سے مل چکا تھا اور انہیں ''اس راہ میں اپنے بھائی اور بہن'' کہتا تھا۔

مضبوط انسان دوست نظریات کے ساتھ ایک پکا امن پسند عزیز سمجھتا تھا کہ تمام مذہبی جنگیں اپنی اصلیت میں ''لسانی مسئلہ'' تھیں۔ اُس نے کہا، زبان سچائی کو آشکار کرنے سے زیادہ اُسے چھپاتی ہے اور نتیجے کے طور پر لوگ مسلسل ایک دوسرے کو غلط سمجھتے اور غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ غلط ترجمے سے بھری دنیا میں کسی موضوع پر جمے رہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا کیوں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے مضبوط ترین ایقان بھی کسی سادہ غلط فہمی کی وجہ سے بنے ہوں۔ عمومی طور پر ہمیں کسی بھی بارے میں زیادہ بے لوچ یا سخت نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ ''زندہ رہنے کا مطلب ہے، مسلسل رنگ تبدیل کرنا۔''

عزیز اور ایلا مختلف ٹائم زون میں رہتے تھے، لفظی معانی میں اور تشبیہ کے طور پر بھی۔ ایلا کے لیے وقت کا بنیادی طور پر مطلب تھا، مستقبل۔ وہ اپنے دن کا خاصا حصہ اگلے سال، اگلے مہینے، اگلے روز یا حتیٰ کہ اگلے منٹ کے متعلق منصوبوں پر ضرورت سے زیادہ سوچنے میں لگاتی تھی۔ حتیٰ کہ خریداری یا ٹوٹی کرسی بدلنے جیسی معمولی باتوں پر بھی ایلا ہر تفصیل کا پہلے سے سوچتی تھی اور غور و خوض اور احتیاط سے شیڈول بناتی اور کرنے والے کاموں کی فہرست اپنے بیگ میں ساتھ رکھتی تھی۔

دوسری جانب عزیز کے نزدیک وقت بھی ایک لمحہ، موجود تھا اور حال کے اِس لمحے کے علاوہ کچھ بھی محض ایک فریب خیال تھا۔ اسی وجہ سے اُس کا ماننا تھا کہ محبت کا ''آنے والے کل کے منصوبوں'' سے کوئی تعلق تھا نہ ہی ''گزرے کل کی یادوں'' سے۔ محبت بس ابھی اور یہیں ہو سکتی تھی۔ ایلا کو بھیجی اُس کی پرانی ای میلز میں ایک کا اختتام اس پر ہوا تھا: ''میں ایک صوفی ہوں، لمحہ موجود کی اولاد۔''

''کس قدر عجیب بے تکی بات ہے یہ۔'' ایلا نے اُسے جواب میں لکھا تھا، ''اُس عورت کے لیے جس نے ہمیشہ اپنا بہت سا وقت گزرے کل کے بارے سوچتے گزارا ہو اور اُس سے زیادہ وقت مستقبل کے بارے میں فکر کرتے ہوئے، لیکن کسی طور اُس نے کبھی حال کے لمحے کو چھوا تک نہ ہو۔''

علاؤالدین

قونیہ،16 دسمبر 1244ء

بدقسمتی سے میں وہاں موجود نہ تھا جب درویش کی میرے والد سے سرِ راہ ملاقات ہوئی۔ میں کچھ دوستوں کے ہمراہ ہرن کے شکار کے لیے گیا ہوا تھا اور اس سے اگلے روز واپس آیا تھا۔ تب تک میرے والد کی شمس تبریز سے ملاقات کا واقعہ شہر بھر میں زبان زدِ عام ہو چکا تھا۔ لوگوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں پھیلائیں کہ وہ درویش کون تھا اور کیسے رومی جیسے ایک عالم فاضل شخص نے اُسے سنجیدگی سے لیا تھا، اس حد تک کہ اُس کے سامنے جھک گئے تھے؟

اپنے بچپن سے میں نے لوگوں کو اپنے والد کے سامنے احتراماً جھکتے دیکھا تھا اور کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ اس کے برعکس بھی کچھ ہو سکتا تھا... یعنی بجز اس کے کہ اگلا شخص بادشاہ یا وزیرِ اعظم ہوتا۔ سو آدمی باتیں جو میں نے سنیں، ان پر یقین کرنے سے میں نے انکار کر دیا اور ان باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا، یہاں تک کہ میں گھر پہنچا اور میری سوتیلی والدہ کیرا نے، جو کبھی جھوٹ بولتی ہیں نہ ہی مبالغہ آرائی کرتی ہیں، اس پوری کہانی کی تصدیق کی۔ ہاں، یہ سچ تھا، شمس تبریز نامی ایک سرگرداں درویش نے سب کے سامنے میرے والد سے مبارزت طلبی کی تھی اور اس پر مستزاد، وہ اب ہمارے گھر میں مقیم تھا۔

یہ اجنبی کون تھا جو آسمان سے گرے کسی پُراسرار پتھر کی طرح ہماری زندگیوں میں اچھل کر آشامل ہوا تھا؟ اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے اشتیاق میں مَیں نے کیرا سے پوچھا، ''وہ آدمی کہاں ہے؟''

''خاموش رہو۔'' کیرا نے کچھ گھبراتے ہوئے سرگوشی کی، ''تمہارے والد اور درویش کتب خانے میں ہیں۔''

ہم دُور سے اُن کی آوازوں کی ہلکی سی بھنبھناہٹ سن سکتے تھے، اگرچہ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ بات کیا کر رہے تھے۔ میں اُس سمت میں آگے بڑھا مگر کیرا نے مجھے روک دیا۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔انہوں نے کہا تھا کہ کوئی بھی مخل نہ ہو۔"

دن بھر وہ کتب خانے سے باہر نہ نکلے۔اگلے روز اور نہ ہی اُس سے اگلے روز۔وہ ممکنہ طور پر کس بارے میں باتیں کر سکتے تھے؟ میرے والد جیسے کسی شخص اور ایک سادہ درویش میں بھلا کیا مشترک ہو سکتا تھا؟

ایک ہفتہ بیت گیا، پھر ایک اور۔ ہر صبح کیرا ناشتہ تیار کرتی اور اُن کے دروازے کے سامنے طشت رکھ دیتی تھی۔وہ اُن کے لیے نفاست سے چاہے جو کچھ بھی تیار کرتی، وہ سب سے انکار کر دیتے، صبح روٹی کے ایک ٹکڑے اور شام کو بکری کے دودھ کے ایک پیالے پر صابر و قانع رہتے۔

بے چینی اور اعصابی تناؤ میں مجھ پر اس دوران بدمزاجی طاری ہو گئی۔دن کے مختلف پہر میں میں نے کتب خانے کے دروازے کی ہر درز اور سوراخ سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔اس بات کی میں نے بالکل پرواہ نہ کی کہ اگر وہ اچانک دروازہ کھول لیں اور مجھے وہاں چھپ کر کن سوئیاں لیتے پائیں گے تو کیا ہوگا۔میں نے خاصا وقت وہاں جھک کر یہ سمجھنے کی کوشش کرتے گزارا کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔لیکن میں صرف ہلکی سی بڑبڑاہٹ ہی سن پایا۔میں کچھ زیادہ دیکھ بھی نہ پایا۔کمرا نیم تاریک تھا کیوں کہ پردے آدھے گرے ہوئے تھے۔بغیر زیادہ کچھ دیکھے پائے، میں نے اپنے دماغ کو اجازت دے دی کہ ان خاموشیوں کی جگہ سرگرمی سے ان باتوں کو خود گھڑ کر سوچ لے جو وہ کر رہے ہوں گے۔

ایک مرتبہ کیرا نے مجھے دروازے سے کان لگائے پایا لیکن کہا کچھ نہیں۔اس وقت تک وہ مجھ سے زیادہ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو چکی تھی کہ ہو کیا رہا تھا۔عورتیں اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں، یہ ان کی فطرت ہے۔

لیکن جب میرے بھائی سلطان ولد نے مجھے کن سوئیاں لیتے پکڑا تو کہانی مختلف تھی۔اُس نے مجھے غصے سے دیکھا، اس کے چہرے پر رکھائی اور تلخی تھی۔

"تمہیں دوسروں کی جاسوسی کرنے کا کوئی حق نہیں، خصوصاً اپنے والد کی تو بالکل نہیں۔" اُس نے سرزنش کی۔

میں نے کندھے اچکا دیئے۔"ایمان داری سے بتاؤ برادر، کیا تمہیں فکر نہیں ہوتی کہ ہمارے بابا ایک اجنبی کے ساتھ وقت گزارتے ہیں؟ اب ایک مہینے سے زیادہ وقت ہو چکا ہے۔بابا نے اپنے خاندان کو ایک طرح نظر انداز کر دیا ہے۔اس پر تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی؟"

"ہمارے بابا نے کسی کو نظر انداز نہیں کیا۔" میرے بھائی نے کہا، "انہیں شمس تبریز کی صورت میں ایک بہت اچھا دوست مل گیا ہے۔کسی ننھے بچے کی طرح خفا ہونے اور شکایت کرنے کی بجائے تمہیں اپنے والد کے لیے خوش ہونا چاہیے۔یعنی اگر تم واقعی اُن سے سچی محبت کرتے ہو تو۔"

یہ اس قسم کی بات تھی جو صرف میرا بھائی ہی کہہ سکتا تھا۔میں اس کی انوکھی باتوں اور انفرادیت

کا عادی تھا، اس لیے میں اُس کے اس شدید قسم کے تبصرے پر برہم نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ سے ایک اچھا لڑکا تھا، خاندان بھر اور آس پڑوس کا پیارا اور میرے والد کا پسندیدہ بیٹا۔

☼

میرے والد اور درویش کے کتب خانے میں حجرہ نشین ہونے کے ٹھیک چالیس روز بعد کچھ عجیب واقعہ رونما ہوا۔ میں معمول سے زیادہ گہری خاموشی کو چھپ کر سنتے ایک بار پھر دروازے کے ساتھ چپکا کھڑا تھا، جب اچانک میں نے درویش کو بولتے سنا۔

''ہمیں یہاں گوشہ نشین ہوئے چالیس روز ہو چکے ہیں۔ ہر روز ہم نے مذہبِ عشق کے چالیس اصولوں میں سے ایک پر بات کی۔ اب جب کہ ہم یہ مکمل کر چکے ہیں، میرا خیال ہے کہ ہمیں باہر نکلنا چاہیے۔ آپ کی عدم موجودگی ہو سکتا ہے آپ کے خاندان کو پریشان کرے۔''

میرے والد نے اختلاف کیا۔ ''فکر مت کیجئے۔ میری بیوی اور بیٹے اتنے سمجھ دار ضرور ہیں کہ سمجھ سکیں کہ میں کچھ وقت ان سے دُور گزارنا چاہ سکتا ہوں۔''

''اچھا، میں آپ کی بیوی کے بارے میں تو نہیں جانتا لیکن آپ کے دونوں بیٹے دن اور رات کی طرح مختلف ہیں۔'' شمس نے جواب دیا۔ ''بڑا بیٹا تو آپ کے نقشِ قدم پر چلتا ہے مگر چھوٹے والا، مجھے اندیشہ ہے کہ بالکل ہی مختلف ڈگر پر ہے۔ اُس کا دل خفگی اور رشک وحسد سے سیاہ ہے۔''

غصے واشتعال سے میرے رخسار جل اٹھے۔ وہ میرے بارے میں اس قدر ناگوار بات کیسے کہہ سکتا تھا جب کہ ہم ابھی ملے بھی نہ تھے؟

''اس کا خیال ہے کہ میں اُسے جانتا نہیں لیکن میں جانتا ہوں۔'' درویش نے کچھ دیر بعد کہا، ''جب وہ مجھے درزوں سے جھانک کر دیکھتا ہوا دروازے سے لگا کھڑا تھا تو میں بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔''

مجھے اچانک اپنے آپ میں سے ایک سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی اور میرے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک لمحہ بھی سوچے بغیر میں نے دروازہ دھکیل کر کھولا اور بھاری قدموں سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ عدم فہمی سے میرے والد کی آنکھیں پھیل گئیں لیکن اُن کے اس حیرت کے جھٹکے کو برہمی میں بدلنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

''علاؤ الدین، کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ تمہیں ہمارے بیچ یوں مخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی!'' میرے والد گرجے۔

اس سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے شمس تبریز کی طرف اشارہ کیا اور بولا، ''آپ پہلے اس سے کیوں نہیں پوچھتے کہ اسے میرے بارے میں یوں بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

میرے والد نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ انہوں نے بس مجھے نظر بھر کر دیکھا اور گہری سانس بھری، یوں جیسے میری موجودگی ان کے کندھوں پر کسی بھاری بوجھ کی طرح تھی۔

''برائے مہربانی بابا، کیرا آپ کی کمی محسوس کرتی ہے۔ اور آپ کے طلبا بھی۔ آپ اس غلیظ درویش کے لیے اپنے سب پیاروں سے منہ کیسے موڑ سکتے ہیں؟''

اپنی زبان سے وہ الفاظ ادا کرتے ہی مجھے ان پر پچھتاوا ہوا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرے والد نے اپنی نگاہوں میں مایوسی بھرے مجھے دیکھا۔ میں نے انہیں اس طرح پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

''علاؤالدین، خود پر ایک مہربانی کرو۔ یہاں سے نکل جاؤ... اسی لمحے۔'' میرے والد نے کہا، ''کسی پرسکون خاموش گوشے میں جاؤ اور سوچو کہ تم نے ابھی کیا کیا ہے۔ جب تک تم اپنے اندر جھانک نہ لو اور اپنی غلطی کو پہچان نہ لو، مجھ سے بات مت کرنا۔''

''لیکن، بابا...''

''نکل جاؤ!'' میرے والد نے مجھ سے منہ پھیرتے ہوئے دہرایا۔

ڈوبتے دل کے ساتھ میں کمرے سے باہر نکلا۔ میری ہتھیلیاں پسیج گئی تھیں اور میرے گھٹنے کپکپا رہے تھے۔

اس لمحے مجھ پر یہ بات روشن ہوئی کہ کسی ناقابلِ فہم طریقے سے ہماری زندگیاں بدل چکی تھیں اور کچھ بھی اب پہلے جیسا نہ رہتا۔ آٹھ برس پہلے میری ماں کی وفات کے بعد سے یہ دوسری مرتبہ تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے ماں باپ میں سے کسی نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

رومی

قونیہ، 18 دسمبر 1244ء

''بطن اللہ... خدا کا مخفی چہرہ۔ میرے قلب کو کھول دیجئے تا کہ میں حق کو دیکھ سکوں۔''

جب شمس تبریز نے پیغمبر محمد ﷺ اور صوفی بسطامی کے بارے میں مجھ سے سوال پوچھا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے روئے زمین پر ہم دو لوگ ہی باقی رہ گئے تھے۔ ہمارے سامنے راہِ حق کے سات مراحل کھلے تھے... سات مقامات جن پر سے ہر نفس کو معرفتِ حق اور یکتائی کے حصول کے لیے گزرنا پڑتا ہے۔

پہلا مقام ہے، نفس امارہ۔ وجود کی سب سے قدیم اور معمول کی حالت جب روح دنیاوی شغل کے دام میں پھنسی ہوتی ہے۔ بیشتر انسان اسی حالت میں پھنسے رہتے ہیں، اپنے نفس کی خدمت میں تگ ودو کرتے اور تکلیف جھیلتے لیکن اپنی مسلسل ناخوشی کے لیے ہمیشہ دوسروں کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔

اگر اور جب کوئی شخص نفس کی خواری کی حالت سے آگاہ ہو جاتا ہے تو خود پر محنت کرتے ہوئے وہ اگلے مرحلے یا مقام پر پہنچ سکتا ہے، جو ایک طرح سے پچھلے نفس یا مقام کے بالکل برعکس ہے۔ اس مقام پر جو شخص پہنچ جاتا ہے، وہ سارا وقت دوسرے لوگوں کو الزام دینے کی بجائے خود کو الزام دیتا ہے، بعض اوقات نفس کی فنا کی حد تک۔ یہاں نفس، نفس لوامہ بن جاتا ہے اور یوں تزکیہ نفس کے سفر کا آغاز کرتا ہے۔

تیسرے مرحلے میں شخص زیادہ بالغ اور صاحب فہم ہو جاتا ہے اور نفس ترقی کر کے ملہمہ نفس بن جاتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں، اس سطح پر ہی کوئی شخص ''دستبرداری'' کے لفظ کے سچے معانی کا تجربہ کر سکتا ہے اور وادیٔ علم کی سیر کرتا ہے۔ کوئی بھی جو اس مقام تک پہنچ جائے وہ صبر، استقامت، حکمت اور انکساری کا حامل ہوگا۔ دنیا نئی اور القا و فیض سے بھرپور محسوس ہوگی۔ اس کے باوجود، بہت سے لوگ جو تیسرے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، انہیں یہیں ٹھہر جانے کی خواہش ہونے لگتی ہے، وہ آگے بڑھنے کا عزم و حوصلہ کھو دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تیسرا مقام خوب صورت اور مبارک ہونے کے باعث اُن لوگوں کے لیے ایک جال ہی ہے جو بلند تر مقصد رکھتے ہیں۔

وہ لوگ جو مزید آگے بڑھنے میں کامیاب رہتے ہیں، علم وحکمت کی وادی میں قدم دھرتے ہیں اور نفس مطمئنہ سے واقف ہوتے ہیں۔ یہاں نفس وہ نہیں رہتا جو کبھی ہوا کرتا تھا، کہ وہ شعور کی بلند تر سطح میں بدل جاتا ہے۔ جو کوئی یہاں پہنچتا ہے، اُس کا ساتھ دینے والی بنیادی خصوصیات میں سخاوت، شکر گزاری اور زندگی کے مصائب ومشکلات کے باوجود اطمینان کا ایک غیر متزلزل اٹل احساس شامل ہیں۔ اس سے آگے وحدانیت کی وادی ہے۔ یہاں جو لوگ پہنچتے ہیں، خدا انہیں جس بھی صورت حال میں ڈالے، وہ اس پر مطمئن اور راضی رہتے ہیں۔ دنیاوی معاملات اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے یا انہیں ان سے فرق نہیں پڑتا کیوں کہ وہ نفس راضیہ حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔

نفس راضیہ سے اگلا مرحلہ نفس مرضیہ ہے جب وہ شخص انسانیت کے لیے مشعل راہ بن جاتا ہے، جو کوئی مانگے یا چاہے اُس کے لیے کسی اصلی استاد یا مرشد کی طرح تعلیم دیتا اور روشنی سے منور کرتا ہوا توانائی خارج کرتا ہے۔ بعض اوقات ایسے شخص کو شفایابی کی طاقت بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ جہاں کہیں جاتا ہے، لوگوں کی زندگیوں کو بدل دیتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا کرنے کی خواہش رکھتا ہے، اُس کا بنیادی مقصد دوسرے انسانوں کی خدمت کے ذریعے خدا کی تعمیل اور رضا ہوتا ہے۔

بالآخر ساتویں مرحلے پر کوئی شخص نفس ذکیہ حاصل کرتا اور انسانِ کامل بن جاتا ہے، ایک مکمل بے عیب انسان۔ لیکن کوئی بھی اس منزل کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا اور چاہے کوئی چند ایک لوگ جان بھی لیں تو وہ اس بارے میں بات نہ کریں گے۔

راہِ حق کے مراحل کو مختصراً بیان کرنا بے حد آسان مگر ان کا تجربہ کرنا بے حد دشوار ہے۔ اس راہ میں آنے والی رکاوٹیں وہ حقیقت ہیں جس کے باعث مسلسل ترقی کی کوئی ضمانت نہیں۔ پہلے سے آخری مرحلے تک تمام راستہ ہر طرح سے خطِ مستقیم کی صورت ہے۔ لڑکھڑا کر واپس پچھلے مقامات پر پہنچنے کا خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے، بعض اوقات کسی اعلیٰ تر مقام سے واپس پہلے مقام پر۔ راستے میں موجود بہت سے پھندوں اور جال کے باعث کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہر صدی میں صرف چند لوگ ہی آخری مقام تک پہنچ پاتے ہیں۔

☼

سو جب شمس تبریز نے مجھ سے وہ سوال پوچھا تو وہ صرف موازنے کی بات نہیں کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں غور کروں کہ میں خدا میں جذب ہونے کے لیے اپنی ذات کو فنا کرنے کی خاطر کتنی دُور جانے تک آمادہ ہوں۔ اس پہلے سوال کے اندر ایک دوسرا سوال مخفی تھا۔

''آپ کا کیا معاملہ ہے، عظیم مبلغ؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے، ''سات مقامات میں سے آپ کس مقام پر ہیں؟ اور آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ آگے جا سکتے ہیں، آخری مقام تک؟ مجھے بتائیے، آپ کا پیالہ کتنا بڑا ہے؟''

کیرا

قونیہ، 18 دسمبر 1244ء

بہ خوبی آگاہ ہوں میں کہ اپنے نصیب پر ماتم کرنے سے مجھے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ پھر بھی میں یہ تمنا کرنے پر مجبور ہوں کہ کاش میں زیادہ باعلم ہوتی، مذہب میں، تاریخ اور فلسفے میں اور اُن تمام چیزوں کے بارے میں جن سے متعلق مولانا رومی اور شمس تبریز دن رات باتیں کر رہے ہوں گے۔ کوئی وقت ہوتا ہے جب میں اپنے عورت کے طور پر تخلیق کیے جانے کے خلاف بغاوت کرنا چاہتی ہوں۔ جب آپ لڑکی ہی پیدا ہوں تو آپ کو کھانا پکانا، صفائی کرنا، گندے کپڑے دھونا، پرانی جرابوں کی مرمت کرنا، مکھن اور پنیر تیار کرنا اور بچوں کو کھلانا سکھایا جاتا ہے بس۔ بعض عورتوں کو محبت کا فن اور خود کو مردوں کے لیے پُرکشش بننا بھی سکھایا جاتا ہے۔ لیکن بس یہی کچھ ہے۔ کوئی بھی عورتوں کو ان کی آنکھیں کھولنے کو کتابیں نہیں دیتا۔

ہماری شادی کے پہلے برس، جب کبھی موقع ملتا، میں چھپ کر رومی کے کتب خانے میں گھس جاتی تھی۔ میں وہاں اُن کتابوں کے درمیان بیٹھ جاتی جن سے انہیں بے پناہ محبت تھی، گرد آلود اور پھپھوندی زدہ مہک میں سانس لیتی، حیران ہوتی کہ ان کتابوں کے اندر کیا اسرار نہاں تھے۔ میں جانتی تھی کہ مولانا رومی کو یہ کتابیں کس قدر مرغوب تھیں، جن میں سے بیشتر ان کے مرحوم والد بہاء الدین سے انہیں وراثت میں ملی تھیں، وہ خاص طور ''معارف'' کے بے حد دلدادہ تھے۔ کئی راتوں کو وہ صبح تک بیدار اس کا مطالبہ کرتے، اگرچہ مجھے شبہ تھا کہ انہیں اس کا تمام متن از بر تھا۔

''لوگ چاہے مجھے سونے سے بھری بوریاں دیں، میں تب بھی ان کے بدلے اپنے والد کی کتابیں نہ دوں گا۔'' مولانا رومی کہا کرتے تھے، ''ان میں سے ہر کتاب میرے آباؤاجداد کی انمول وراثت ہے۔ میں نے انہیں اپنے والد سے لیا اور میں یہ اپنے دونوں بیٹوں کو منتقل کروں گا۔''

مجھے یہ بات مشکل سے سمجھ آئی کہ انہیں اپنی کتابوں کی کتنی قدر تھی۔ ابھی ہماری شادی کا پہلا

ہی سال تھا جب ایک روز میں گھر پر اکیلی تھی۔ مجھے کتب خانے میں کتابوں سے گرد جھاڑنے کا خیال آیا۔

میں نے طاقوں سے تمام کتابیں نکالیں اور عرقِ گلاب میں بھیگے مخملیں کپڑے سے ان کے سرورق صاف کیے۔ مقامی لوگوں کا خیال ہے، کیبی کیج نامی ایک نوعمر جن ہے جسے کتابیں برباد کر کے بڑی مسرت ملتی ہے۔ اس جن کو بھگانے کے لیے روایت ہے کہ ہر کتاب کے اندر انتباہ کے طور پر ایک تحریر لکھی جاتی ہے: ''ساکت ہو جاؤ کیبی کیج (Kebikec)، اس کتاب سے دُور رہو!'' مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ میرے خاوند کی کتابوں سے صرف کیبی کیج کو نہیں بلکہ مجھے بھی دُور رہنا چاہیے تھا؟

اُس سہ پہر میں نے کتب خانے کی ہر کتاب سے گرد جھاڑی اور اُسے صاف کیا۔ کام کے دوران میں نے غزالی کی ''احیائے علوم'' پڑھی۔ تبھی جب مجھے اپنے عقب میں ایک خشک اجنبیت بھری آواز سنائی دی تو مجھے ادراک ہوا کہ میں نے وہاں کتنا وقت گزارا تھا۔

''کیرا، تمہارا کیا خیال ہے کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

وہ مولانا رومی تھے، یا کوئی جو اُن سے مشابہ تھا... اُن کا لہجہ سخت تھا، تاثرات سخت گیر۔ ہماری شادی کے ان تمام آٹھ برسوں میں وہ پہلی اور واحد مرتبہ تھی کہ انہوں نے مجھ سے اس طرح بات کی۔

''میں صفائی کر رہی ہوں۔'' میں نے زیرِ لب کہا۔ میری آواز کمزور تھی۔ ''میں اس سے آپ کو حیران کرنا چاہتی تھی۔''

مولانا رومی نے جواب دیا، ''میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن برائے مہربانی آئندہ میری کتابوں کو ہاتھ مت لگانا۔ درحقیقت میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کمرے میں ہی داخل نہیں ہونا چاہیے۔''

اس روز کے بعد میں کتب خانے سے دُور رہی، چاہے گھر پر کوئی نہ بھی ہوتا۔ میں سمجھ گئی اور میں نے قبول کر لیا کہ کتابوں کی دنیا میرے لیے کبھی تھی اور نہ کبھی ہو گی۔

لیکن جب شمس تبریز ہمارے گھر آئے اور وہ اور میرے شوہر چالیس روز تک کتب خانے میں گوشہ نشین ہو گئے، مجھے اپنے اندر ایک پرانی خفگی ابلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک زخم جس سے میں کبھی واقف بھی نہ رہی تھی کہ مجھ میں تھا، اُس سے لہو رِسنے لگا۔

کیمیا

قونیہ، 20 دسمبر 1244ء

میں طورس پہاڑوں کی ایک وادی میں سادہ لوح دہقانوں کے ہاں پیدا ہوئی۔ میں بارہ برس کی تھی جب رومی نے مجھے لے پالک بنایا۔ میرے حقیقی والدین ان لوگوں میں سے تھے جو محنت مشقت کرتے اور وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ہم چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ میری بہن اور میں ایک ہی کمرے میں اپنے مرحوم بہن بھائیوں کے آسیبوں کے ہمراہ رہتے تھے۔ پانچ بچے جو سادہ سی عام بیماریوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ میں گھر میں واحد تھی جو اُن آسیبوں کو دیکھ سکتی تھی۔ ہر بار جب میں ذکر کرتی کہ وہ ننھی روحیں کیا کر رہی تھیں تو میری بہن دہشت زدہ ہو جاتی اور میری ماں رونے لگتی تھی۔ میں نے یہ سمجھانے کی بے کار کوشش کی کہ انہیں ڈرنے یا فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیوں کہ میرے مرنے والے بہن بھائیوں میں سے کوئی بھی دہشت انگیز یا ناخوش نہ تھا۔ یہ بات میں اپنے گھر والوں کو کبھی نہ سمجھا پائی۔

ایک روز ایک تارکِ دنیا زاہد ہمارے گاؤں سے گزرا۔ اُسے بے حد تھکن زدہ دیکھ کر میرے بابا نے دعوت دی کہ وہ ہمارے گھر شب بسری کرے۔ اُس شام جب ہم سب آتش دان کے گرد بیٹھے بکرے کے پنیر کے کباب بھون رہے تھے تو اُس زاہد نے ہمیں دُور دراز علاقوں کی مسحور کن کہانیاں سنائیں۔ اُس کی آواز کی بھنبھناہٹ میں مَیں نے آنکھیں بند کیں اور اُس کے ہمراہ عرب کے صحراؤں، شمالی افریقہ کے بدوؤں کے خیموں اور نیلے ترین پانیوں والے سمندر کا سفر کیا جسے بحرِ اوقیانوس کہا جاتا ہے۔ مجھے وہاں ساحل پر ایک سیپی ملی، بڑی سی اور مرغولے دار اور وہ میں نے اپنی جیب میں رکھ لی۔ میں ساحل کے ایک سے دوسرے سرے تک سیر کرنا چاہتی تھی مگر ایک تیز اور کراہت انگیز بُو نے مجھے آدھے راستے میں روک دیا۔

اپنی آنکھیں کھولنے پر میں نے خود کو فرش پر لیٹے پایا جب کہ گھر کے سب لوگ میرے گرد جمع

تھے اور فکرمند دکھائی دیتے تھے۔ میری ماں ایک ہاتھ سے میرا سر تھامے ہوئے تھیں اور اُن کے دوسرے ہاتھ میں آدھا پیاز تھا جو وہ مجھے سونگھا رہی تھیں۔

''یہ ہوش میں آگئی ہے!'' میری بہن نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

''شکر خدا کا!'' میری ماں نے گہری سانس بھری۔ پھر وہ اُس زاہد کی جانب مڑ کر بتانے لگیں۔ ''بچپن سے، کمیا پر بے ہوشی کے دورے پڑتے ہیں۔ ایسا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔''

صبح کو زاہد نے ہماری مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور الوداع کہا۔

تاہم رخصت ہونے سے قبل اُس نے میرے بابا سے کہا، ''تمہاری بیٹی، کمیا ایک غیر معمولی بچی ہے۔ اسے خداداد صلاحیت سے نوازا گیا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی اگر اس انعام کی قدر نہ کی جائے۔ تمہیں اس کو مدرسے بھیجنا چاہیے....''

''کسی لڑکی کو تعلیم کی کیا ضرورت ہے؟'' میری ماں نے بے ساختہ کہا، ''تم نے ایسی بات کہاں سے سنی؟ جب تک کہ اس کی شادی نہیں ہو جاتی، اسے میرے ساتھ رہنا اور قالین بننے چاہئیں۔ قالین بننے میں یہ بڑی ماہر ہے۔''

لیکن زاہد اپنی بات پر قائم رہا۔ ''اچھا، یہ کسی روز ایک بہتر عالم بن سکتی ہے۔ یقیناً خدا نے تمہاری بیٹی کو لڑکی بنا کر نامہربانی نہیں کی اور اس کو بہت سے انعامات سے نوازا ہے۔ کیا تم خدا سے بہتر طور پر جاننے کا دعویٰ کرتی ہو؟'' اُس نے پوچھا، ''اگر کوئی مدرسہ دستیاب نہیں تو اسے کسی عالم کے پاس بھیجو تاکہ یہ وہ تعلیم حاصل کر سکے جس کی یہ مستحق ہے۔''

میری ماں نے اپنا سر جھٹک دیا۔ لیکن میں دیکھ سکتی تھی کہ میرے بابا کی سوچ مختلف تھی۔ تعلیم اور علم سے اُن کی محبت اور میری قابلیت پر ان کی قدر و تحسین کو جانتے ہوئے مجھے حیرت نہ ہوئی جب میں نے انہیں کہتے سنا، ''ہمیں کسی عالم کے بارے میں نہیں معلوم۔ مجھے وہ کہاں سے ملیں گے؟''

تبھی تھا کہ زاہد نے وہ نام ادا کیا جو میری زندگی بدل دیتا۔ اُس نے کہا، ''میں قونیہ کے ایک حیرت انگیز عالم کو جانتا ہوں جن کا نام ہے، مولانا جلال الدین رومی۔ وہ، کمیا جیسی لڑکی کو تعلیم دے کر خوش ہوں گے۔ اسے اُن کے پاس لے جاؤ۔ تم اس فیصلے پر کبھی نہیں پچھتاؤ گے۔''

زاہد کے جانے کے بعد میری ماں نے واویلا شروع کر دیا۔ ''میں حاملہ ہوں۔ جلد ہی اس گھر میں کھلانے کو ایک اور منہ آجائے گا۔ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ کسی لڑکی کو کتابوں کی نہیں بلکہ گھر کے کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

مجھے اچھا لگتا اگر میری ماں نے کسی اور وجوہات سے میرے جانے کی مخالفت کی ہوتی۔ اگر انہوں نے کہا ہوتا کہ وہ میری کمی محسوس کریں گی اور برداشت نہیں کریں گی کہ مجھے کسی اور خاندان کے حوالے کر دیا جائے، چاہے عارضی طور پر ہی سہی، اس صورت میں میں وہیں رکنے کا انتخاب کر سکتی تھی۔ لیکن

انہوں نے ایسا کچھ نہ کہا۔ بہر صورت، میرے بابا قائل تھے کہ زاہد کی بات میں وزن تھا اور چند روز میں میں بھی قائل ہو گئی۔

کچھ عرصے بعد، میرے بابا اور میں نے قونیہ کا سفر کیا۔ ہم اُس مدرسہ کے باہر مولانا رومی کے منتظر رہے جہاں وہ تعلیم دیتے تھے۔ جب وہ باہر نکلے تو میں اس قدر سراسیمہ تھی کہ نگاہ اٹھا کر انہیں نہ دیکھ پائی۔ اس کی بجائے میں نے اُن کے ہاتھوں کو دیکھا۔ ان کی انگلیاں لمبی، نازک اور لچک دار تھیں، کسی عالم سے زیادہ کسی صناع یا ہنر مند ہاتھوں کی طرح۔ میرے بابا نے مجھے اُن کی طرف دھکیل کر آگے کیا۔

''میری بیٹی میں خداداد قابلیت ہے۔ لیکن میں سادہ سا آدمی ہوں اور میری بیوی بھی۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ علاقے کی سب سے باعلم شخصیت ہیں۔ کیا آپ اسے تعلیم دینے پر رضا مند ہوں گے؟''

اُن کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر میں محسوس کر سکتی تھی کہ مولانا رومی حیران نہ تھے۔ وہ اس قسم کی درخواستوں کے عادی رہے ہوں گے۔ جب میرے بابا اور وہ بات چیت کرنے لگے تو میں صحن کی جانب بڑھی جہاں مجھے کئی لڑکے تو دکھائی دیئے مگر لڑکی کوئی نہیں۔ لیکن واپسی پر مجھے ایک خوش گوار حیرت ہوئی جب میں نے ایک گوشے میں ایک نوجوان عورت کو اکیلے کھڑے پایا، اُس کا گول چہرہ اتنا ساکن اور گورا تھا جیسے سنگِ مرمر کو تراش کر بنایا گیا ہو۔ میں نے اس کی جانب ہاتھ ہلایا۔ وہ حیرت زدہ دکھائی دی لیکن ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اُس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

''سلام، ننھی لڑکی، کیا تم مجھے دیکھ سکتی ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

میرے اثبات میں سر ہلانے پر وہ عورت مسکراتے ہوئے تالیاں بجانے لگی۔ ''حیرت انگیز بات ہے! اور تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا!''

ہم واپس میرے بابا اور مولانا رومی کی طرف آئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اُسے دیکھ کر باتیں کرنا بند کر دیں گے لیکن وہ ٹھیک کہتی تھی ... وہ اُسے دیکھ نہیں پائے۔

''یہاں آؤ، کمیا۔'' مولانا رومی نے کہا، ''تمہارے بابا نے مجھے تعلیم حاصل کرنے کے تمہارے شوق کا بتایا ہے۔ مجھے بتاؤ، کتابوں میں ایسا کیا ہے جو تمہیں سب سے زیادہ پسند ہے؟''

جواب دینے کے ناقابل، مفلوج، میں نے مشکل سے تھوک نگلی۔ ''بتاؤ، میری پیاری بچی۔'' میرے بابا نے مایوس سا ہو کر مجھ سے کہا۔

میں درست طور پر جواب دینا چاہتی تھی، ایسا جواب جس پر میرے بابا کو ناز ہوتا، ماسوائے اس کے کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا جواب تھا۔ اپنے اضطراب میں میرے منہ سے جو واحد آواز نکلی، وہ تھی ایک ناامیدی ہچکی۔

اگر اُس نوجوان عورت نے مداخلت نہ کی ہوتی تو میں اور بابا خالی ہاتھ ہی واپس گاؤں جاتے۔ اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور بولی، ''بس اپنے بارے میں سچ بتا دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، میں وعدہ

کرتی ہوں۔''

بہتر محسوس کرتے ہوئے میں مولانا رومی کی طرف مڑی اور بولی، ''آفندی، آپ کے ساتھ قرآن پاک پڑھنا میرے لیے اعزاز ہوگا۔ میں محنت سے خائف نہیں ہوں۔''

مولانا رومی کا چہرہ روشن ہو گیا۔ ''یہ بہت اچھی بات ہے۔'' انہوں نے کہا اور پھر انہوں نے توقف کیا، یوں جیسے انہیں ابھی ابھی کوئی ناگوار تفصیل یاد آ گئی ہو۔ ''لیکن تم ایک لڑکی ہو۔ چاہے ہم خوب محنت سے تعلیم حاصل کریں اور خوب ترقی کریں، جلد ہی تمہاری شادی ہو جائے گی اور تمہارے بچے ہوں گے۔ برسوں کی تعلیم بے کار ہو جائے گی۔''

اب مجھے معلوم نہ تھا کہ کیا کہوں اور میں بددل ہو گئی، تقریباً قصوروار۔ میرے بابا بھی پریشان دکھائی دیئے جو اچانک اپنے جوتوں کا جائزہ لینے لگے تھے۔ ایک بار پھر وہی نوجوان عورت میری مدد کو آئی۔

''انہیں بتاؤ کہ ان کی بیوی ہمیشہ چاہتی تھی کہ اُس کی کوئی بیٹی ہو اور اب وہ انہیں کسی بچی کو تعلیم دیتے دیکھ کر خوش ہو گی۔''

جب میں نے پیغام مولانا رومی کو پہنچایا تو وہ ہنس دیئے۔ ''سو لگتا ہے کہ تم میرے گھر گئی تھیں اور میری بیوی سے بات کی۔ لیکن میں تمہیں تسلی دے دوں کہ کیرا میری تدریسی ذمہ داریوں میں کبھی دخل انداز نہیں ہوتی۔''

نوجوان عورت نے آہستگی اور واماندگی سے سر جھکا اور میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ''انہیں بتاؤ کہ تم ان کی دوسری بیوی کیرا کے متعلق بات نہیں کر رہی۔ تم گوہر کے بارے میں بات کر رہی تھی، ان کے دو بیٹوں کی ماں کے بارے میں۔''

''میں گوہر کی بات کر رہی تھی۔'' میں نے احتیاط سے دیکھ بھال کر نام کا صحیح تلفظ ادا کرتے کہا۔ ''آپ کے بیٹوں کی ماں۔''

مولانا رومی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ''گوہر مر چکی ہے، میری بچی۔'' انہوں نے روکھے پن سے کہا، ''لیکن تم میری مرحومہ بیوی کے بارے میں کیا جانتی ہو؟ کیا یہ کوئی بے لطف لطیفہ ہے؟''

میرے بابا آگے بڑھے۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس کی نیت بری نہیں تھی آفندی۔ میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ کمیا ایک سنجیدہ بچی ہے۔ وہ اپنے بڑوں سے کبھی بدتمیزی نہیں کرتی۔''

مجھے ادراک ہوا کہ مجھے سچ بتا دینا چاہیے۔ ''آپ کی مرحومہ بیوی یہاں موجود ہیں۔ وہ میرا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور بولنے کے لیے میری حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔ ان کی گہری بھوری بادامی آنکھیں ہیں، چہرے پر خوب صورت چھائیاں اور وہ لمبا زرد لباس پہنے ہوئے ہیں...''

میں نے توقف کیا، جب دیکھا کہ نوجوان عورت نے اپنی چپلوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ''وہ

چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اُن کی چپل کے بارے میں بتاؤں۔ وہ شوخ نارنجی ریشم کے بنے ہیں اور ان پر چھوٹے چھوٹے سرخ پھولوں کی کشیدہ کاری کی گئی ہے۔ وہ بہت خوب صورت ہیں۔''

''میں نے اُسے وہ چپل دمشق سے خرید کر دی تھیں۔'' مولانا رومی نے کہا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ ''اُسے وہ بہت پسند تھیں۔''

یہ کہہ کر مولانا اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے خاموشی میں غرق ہو گئے۔ اُن کے تاثرات سنجیدہ، متین اور کھوئے کھوئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دوبارہ بات کی تو ان کا لہجہ نرم اور دوستانہ تھا، کسی افسردگی کے شائبے سے پاک۔

''اب میں سمجھا کہ کیوں ہر کوئی سمجھتا ہے کہ تمہاری بیٹی خداداد قابلیت رکھتی ہے۔'' مولانا رومی نے میرے بابا سے کہا، ''آیئے میرے گھر چلیں۔ ہم رات کے کھانے پر اس کے مستقبل کے بارے بات کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک شان دار طالبہ علم بنے گی۔ بہت سے لڑکوں سے بہتر۔''

پھر مولانا رومی میری جانب مڑے اور پوچھا، ''کیا تم گوہر کو یہ بات بتادوگی؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے آفندی۔ وہ آپ کی بات سن چکی ہیں۔'' میں نے کہا، ''وہ کہتی ہیں کہ اُنہیں اب جانا ہوگا۔ لیکن وہ ہمیشہ محبت سے آپ کی نگران ہیں۔''

مولانا رومی گرم جوشی سے مسکرادیئے۔ میرے بابا بھی۔ اب فضا میں وہ خوبی اور سہولت تھی جو اس سے پہلے نہ تھی۔ اُس لمحے میں جان گئی کہ مولانا رومی سے میری اس ملاقات کے نتائج دُور تک جائیں گے۔ میں اپنی ماں کے کبھی قریب نہ رہی تھی لیکن یوں جیسے اس کمی کی تلافی کے لیے خدا مجھے دو باپ دے رہا تھا، میرے حقیقی والد اور میرے لے پالک والد۔

یوں میں آٹھ برس قبل مولانا رومی کے گھر آئی تھی، ایک شرمیلی، علم کی پیاسی بچی۔ کیرا میری اپنی ماں سے زیادہ محبت کرنے والی اور رحم دل تھی اور مولانا رومی کے بیٹوں نے میرا خیر مقدم کیا تھا، خصوصاً بڑے بیٹے نے، جو وقت کے ساتھ میرا بڑا بھائی بن گیا۔

آخر میں، زاہد نے درست کہا تھا۔ اگرچہ میں اپنے باپ اور بہن بھائیوں کی کمی محسوس کرتی تھی مگر کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا جب مجھے قونیہ آنے اور مولانا رومی کے خاندان میں شامل ہونے پر پچھتاوا محسوس ہوا ہو۔ میں نے اس چھت تلے بہت سے خوشیوں بھرے دن گزارے۔

یعنی، جب تک کہ شمس تبریز نہ آئے۔ اُن کی آمد اور موجودگی نے سب کچھ بدل دیا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 9 جون 2008ء

ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جسے تنہائی کبھی پسند نہ رہی تھی، ایلا کو معلوم ہوا کہ وہ بعد میں تنہائی کو ترجیح دینے لگی تھی۔ ''دلکش کفر'' پر اپنی ادارتی رپورٹ میں حتمی کانٹ چھانٹ کرنے میں غرق ایلا نے اسے پیش کرنے کے لیے مشیل سے چند ہفتے مزید مانگے تھے۔ وہ اس سے پہلے مکمل کر سکتی تھی مگر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس ذمے داری نے اُسے اپنے خیالوں میں پسپا ہونے اور خاندانی فرائض اور عرصے سے منتظر خانگی بحث وتکرار کو پرے رکھنے کا ایک عذر فراہم کر دیا تھا۔ اس ہفتے پہلی مرتبہ تھی کہ وہ فیوژن کوکنگ کلب میں نہ گئی تھی کہ وہ کھانا پکانے اور ان پندرہ عورتوں سے گپ شپ لگانے پر آمادہ نہ تھی جن سب کی زندگیاں پہلے جیسی ہی تھیں جب کہ اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ خود اپنی زندگی کا کیا کرے۔ اُس نے آخری لمحے فون کر کے کہہ دیا کہ وہ بیمار تھی۔

ایلا، عزیز سے اپنے رابطے اور گفت وشنید کو راز رکھتی تھی، راز جو اچانک ہی اس کے پاس بہت سے ہو گئے تھے۔ عزیز نہیں جانتا تھا کہ وہ نہ صرف اُس کا ناول پڑھ چکی تھی بلکہ اس پر رپورٹ بھی لکھ رہی تھی۔ لٹریری ایجنسی نہ جانتی تھی کہ کتاب جس پر رپورٹ لکھنے کی اُسے ذمے داری سونپی گئی تھی، اُس کے مصنف کے ساتھ وہ چوری چھپے فلرٹ کر رہی تھی۔ ناول کس بارے میں تھے، مصنف اور فلرٹیشن، اس سب سے اُس کے بچے اور شوہر بے خبر تھے۔ چند ہفتوں میں وہ ایک ایسی عورت سے جو کسی نوزائیدہ بچے کی جلد کی طرح شفاف تھی، ایک ایسی عورت میں تبدیل ہو گئی تھی جو بھید بھرے رازوں اور جھوٹ میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس تبدیلی سے بڑھ کر جو بات اُسے حیران کرتی، وہ یہ تھی کہ اسے اس سب پر ذرا سی پریشانی بھی نہ تھی۔ یوں تھا جیسے وہ منتظر تھی، اعتماد اور صبر کے ساتھ منتظر کہ کچھ اہم یا یادگار واقعہ رونما ہو۔ یہ غیر منطقی توقع اُس کے نئے مزاج کی دلفریبی کا حصہ تھی کہ تمام رازوں کے باوجود یہ دل آویز تھا۔

لیکن اس مرتبہ ای میلز کافی نہ تھیں۔ ایلا تھی جس نے پہلے عزیز کو فون کیا۔ اب، پانچ گھنٹے

وقت کے فرق کے باوجود، وہ تقریباً روزانہ فون پر باتیں کرنے لگے۔ عزیز نے بتایا تھا کہ اُس کی آواز نرم اور نازک سی تھی۔ جب وہ ہنستی تو اُس کی ہنسی کسی پھوار کی صورت پھوٹتی جس میں مختصر ہچکی لیتی یا سانس بھرتی، یوں جیسے اُسے یقین نہ ہو کہ اور کتنا ہنسے۔ وہ ایسی عورت کی ہنسی تھی جو کبھی سیکھ نہ پائی تھی کہ دوسروں کی باتوں اور تجزیوں پر زیادہ توجہ نہ دے۔

''بہاؤ کے ساتھ بہو۔'' اُس نے کہا، ''جانے دو!''

لیکن اُس کے گرد و پیش میں بہاؤ متلون اور انتشار انگیز تھا کہ اُس کے گھر میں ایک ہی وقت میں بہت کچھ رونما ہو رہا تھا۔ ایوی نے ریاضی کے لیے پرائیویٹ کلاسز لینا شروع کر دی تھیں جب کہ اورلی کھانے پینے میں اپنی بدنظمی کے سلسلے میں کونسلر کے پاس جا رہی تھی۔ اس صبح اُس نے آدھا آملیٹ کھایا تھا... یہ مہینوں میں اُس کا پہلا ٹھوس کھانا تھا... اور اگرچہ اُس نے فوراً ہی پوچھ لیا تھا کہ اس میں کتنی کیلوریز تھیں، یہ ایک چھوٹا سا معجزہ ہی تھا کہ بعد میں اُس نے خود کو قصوروار نہ سمجھا تھا اور اتنا کھانے پر خود کو سزا نہ دی تھی۔ اس دوران جینٹ نے یہ اعلان کر کے بم پھاڑ اکہ وہ سکاٹ سے الگ ہو گئی تھی۔ اُس نے اس حقیقت کے سوا کوئی وضاحت نہ کی کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ذرا فاصلہ چاہیے تھا۔ ایلا نے سوچا کہ آیا ''فاصلہ'' نئی محبت کا خفیہ نام تھا کیوں کہ جینٹ اور نہ ہی سکاٹ نے کسی نئے ساتھی کی تلاش میں دیر لگائی تھی۔

اس رفتار نے ایلا کو ہمیشہ سے زیادہ حیران کیا جس سے انسانی رشتے تشکیل پاتے اور پھر ریزہ ریزہ ہوتے تھے، اور پھر بھی اُس نے کوشش کی کہ وہ دوسرے لوگوں پر مزید اپنی رائے یا فیصلہ نہ دے۔ اگر اُس نے عزیز سے گفتگو میں کوئی ایک بات سیکھی تھی تو یہ کہ وہ جتنا پُرسکون اور مجتمع رہے گی، اُس کے بچے اتنا ہی اُس سے اپنی باتیں بانٹیں گے۔ ایک مرتبہ جب اُس نے اُن کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا تو انہوں نے بھی اُس سے دُور بھاگنا چھوڑ دیا۔ کسی طور اب حالات زیادہ ہموار اور اُس کی پسند سے قریب چل رہے تھے، بہ نسبت اُس وقت کے جب وہ اُن تھک طریقے سے مدد کرنے اور چیزوں کی سنوارنے یا ٹھیک کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

اور سوچیں کہ وہ اب اس من پسند نتیجے کے حصول کے لیے کچھ بھی نہ کر رہی تھی! گھر میں اپنے کردار کو کسی قسم کی ایسی گوند کے طور پر دیکھنے کی بجائے، ایک نادیدہ مگر پھر بھی مرکزی بندش یا بندھن جو سب کو ساتھ جوڑے رکھتا تھا، وہ ایک خاموش تماشائی بن گئی تھی۔ اُس نے واقعات کو کھل کر سامنے آتے اور دنوں کو گزرتے دیکھا مگر ضروری نہیں کہ سرد مہری یا اجنبیت سے، البتہ ایک نمایاں بے تعلقی سے۔ اُس نے دریافت کیا کہ ایک بار یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ اُسے ان باتوں پر تناؤ میں نہیں آنا چاہیے جو اس کے اختیار میں نہیں، اس کے اندر سے ایک اور شخصیت ابھر کر باہر آئی تھی... ایک ایسی شخصیت جو زیادہ عقل مند، زیادہ پُرسکون اور کہیں زیادہ سمجھدار تھی۔

''پانچواں عنصر۔'' وہ دن میں کئی بار زیرِ لب خود سے کہا کرتی تھی، ''بس غیب کو، جبر و قدر کو تسلیم کرلو!''

اس کے شوہر کو یہ جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ وہ کچھ عجیب ہوگئی تھی، کچھ ایسی جو ایلا جیسی نہ تھی۔ کیا یہی وجہ تھی کہ اچانک وہ اُس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگا تھا؟ ان دنوں وہ گھر جلدی آنے لگا اور ایلا کو شبہ ہوا کہ وہ کچھ عرصے سے دوسری عورتوں سے مل بھی نہیں رہا تھا۔

''ہنی، کیا تم ٹھیک ہو؟'' ڈیوڈ بار بار اُس سے پوچھتا۔

''میں ایک دم ٹھیک ہوں۔'' اس نے ہر بار مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ یوں جیسے اس کے اپنے پُرسکون اور ذاتی الگ تھلگ گوشے میں دستبردار ہونے سے وہ نرم دوستانہ آداب ہٹ گئے تھے، جن کے پیچھے بہت سے برس اُس کی شادی آرام سے محوِ خواب رہی تھی۔ اب جب کہ اُن کے درمیان نمود و نمائش ختم ہوچکی تھی، وہ اُن کی تمام تر عریانی میں ساری خامیاں اور کوتاہیاں دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے دکھاوا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور اُسے احساس سا ہوا کہ ڈیوڈ بھی یہی کرنے والا تھا۔

ناشتے اور رات کے کھانے کے وقت وہ دن کے واقعات پر اس قدر نپے تلے اور بڑوں جیسے لہجے میں بات کرتے جیسے اپنی سٹاک سرمایہ کاریوں پر سالانہ آمدنی یا منافع کی بات کر رہے ہوں۔ پھر وہ اس بے باک حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے خاموش ہوجاتے کہ اُن کے پاس کہنے کو اور کوئی بات نہ تھی۔ مزید نہیں۔

بعض اوقات وہ اپنے شوہر کو خود کو توجہ سے دیکھتے پاتی، منتظر کہ وہ کچھ کہے گی، کچھ بھی کہے گی۔ ایلا کو محسوس ہوا کہ اگر وہ اس کے معاشقوں کے بارے میں پوچھتی تو وہ بہ خوشی اور ایمان داری سے کھل جاتا۔ لیکن اُسے یقین نہ تھا کہ وہ کچھ جاننا بھی چاہتی تھی یا نہیں۔

ماضی میں وہ اپنی شادی کی کشتی کو ڈوبنے کے خطرے میں نہ ڈالنے کی خاطر بے خبر رہنے کا روپ بھرا کرتی تھی۔ تاہم اب اُس نے یہ اداکاری کرنا چھوڑ دی تھی کہ جیسے اُسے معلوم نہیں کہ جب وہ باہر ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے۔ اُس نے واضح کر دیا کہ وہ حقیقتاً جانتی تھی اور یہ کہ اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حقیقت میں تو یہ نئی بے نیازی تھی جس نے اس کے شوہر کو خائف کر دیا تھا۔ ایلا اُسے سمجھ سکتی تھی کیوں کہ اندر کہیں گہرائی میں وہ خود بھی خوف زدہ تھی۔

مہینہ بھر پہلے اگر ڈیوڈ ان کی شادی شدہ زندگی میں بہتری کے لیے ایک چھوٹا سا قدم بھی اٹھاتا تو وہ ممنون ہوجاتی۔ اُس کی جانب سے کوئی بھی کوشش ایلا کو مسرور کر دیتی۔ اب مزید نہیں۔ اب اُسے شک تھا کہ اُس کی زندگی ہی حقیقی نہ تھی۔ وہ اس مقام تک پہنچی کیسے تھی؟ تین بچوں کی مطمئن ماں کو اپنی دل شکستگی کا علم کیسے ہوا تھا؟ زیادہ اہم یہ کہ اگر وہ ''ناخوش'' تھی، جیسا کہ ایک مرتبہ جینیٹ نے بتایا تھا کہ وہ ناخوش تھی تو وہ ویسا سب کچھ کیوں نہ کر رہی تھی جیسا ناخوش لوگ ہمیشہ کرتے تھے؟ باتھ روم کے فرش پر

بیٹھ کر کوئی رونا دھونا نہ ہی کچن کے سنک پر کھڑے ہو کر سسکیاں بھرنا، نہ گھر سے دُور کوئی اداسی بھری لمبی چہل قدمی، نہ ہی چیزیں اٹھا کر دیواروں پر مارنا... کچھ بھی نہیں۔

ایک عجیب سکون ایلا پر طاری ہو گیا۔ اُس نے خود کو ہمیشہ سے زیادہ مضبوط اور متوازن محسوس کیا، چاہے وہ تیزی سے اُس زندگی سے دُور ہو رہی تھی جس سے وہ واقف رہی تھی۔ صبح وہ دیر تک آئینے میں دیکھتی کہ آیا اُس کے چہرے پر کوئی نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ کیا وہ نوعمر دکھائی دیتی تھی؟ زیادہ خوب صورت؟ یا شاید زندگی سے زیادہ بھرپور؟ اُسے کوئی فرق دکھائی نہ دے پایا۔ کچھ بھی نہ بدلا تھا اور پھر بھی کچھ بھی پہلے جیسا نہ تھا۔

کیرا

قونیہ، 5 مئی 1245ء

برف کے بوجھ تلے شاخیں جو کبھی جھک گئی تھیں، اب ہماری کھڑکی کے باہر ان ہی شاخوں پر شگوفے پھوٹ رہے ہیں اور شمس تبریز اب بھی ہمارے ساتھ یہیں موجود ہیں۔ اس دوران، میں نے اپنے شوہر کو ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھ سے اور اپنے خاندان سے دُور ہوتے ہوئے، ایک مختلف آدمی میں ڈھلتے دیکھا ہے۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے اکتا جائیں گے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ اگر کچھ ہوا تو یہ کہ وہ ایک دوسرے سے مزید وابستہ ہو گئے ہیں۔ جب وہ ساتھ ہوں تو عجیب طور پر خاموش ہوتے ہیں یا پھر نا قابل سماعت سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں، بیچ بیچ میں ہنستے ہوئے، مجھے حیران کرتے ہوئے کہ ان کے پاس الفاظ کبھی ختم کیوں نہ ہوتے۔ شمس تبریز کے ساتھ ہر گفتگو کے بعد مولانا رومی ایک تبدیل شدہ آدمی بن جاتے ہیں، الگ تھلگ اور خیالوں میں مستغرق، یوں جیسے کسی ایسی شے سے مسحور ہوں جسے میں کبھی چکھ سکتی ہوں نہ ہی دیکھ سکتی ہوں۔

وہ رشتہ جو دونوں کو جوڑتا ہے، انہی دونوں کا آشیانہ ہے جہاں کسی تیسرے شخص کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی انداز میں سر ہلاتے، مسکراتے اور ہنستے یا تیوری چڑھاتے ہیں، باتوں کے درمیان دیر تک معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُن کے مزاج بھی لگتا ہے ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ کسی کسی روز وہ کسی لوری سے زیادہ پُرسکون ہوتے، کچھ نہ کھاتے، کچھ نہ کہتے جب کہ باقی دنوں میں وہ ایسی ترنگ میں گول گھومتے کہ دونوں دیوانوں سے مشابہ لگتے تھے۔ بہر صورت میں اپنے شوہر کو مزید پہچان نہ سکتی تھی۔ وہ شخص جس سے میری آٹھ برس سے زائد عرصے سے شادی چل رہی تھی، وہ آدمی جس کے بچوں کی پرورش میں نے کی تھی، یوں جیسے وہ میری اولاد تھے اور جس کے ساتھ میرا اپنا بھی بچہ تھا، وہ ایک اجنبی میں بدل گیا تھا۔ واحد وقت جب میں خود کو اُن کے قریب محسوس کرتی ہوں، وہ ہے جب وہ گہری نیند میں ہوتے ہیں۔ گزشتہ ہفتوں میں کئی راتیں میں نے جاگتے ہوئے

ان کی سانسوں کی لے سنتے گزاری ہیں، اپنی جلد پر اُن کی سانسوں کی نرم سرگوشی محسوس کرتے ہوئے اور میرے کانوں میں دھڑکتے اُن کے دل پر تسکین محسوس کرتے ہوئے، صرف خود کو یہ یاد دلانے کو کہ وہ اب بھی وہی آدمی ہیں جن سے میں نے شادی کی تھی۔

میں خود کو بتاتی رہی کہ یہ عارضی مرحلہ ہے۔ کسی روز شمس تبریز چلے ہی جائیں گے۔ آخر کو وہ ایک سرگرداں درویش ہیں۔ مولانا رومی یہیں میرے پاس رہیں گے۔ وہ اپنے شہر اور اپنے طلبا سے وابستہ ہیں۔ مجھے سوائے انتظار کے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن صبر آسانی کے ساتھ نہیں آتا اور یہ سب ہر گزرتے دن کے ساتھ دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ جب میں خود کو بے حد دل شکستہ محسوس کروں تو میں بیتے دنوں کو یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں... خصوصاً وہ وقت جب تمام مشکلات کے باوجود مولانا رومی میرے ساتھ کھڑے تھے۔

''کیرا عیسائی ہے۔ چاہے یہ مسلمان ہو بھی جائے، یہ کبھی ہم میں سے ایک نہ بنے گی۔'' جب لوگوں کو ہماری متوقع شادی کی اڑتی اڑتی خبر ملی تو انہوں نے باتیں کی تھیں۔ ''اسلام کے ایک سرکردہ عالم کو اپنے مذہب سے باہر کسی عورت سے شادی نہیں کرنی چاہیے۔''

اناطولیہ، مذاہب، لوگوں اور مختلف قسم کے پکوانوں کا امتزاج ہے۔ اگر ہم ایک سے پکوان کھا سکتے ہیں، ایک سے اداس گیت گا سکتے ہیں، ایک سی توہمات پر یقین رکھ سکتے ہیں اور ہر شب ایک سے خواب دیکھ سکتے ہیں تو ہمیں ساتھ رہنا کیوں نہیں چاہیے؟ میں مسلمان ناموں والے عیسائی بچوں کو جانتی ہوں اور ایسے مسلمان بچوں کو بھی جن کی دایہ یا رضاعی مائیں عیسائی ہیں۔ ہمارا جہان کسی مائع کی طرح ہے جہاں ہر شے بہتی اور باہم گھلتی ملتی ہے۔ اگر اسلام اور عیسائیت کے درمیان کوئی سرحد ہے تو وہ اس سے زیادہ لچک دار ہے جتنا دونوں طرف کے علما سمجھتے ہیں۔

چوں کہ میں ایک مشہور عالم کی بیوی ہوں، لوگ توقع رکھتے ہیں کہ میں علما کو بلند تر مرتبے پر سمجھوں لیکن سچ یہ ہے کہ میں ایسا نہیں سمجھتی۔ علما بہت کچھ جانتے ہیں، یہ یقینی بات ہے مگر جب معاملہ یقین اور عقیدے کا ہو تو بہت سارا علم کیا فائدہ دیتا ہے؟ وہ ہمیشہ اتنے بھاری بھرکم الفاظ بولتے ہیں کہ یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مسلمان علما، تثلیث کو ماننے پر عیسائیت پر تنقید کرتے ہیں اور عیسائی علما، اسلام پر تنقید کرتے ہیں کہ اس میں قرآن کو مکمل کتاب سمجھا جاتا ہے۔ وہ یوں ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے دونوں مذاہب بالکل مختلف ہیں۔ لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو جہاں تک بنیادی باتوں کا تعلق ہے، اپنے علما کے برعکس عام عیسائیوں اور عام مسلمانوں میں، کہیں زیادہ باتیں مشترک ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ عیسائیت اختیار کرنے والے کسی مسلمان کے لیے سب سے مشکل بات تثلیث کو قبول کرنا ہے۔ اور اسلام قبول کرنے والے کسی عیسائی کے لیے مشکل ترین ہے تثلیث کو چھوڑنا۔ قرآن

میں، حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں کہ یقیناً میں خدا کا بندہ ہوں، اُس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔
(سورۃ مریم، آیت 30)۔

میرے نزدیک اس تصور پر یقین لانا کہ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے نہیں بلکہ خدا کے بندے تھے، مشکل نہ تھا۔ دشوارترین جو مجھے لگا، وہ تھا مقدس ماں (مریمؑ) کو چھوڑنا۔ میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا، مولانا رومی کو بھی نہیں لیکن بعض اوقات مجھے مقدس مریمؑ کی مہربان بھوری نگاہیں دیکھنے کی بڑی تمنا ہوتی ہے۔ اُن کی نگاہ ہمیشہ مجھ پر ایک سکون بخش اثر کرتی ہے۔

سچ یہ ہے کہ جب سے شمس تبریز ہمارے گھر آئے ہیں، میں اس قدر رنجیدہ اور الجھن زدہ ہوں کہ میں ہمیشہ سے زیادہ مقدس ماں کو چاہنے لگی ہوں۔ اپنی رگوں میں خون کے ساتھ سرکشی سے بہتے کسی بخار کی طرح اتنی شدت سے میرا جی چاہا کہ مقدس ماں سے دعا کروں کہ میں بہ مشکل خود پر قابو رکھ پائی۔ ان جیسے موقعوں پر مجھ پر احساسِ گناہ طاری ہو جاتا ہے، یوں جیسے میں اپنے نئے مذہب کو دھوکا دے رہی ہوں۔

اس بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ میری ہمسائی صفیہ تک نہیں جو کہ تمام معاملات میں میری محرمِ راز ہے۔ وہ سمجھ نہیں پائے گی۔ کاش میں اس احساس میں اپنے شوہر کو شریک کر سکتی لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کیسے کروں۔ وہ اس قدر بیگانے سے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھ سے مزید فاصلے پر چلے جائیں گے۔ مولانا رومی میرے لیے سب کچھ ہوا کرتے تھے۔ اب وہ ایک اجنبی ہیں۔ مجھے کبھی معلوم نہ تھا کہ کسی ایسے شخص کے ساتھ ایک چھت تلے رہنا، ایک ہی بستر پر سونا اور پھر بھی یہ محسوس کرنا ممکن تھا کہ وہ واقعتاً وہاں موجود ہی نہ تھا۔

شمس

قونیہ، 12 جون 1245ء

بے خبر و مدہوش مسلمان! اگر کوئی ہر رمضان میں خدا کے نام پر روزے رکھتا ہے اور ہر عید پر اپنے گناہوں کی تلافی میں بھیڑ یا بکری کی قربانی دیتا ہے، اگر کوئی عمر بھر مکہ کا حج کرنے کی جدوجہد میں رہتا ہے اور دن میں پانچ بار جائے نماز پر رکوع وسجود کرتا ہے مگر ساتھ ہی اس کے دل میں محبت کی کوئی گنجائش نہیں تو اس ساری محنت ومشقت کا فائدہ کیا ہے؟ ایمان محض ایک لفظ ہے، اگر اس کے مرکز میں محبت نہ ہو تو انتہائی ڈھلمل اور بے روح، مبہم اور کھوکھلا لفظ ہے... کچھ بھی ایسا نہیں جسے تم حقیقت میں محسوس کر سکو۔

تمہارا کیا خیال ہے، خدا مکہ میں رہتا ہے یا مدینہ میں؟ یا پھر کہیں کسی مقامی مسجد میں؟ لوگ کس طرح یہ تصور کر سکتے ہیں کہ خدا کسی محدود جگہ میں مقیم ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود کھل کر فرماتا ہے، میں آسمانوں میں اور زمین میں نہیں سما پاتا مگر اپنے بندے کے دل میں سما جاتا ہوں۔

افسوس ہے اُس احمق پر جو خیال کرتا ہے کہ اُس کے فانی دماغ کی سرحدیں خدا تعالیٰ کی حدود ہیں۔ افسوس ہے اُس بے خبر پر جس کا مفروضہ ہے کہ وہ خدا کے ساتھ قرضوں پر بات چیت کر کے معاملہ طے کر سکتے ہیں۔ کیا ان جیسے لوگوں کا خیال ہے کہ خدا کوئی پنساری ہے جو دو مختلف ترازو میں ہماری نیکیوں اور خطاؤں کو تولنے کی کوشش کرتا ہے؟ کیا وہ کوئی محرر ہے جو باریک بینی سے اپنے کھاتے میں ہمارے گناہوں کا اندراج کرتا ہے تاکہ کسی روز ہم سے اُن کا حساب لے سکے؟ کیا ان کا تصورِ وحدانیت یہی ہے؟

پنساری نہ ہی محرر، میرا رب تو رفیع الشان ہے۔ ایک جیتا جاگتا خدا! مجھے کوئی مُردہ خدا کیوں چاہیے ہوگا؟ وہ حیات ہے۔ اُس کا اسم پاک ہے، الحیّ... ہمیشہ زندہ رہنے والا۔ میں نہ ختم ہونے والے خوف اور پریشانیوں میں کیوں لتھڑا رہوں، ممنوعات اور حدود وقیود میں ہمیشہ پابند کیوں رہوں؟ وہ مہربان ہے بے انتہا۔ اُس کا اسم مبارک ہے، الودود۔ حمد کے قابل ہے اُس کی ذات پاک۔ میں اپنے تمام الفاظ اور اعمال سے اُس کی تعریف کرتا ہوں، اتنے ہی فطری انداز میں اور بلا کوشش جیسے میں سانس

لیتا ہوں۔ اُس کا اسم پاک ہے، الحامد۔ میں کیسے فضول گوئی اور عیب جوئی کر سکتا ہوں اگر اپنے دل کی گہرائی میں میں جانتا ہوں کہ خدا یہ سب دیکھتا اور سنتا ہے؟ اُس کا اسم مبارک ہے، البشیر۔ تمام خوابوں اور امیدوں سے بڑھ کر حسین۔

الجمال، القیوم، الرحمٰن، الرحیم۔ قحط اور سیلاب میں، خشک سالی اور پیاس میں، میں اُس کے لیے نغمہ سرا ہوں اور رقصاں رہوں گا، یہاں تک کہ میرے گھٹنے جواب دے جائیں، میرا جسم تھک ہار کر گر جائے اور میرا دل دھڑکنا چھوڑ دے۔ میں اپنی انا کو ریزہ ریزہ کر دوں گا، یہاں تک کہ میں فنا ہو جاؤں، رہرو عدم، اُس کی عظیم تعمیر میں گرد و غبار کی بھی گرد۔ شکر گزاری سے، مسرت سے اور ثابت قدمی سے، میں اس کے جلال اور فیاضی کی تعریف کرتا ہوں۔ میں اُن تمام چیزوں کے لیے اُس کا شکر گزار ہوں جو اُس نے مجھے عطا کیں اور وہ جو عطا نہ کیں کیوں کہ صرف وہی جانتا ہے کہ میرے لیے کیا بہترین ہے۔

اپنی فہرست کے ایک اور اصول کو یاد کرتے ہوئے مجھے خوشی اور امید کی ایک تازہ لہر محسوس ہوئی۔ ''خدا کی تخلیق میں انسان کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔'' ''میں نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی۔'' اللہ فرماتا ہے۔ بغیر کسی استثنا کے ہم میں سے ہر کوئی زمین پر خدا کا نائب بنایا گیا ہے۔ خود سے پوچھو، تم کتنی اکثر و بیشتر اُس کے نائب کا سا برتاؤ کرتے ہو، اگر کبھی کرتے بھی ہو تو؟ یاد رکھو، یہ ہم سب کی ذمے داری ہے کہ اپنے اندر اس الہامی روح کو دریافت کریں اور اس کے ساتھ زندگی گزاریں۔''

خدا کی محبت میں خود کو کھونے اور اپنے نفس کے خلاف جنگ چھیڑنے کی بجائے، مذہبی جوشیلے اور متعصب دوسروں سے لڑتے ہیں۔ خوف کی لہر کے بعد لہر کو مہمیز دیتے ہوئے، پوری کائنات کو خوف سے آلودہ نگاہوں سے دیکھتے، کوئی حیرت کی بات نہیں کہ وہ خوف زدہ ہونے کے لیے حد سے زیادہ کثرت سے چیزیں دیکھتے ہیں۔ جب کبھی کوئی زلزلہ آئے، یا قحط یا پھر کوئی دوسری قدرتی آفت، وہ اُسے خدا کے غضب کی نشانی کے طور پر لیتے ہیں... یوں جیسے خدا کھلے عام نہیں فرماتا، ''میری رحمت میرے غضب پر بھاری ہے۔'' (حدیث قدسی)۔ ہمیشہ کسی پر کسی نہ کسی وجہ سے آزردہ یا شاکی، وہ لگتا ہے کہ توقع رکھتے ہیں کہ خدا اُن کی جانب سے دخل اندازی کرے اور اُن کے قابلِ افسوس انتقام لے۔ ان کی زندگی مسلسل تلخی اور عداوت سے عبارت ہے، اس قدر وسیع بے اطمینانی کہ جہاں کہیں وہ جائیں، یہ اُن کے ماضی اور مستقبل دونوں پر سایہ فگن کسی سیاہ بادل کی طرح ان کا پیچھا کرتا ہے۔

عقیدہ ایسی چیز ہے کہ اس میں جنگل کے درختوں کو جنگل سے الگ کر کے نہیں پہچانا جاتا۔ مذہب کی کُلی مجموعیت اس کے جزوی حصوں کے مجموعے سے بڑی اور گہری ہے۔ انفرادی اصولوں کو مجموعیت یا پورے مذہب کی روشنی میں پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اور مجموعہ اپنے جوہر یا اصل میں نہاں ہے۔

تاہم، قرآن کو پوری طرح یا کُلی طور پر اپنانے اور اس کے اصل جوہر کی تلاش کی بجائے

متعصب لوگ کوئی خاص ایک یا دو آیات الگ کر لیتے ہیں اور ان الہامی احکامات کو ترجیح دیتے ہیں جنہیں وہ خائف ذہنوں کے لیے درست سمجھتے ہیں۔ وہ سب کو یاد دلاتے رہتے ہیں کہ روزِ قیامت تمام انسانوں کو پُل صراط پر چلایا جائے گا جو بال سے زیادہ باریک ہے اور استرے سے زیادہ تیز۔ گناہ گار اس پُل کو عبور کرنے میں ناکام رہیں گے اور نیچے جہنم کے گڑھوں میں جا گریں گے جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ جنھوں نے نیک پرہیزگار زندگی گزاری، پُل عبور کر کے دوسرے پار پہنچ جائیں گے جہاں انہیں انعام کے طور پر طرح طرح کے پھل، شیریں پانی اور حوریں ملیں گی۔ اُن کا حیات بعد از ممات کا تصور مختصراً یہی ہے۔ وحشت اور انعامات، شعلے اور پھل، فرشتے اور شیطان کا ان کا وہم اس قدر بڑا ہے کہ اُس مستقبل کو پہنچنے کی کاوش میں جو اُسے باجواز بنا سکے جیسا کہ وہ آج ہیں، وہ خدا کو بھول جاتے ہیں! کیا وہ چالیس میں سے ایک اصول کو نہیں جانتے کہ ''دوزخ ابھی اور یہیں موجود ہے۔ اسی طرح جنت بھی یہیں ہے۔ دوزخ کے بارے میں پریشان ہونا یا جنت کے خواب دیکھنا چھوڑ دو کیوں کہ وہ خود ہر لمحے کے اندر موجود ہیں۔ ہر مرتبہ جب ہم محبت میں گرفتار ہوتے ہیں، ہم جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہر مرتبہ جب ہم نفرت و حسد کرتے ہیں یا کسی سے لڑتے ہیں، ہم لڑکھڑا کر جہنم کی آگ میں جا گرتے ہیں۔'' یہ ہے اصول نمبر پچیس۔

کیا ضمیر کے اُس کرب سے بدتر کوئی جہنم ہے جو کوئی آدمی اپنے اندر کہیں گہرائی میں یہ جان کر محسوس کرتا ہے کہ اُس نے کچھ غلط کیا ہے، بہت ہی غلط؟ اُس آدمی سے پوچھو، وہ تمہیں بتائے گا کہ جہنم کیا ہے۔ کیا اُس روحانی مسرت سے بہتر کوئی جنت ہے جو کسی شخص پر زندگی کے ان نایاب لمحوں میں اترتی ہے جب کائنات کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ خود کو ابدیت کے تمام رازوں کا مالک اور اللہ سے بالکل جڑا ہوا محسوس کرتا ہے؟ اُس آدمی سے پوچھو، وہ تمہیں بتائے گا کہ جنت کیا ہے۔

انجام کے بارے میں، ایک تصوراتی مستقبل کے بارے میں، اتنی کیا فکر کرنی، جب یہ لمحہ موجود واحد وقت ہے جب ہم اپنی زندگی میں خدا کی موجودگی اور عدم موجودگی دونوں کا بھرپور تجربہ کر سکتے ہیں؟ نہ تو جہنم میں سزا کے طور پر جلنے سے خوف زدہ ہو کر اور نہ ہی جنت میں انعامات پانے کی خواہش کے باعث، صوفی خدا سے صرف اس لیے محبت کرتے ہیں کیوں کہ وہ خدا سے محبت کرتے ہیں، خالص اور سادہ، بے داغ اور ناقابل بحث۔

محبت ہی سبب ہے۔ محبت ہی منزل ہے۔

اور جب آپ خدا سے اس قدر محبت کرتے ہیں، جب آپ اُس کی ہر تخلیق سے اُسی کی وجہ سے اور اُس کی بدولت محبت کرتے ہیں تو بیرونی عناصر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ اس مقام سے آگے مزید کوئی ''میں'' نہیں ہو سکتی۔ آپ صرف صفر ہو کر رہ جاتے ہیں، اتنا بڑا صفر کہ جو آپ کے پورے وجود کو ڈھانپ لیتا ہے۔

اگلے روز مولانا رومی اور میں ان معاملات پر غور و فکر کر رہے تھے، جب اچانک انہوں نے

اپنی آنکھیں موند لیں اور درج ذیل کلمات ادا کیے:

''نہ عیسائی نہ یہودی نہ مسلمان، نہ ہندو، بدھ، صوفی یا زین۔

کوئی مذہب یا ثقافتی نظام نہیں۔

میں نہ مشرق سے ہوں نہ مغرب سے...

میرا مقام بے مقام ہے، ایک نشان جو بے نشان ہے۔''

مولانا رومی کا خیال ہے کہ وہ کبھی شاعر نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کے اندر ایک شاعر موجود ہے۔ ایک حیرت انگیز شاعر! اب وہ شاعر آشکار ہو رہا ہے۔

ہاں، مولانا رومی ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ مشرق کے ہیں نہ مغرب کے۔ ان کا تعلق سلطنتِ عشق سے ہے۔ ان کا تعلق محبوبِ ازل سے ہے۔

ایلا

نارتھمپٹن، 12 جون 2008ء

اب تک ایلا ''دلکش کفر'' کا مطالعہ مکمل کر چکی تھی اور ادارتی رپورٹ کو حتمی شکل دے رہی تھی۔ اگرچہ وہ اس ناول کی تفصیلات پر عزیز سے بات کرنے کے لیے بے تاب تھی مگر اُس کے پروفیشنل ازم کے احساس نے اُسے روک دیا۔ یہ ٹھیک نہ ہوتا۔ اپنی ذمہ داری مکمل کرنے سے پہلے نہیں۔ اُس نے عزیز کو یہ بھی نہ بتایا تھا کہ اُس کا ناول پڑھنے کے بعد اُس نے مولانا رومی کی نظموں کی کتاب خریدی تھی اور اب ہر شب سونے سے پہلے ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور پڑھتی تھی۔ اُس نے مصنف کے ساتھ اپنی گفتگو کو اس کے ناول پر کام سے بڑی صفائی سے الگ تھلگ رکھا تھا۔ لیکن 12 جون کو کچھ ایسا ہوا جس نے دونوں کے درمیان لکیر کو ہمیشہ کے لیے دھندلا دیا۔

اُس روز تک ایلا نے کبھی عزیز کی تصویر نہ دیکھی تھی۔ اُس کی ویب سائٹ پر اُس کی اپنی کوئی تصویریں نہ تھیں، اُسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ کیسا دکھائی دیتا تھا۔ شروع میں ایک ایسے شخص کو ای میلز لکھنے کے اسرار پر جس کا کوئی چہرہ نہ تھا، ایلا کو بڑا لطف آیا تھا، لیکن وقت کے ساتھ اُس کا تجسس بڑھنے لگا اور خود کو بھیجے جانے والے پیغامات پر چہرہ لگانے کی ضرورت سر اٹھانے لگی۔ عزیز نے کبھی ایلا سے تصویر نہ مانگی تھی جو ایلا کو عجیب لگا، بے حد عجیب۔

سو اچانک ہی ایلا نے اُسے اپنی تصویر بھیج دی۔ یہاں تھی وہ، پورچ میں پیارے سپرٹ کے ہمراہ کھڑی، گہرا آسمانی لباس پہنے جس میں اس کے جسم کے خطوط ذرا نمایاں تھے۔ تصویر میں وہ مسکرا رہی تھی، کچھ خوش باش، کچھ بے چین مسکراہٹ۔ اس کی انگلیاں مضبوطی سے کتے کے کالر کو تھامے ہوئے تھیں، یوں جیسے وہ اُس سے کوئی طاقت اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُن کے اوپر آسمان پر سرمئی اور اودے دھبے تھے۔ یہ اُس کی کوئی بہترین تصویروں میں سے ایک نہ تھی لیکن اس میں کچھ روحانی، تقریباً کسی دوسرے جہان کا کچھ تاثر تھا۔ یا اُسے ایسی امید تھی۔ ایلا نے وہ ایک ای میل اٹیچ منٹ میں بھیجی اور بس

انتظار کرنے لگی۔ یہ اُس کا انداز تھا یہ کہنے کا کہ عزیز اپنی تصویر بھیجے۔

اور اُس نے تصویر بھیج دی۔

جب ایلا نے وہ تصویر دیکھی جو عزیز نے بھیجی تھی تو اُس نے خیال کیا کہ وہ کہیں مشرق بعید میں لی گئی ہوگی، اس لیے نہیں کہ وہ وہاں جا چکی تھی۔ تصویر میں عزیز درجن بھر سے زائد سیاہ بالوں والے ہر عمر کے مقامی بچوں میں گھرا ہوا تھا۔ سیاہ پتلون اور قمیص پہنے، وہ دبلے پتلے جسم، تیکھی ناک، رخساروں کی ابھری ہڈیوں والا شخص تھا اور اُس کے لمبے سیاہ گھنگھرالے بال اُس کے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھیں، توانائی چھلکاتے دو زمرد تھے، اور کچھ اور جسے ایلا نے دردمندی کے طور پر پہچانا۔ وہ ایک کان میں بالی اور گردن میں ایک ایسے پیچیدہ ڈیزائن کا نیکلس پہنے ہوئے تھا، جسے ایلا سمجھ نہ پائی۔ پس منظر میں لمبی گھاس میں گھری ہوئی نقرئی جھلملاتی جھیل تھی اور کونے میں کسی شے یا شخص کا منڈلاتا سایہ جو تصویر کے فریم سے باہر تھا۔

تصویر میں موجود شخص کا جائزہ لیتے ہوئے، ہر تفصیل پر غور کرتے ایلا کو احساس سا ہوا کہ جیسے وہ کسی طور اُس شخص کو پہچانتی تھی۔ وہ جس قدر بھی عجیب وغریب محسوس ہوا، وہ قسم کھا کر کہہ سکتی تھی کہ وہ اُس شخص کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ اور اچانک وہ جان گئی۔

شمس تبریز، عزیز اے ظہارا سے کہیں زیادہ مماثلت رکھتے تھے۔ عزیز بالکل ویسا دکھائی دیتا تھا جیسا مسودے میں رومی سے ملاقات کے لیے قونیہ سے روانہ ہوتے ہوئے شمس تبریز کو بیان کیا گیا تھا۔ ایلا نے سوچا کہ کیا عزیز نے اس کردار کا حلیہ جان بوجھ کر اپنے جیسا تحریر کیا تھا۔ مصنف کے طور پر ہو سکتا تھا کہ وہ مرکزی کردار کو اپنے عکس پر تخلیق کرنا چاہتا ہو، بالکل ویسے جیسے خدا نے انسان کو اپنے عکس پر تخلیق کیا تھا۔

اس بات پر غور کرتے ہوئے ایک اور امکان اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا ایسا ہو سکتا تھا کہ اصلی شمس تبریز بالکل ویسے دکھائی دیتے ہوں جیسے انہیں کتاب میں بیان کیا گیا تھا۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ تھا کہ تقریباً آٹھ سو برس کی دوری پر ان دونوں آدمیوں میں حیران کن مشابہت تھی؟ کیا ایسا ہو سکتا تھا کہ یہ مشابہت اختیار سے باہر اور حتیٰ کہ خود مصنف کے علم سے بھی باہر تھی؟ ایلا نے اس وسوسے اور الجھن پر جتنا زیادہ سوچا، اتنا ہی شدت سے اُسے شبہ ہوا کہ شمس تبریز اور عزیز اے ظہارا کچھ اس طور پر ایک دوسرے سے ربط رکھ سکتے تھے جو کسی سادہ ادبی داؤ پیچ سے بڑھ کر تھا۔

اس دریافت نے ایلا پر دو غیر متوقع اثرات کیے۔ پہلا، یہ کہ اُس کا جی چاہا کہ وہ دوبارہ ''دلکش کفر'' سے رجوع کرے اور ایک مختلف نگاہ سے ناول دوبارہ پڑھے، اس بار کہانی کی خاطر نہیں بلکہ مرکزی کردار میں چھپے مصنف کی تلاش کے لیے، شمس تبریز میں عزیز کو ڈھونڈنے کی خاطر۔

دوسرے، وہ عزیز کی شخصیت کے بارے میں مزید متجسس ہو گئی۔ وہ کون تھا؟ اُس کی کہانی کیا

تھی؟ کسی پچھلی ای میل میں اُس نے ایلا کو بتایا کہ وہ سکاٹ تھا لیکن پھر اُس کا یہ مشرقی نام کیوں تھا... عزیز؟ کیا وہ حقیقی نام تھا؟ یا وہ کوئی صوفی نام تھا؟ اور پھر، یہ صوفی ہونے سے آخر کیا مراد تھی؟

کچھ اور بات تھی جو اُس کے ذہن پر طاری ہوگئی: ایک بالکل اوّلین، تقریباً ناقابل محسوس علامات، چاہت کی۔ اُسے آخری مرتبہ یہ سب محسوس کیے ایک طویل عرصہ بیت چکا تھا، سو اُسے اس احساس کو پہچاننے میں کچھ اضافی لمحے لگے۔ لیکن یہ موجود تھا، طاقت ور، اُکساتا ہوا اور سرکش۔ اُسے ادراک ہوا کہ اُسے تصویر میں موجود شخص کی چاہت تھی اور اُسے حیرانی ہوئی کہ اُسے بوسہ دینا کیسا محسوس ہوگا۔

وہ احساس اس قدر غیر متوقع اور خجالت آمیز تھا کہ اُس نے تیزی سے لیپ ٹاپ بند کر دیا، یوں جیسے دوسری صورت میں تصویر میں موجود شخص اُسے اندر کھینچ سکتا تھا۔

بیبرس جنگجو

قونیہ، 10 جولائی 1245ء

''بیبرس، میرے بیٹے، کسی کا بھروسا مت کرنا۔'' میرے چچا کہتے ہیں، ''کیوں کہ دنیا ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید بدعنوان ہوتی جا رہی ہے۔'' اُن کا دعویٰ ہے کہ واحد دَور جب حالات مختلف تھے، وہ سنہری دَور تھا جب خود نبی کریم ﷺ باضابطہ طور پر حاکم تھے۔ اُن کے وصال کے بعد سے ہر شے زوال پذیر رہی ہے۔ لیکن اگر تم مجھ سے پوچھو، ہر جگہ جہاں دو سے زیادہ لوگ ہوں، وہ میدانِ جنگ بننے کی پابند ہے۔ حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ کے دَور میں بھی، لوگوں کا عداوتوں میں حصہ تھا، ہے ناں؟ جنگ زندگی کا مرکزی حصہ ہے۔ شیر ہرن کو کھا جاتا ہے اور گدھ لاش کی باقی بچ رہ جانے والی ہڈیوں پر پلتے ہیں۔ قدرت سفاک و بے رحم ہے۔ خشکی پر، سمندر میں یا ہوا میں، کسی انتشار کے بغیر ہر مخلوق کے لیے بقا کی صرف اور صرف ایک صورت ہے: اپنے بدترین دشمن سے طاقت ورتر اور عیارتر ہونا۔ زندہ رہنے کے لیے تمہیں لڑنا پڑتا ہے۔ یہ اتنی ہی سادہ سی بات ہے۔

اور لڑنا ہمیں ہوگا۔ حتیٰ کہ احمق ترین لوگ دیکھ سکتے ہیں کہ آج کے زمانے اور دَور میں اور کوئی صورت نہیں۔ پانچ برس قبل حالات میں ایک بدتر موڑ آیا تھا جب چنگیز خان کی طرف سے امن مذاکرات کے لیے بھیجے گئے ایک سو منگول ایلچیوں کا قتلِ عام کر دیا گیا۔ اس کے بعد چنگیز خان غیظ و غضب کے بارودی گولے میں بدل گیا، اُس نے اسلام کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ایلچی کیوں اور کیسے قتل کیے گئے، کوئی نہیں بتا سکتا۔ بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ خود چنگیز خان نے ان ایلچیوں کو قتل کروایا تھا تا کہ وہ ایک وسیع تر جنگی مہم کا آغاز کر سکے۔ یہ سچ ہو سکتا تھا۔ کون جانتا ہے۔ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ان پانچ برسوں میں منگولوں نے خراسان کا پورا علاقہ تباہ و برباد کر دیا۔ جہاں کہیں ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں، موت اور بربادی کا راج ہوا۔ اور دو برس پہلے انہوں نے کوسے داغ میں سلجوق سپاہ کو شکست دی اور سلطان کو خراج ادا کرنے والا محکوم بنا دیا۔ واحد سبب کہ منگولوں نے ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں دیا، یہ تھا کہ

اُن کے لیے ہمیں محکوم بنائے رکھنا زیادہ منافع بخش تھا۔

قدیم زمانوں سے جنگیں لڑی جاتی رہی ہیں، کم از کم تب سے جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کا قتل کیا۔ لیکن منگول فوج جیسی سفاکی ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ایک سے زیادہ ہتھیاروں میں ماہر، وہ ہتھیاروں کا وسیع استعمال کرتے ہیں، ہر ایک کسی خاص مقصد کے لیے تیار کیا گیا ہتھیار ہے۔ ہر منگول فوجی بھالے، کلہاڑی، تلوار اور نیزے سے بھاری ہتھیار بند ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد اُن کے پاس ایسے تیر ہیں جو زرہ کے اندر گھس جاتے ہیں، پورے گاؤں کو نذرِ آتش کر دیتے ہیں، اپنے شکار لوگوں کو زہر کا شکار بنا دیتے ہیں یا پھر انسانی جسم کی سخت ترین ہڈیوں کو چھید دیتے ہیں۔ ان کے پاس توسیٹیاں بجاتے تیر بھی ہیں، جو وہ ایک سے دوسرے فوجی دستے کو پیغام رسانی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ کسی خدا کو نہیں مانتے کہ جس کا انہیں خوف ہو، اس قدر ترقی یافتہ جنگی مہارتوں کے ساتھ منگول حملہ کرتے ہیں اور اپنی راہ میں آنے والے ہر شہر، قصبے اور گاؤں کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بخارا جیسے قدیم شہر بھی ملبے کا ڈھیر بنا دیئے گئے۔ اور یہ صرف منگولوں کی بات نہیں۔ ہمیں صلیبیوں سے یروشلم واپس لینا ہے، بازنطینیوں کے دباؤ کا تو ذکر ہی نہیں اور شیعوں اور سنیوں کے درمیان مسابقت۔ ہم جو کہ ہر طرف سے سرد خون والے سفاک دشمنوں میں گھرے ہیں، ہم پُر امن رہنے کے کیسے متحمل ہو سکتے ہیں؟

یہی وجہ ہے کہ مولانا رومی جیسے لوگ میرے اعصاب پر سوار ہو جاتے ہیں۔ مجھے پرواہ نہیں کہ باقی سب لوگ اُس کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ ایک بزدل ہے جو سوائے بزدلی کے اور کچھ نہیں پھیلاتا۔ ماضی میں وہ ایک اچھا عالم رہا ہو گا مگر آج کل وہ واضح طور پر اُس مرتد شمس تبریز کے زیرِ اثر ہے۔ اس وقت جب دشمنانِ اسلام کے سائے بڑھ رہے ہیں، مولانا رومی کیا تبلیغ کرتا ہے؟ امن! تحمل و برداشت! اطاعت گزاری، تسلیم و رضا!

''بردار، درد جھیلو۔ زہر سے بچو۔
اپنے ہیجان کے زہر سے بچو۔ آسمان تمہارے حُسن کے آگے جھکے گا
اگر تم ایسا کرو... اس صورت میں خار پھیل کر گلاب بنتا ہے۔
ایک ذرہ (جزو)، کُل (کائنات) کے ساتھ دمکتا ہے۔''

مولانا رومی اطاعت شعاری کی تبلیغ کرتا ہے، مسلمانوں کو بھیڑوں کے گلّے میں بدلتا ہے، بزدل اور مسکین۔ وہ کہتا ہے کہ ہر نبی یا پیغمبر کی ایک امت ہوتی ہے اور ہر اُمت کا ایک مقررہ وقت ہے۔ ''محبت'' کے علاوہ اُس کے پسندیدہ الفاظ لگتا ہے کہ ''صبر''، ''توازن'' اور ''تحمل و برداشت'' ہیں۔ اگر اُس پر منحصر ہوتا تو ہم سب بس اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے اور منتظر ہوتے کہ کب دشمن آ کر ہمیں ذبح کر دیں یا پھر کسی اور آفت کا نشانہ بن جائیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تب وہ آ کر تباہی کا ذرا دیر کو جائزہ لیتا اور اُسے ''برکت'' کہتا۔ کچھ لوگ ہیں جنہوں نے اُسے کہتے سنا ہے کہ ''جب مدرسے اور مسجد اور مینارے

بھی گرا دیئے جائیں تو تب درویش اپنی برادری کا آغاز کر سکتے ہیں۔'' اب یہ کس قسم کی بات ہے؟

اور جب آپ اس پر سوچتے ہیں تو واحد سبب کہ مولانا رومی اس شہر میں ہیں، یہ ہے کہ دہائیاں پہلے اُن کے خاندان نے پناہ کے لیے افغانستان سے اناطولیہ ہجرت کی تھی۔ اُس وقت کے کئی دوسرے بااثر لوگوں اور امرا کو سلجوق سلاطین نے کھلی دعوت بھیجی تھی کہ جن میں مولانا رومی کے والد بھی شامل تھے۔ یوں پناہ یافتہ اور مراعات یافتہ اور ہمیشہ توجہ اور پسندیدگی پانے والے مولانا رومی کے خاندان نے افغانستان کے شور و فساد کو چھوڑ کر قونیہ کے پُرسکون باغات کا رخ کیا۔ اس قسم کے ماضی کے ساتھ تحمل و برداشت کا درس دینا بے حد آسان ہے!

اگلے روز میں نے وہ واقعہ سنا جو شمس تبریز نے بازار میں لوگوں کے ایک گروہ کو سنایا تھا۔ اُس نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کے رفیق و جان نشین حضرت علیؓ ایک میدانِ جنگ میں کسی کافر سے لڑ رہے تھے۔ علیؓ اُس شخص کے دل میں تلوار گھونپنے ہی والے تھے کہ اُس کافر نے اچانک سر اٹھایا اور آپؓ کے مبارک چہرے پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ نے فوراً ہی اپنی تلوار ہٹالی، گہری سانس بھری اور چلے گئے۔ کافر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ حضرت علیؓ کے پیچھے بھاگا اور پوچھا کہ وہ اسے کیوں زندہ چھوڑ رہے تھے۔

''کیوں کہ مجھے تم پر غصہ آ گیا ہے۔'' حضرت علیؓ نے جواب دیا۔

''تو پھر آپ میری جان کیوں نہیں لے لیتے؟'' کافر نے پوچھا، ''میں سمجھا نہیں۔''

حضرت علیؓ نے وضاحت کی۔ ''جب تم نے میرے چہرے پر تھوک دیا تو مجھے بے حد غصہ آیا۔ میری انا اُبھری اور اُس نے انتقام لینا چاہا۔ اگر میں نے ابھی تمہیں قتل کر دیا تو میں اپنے نفس کی پیروی کر رہا ہوں گا۔ اور وہ ایک بہت بڑی خطا ہو گی۔''

یوں حضرت علیؓ نے اُس شخص کو چھوڑ دیا۔ کافر اس قدر متاثر ہوا کہ وہ حضرت علیؓ کا دوست اور پیروکار بن گیا اور کچھ عرصے میں اُس نے خود اپنی مرضی و منشا سے اسلام قبول کر لیا۔

یہ بہ ظاہر اُسی قسم کا قصہ ہے جو شمس تبریز سنانا پسند کرتا ہے۔ اور اُس کا پیغام کیا ہے؟ کافروں کو اپنے منہ پر تھوکنے کی اجازت دو! میں کہتا ہوں، میری زندگی کے عوض! کافر ہو یا نہیں، کوئی بھی عام جنگجو کے منہ پر تھوکنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 13 جون 2008ء

میرے محبوب عزیز،

تم خیال کرو گے کہ میں پاگل ہوں، لیکن کچھ ہے جو میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں: کیا تم شمس ہو؟
یا پھر بات اس کے برعکس ہے؟ کیا شمس تبریز تم یعنی عزیز ہیں؟

مخلص

ایلا

☼

پیاری ایلا،

شمس وہ شخص ہیں جو مولانا رومی کی ایک مقامی مذہبی عالم سے ایک مشہور عالم شاعر اور صوفی میں تبدیلی کے ذمہ دار تھے۔

شیخ سمید مجھ سے کہا کرتے تھے، "چاہے کچھ لوگوں میں شمس تبریز کے مساوی کوئی شخصیت موجود ہو بھی، مگر اہم بات یہ ہے کہ وہ رومی کہاں ہیں جو اُسے پہچان پائیں؟"

والسلام

عزیز

☼

پیارے عزیز،

شیخ سمید کون ہیں؟

مخلص

ایلا

☼

میری محبوب ایلا،

یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ کیا تم واقعی جاننا چاہتی ہو؟

گرم جوشی سے

عزیز

☼

پیارے عزیز،

میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔

محبت کے ساتھ

ایلا

رومی

قونیہ، 2 اگست 1245ء

بھرپور زندگی میں نعمتوں سے سرفراز، ایک مکمل زندگی آپ گزارتے ہیں۔ یا آپ ایسا ہی سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی آتا ہے اور آپ کو یہ ادراک کرواتا ہے کہ اس سارے وقت میں آپ کے پاس کس چیز کی کمی رہی ہے۔ کسی ایسے آئینے کی طرح جو موجود نہیں بلکہ غیر موجود کو بھی منعکس کرتا ہو، وہ آپ پر آپ کی روح کا خالی پن عیاں کرتا ہے... وہ خالی پن جسے دیکھنے سے آپ نے مزاحمت کی تھی، اجتناب کیا تھا۔ وہ شخص کوئی محبوب ہو سکتا ہے، کوئی دوست یا روحانی مرشد۔ بعض اوقات وہ کوئی بچہ ہو سکتا ہے جس کی دیکھ بھال کرنی ہو۔ اہم بات اُس روح کی تلاش ہے جو آپ کی روح کو مکمل کر دے۔ تمام پیغمبروں نے یہی نصیحت کی: کسی ایسے شخص کو تلاش کرو جو تمہارا آئینہ ہو! میرے لیے وہ آئینہ شمس تبریز ہیں۔ یہاں تک کہ وہ آئے اور مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی روح کے شگافوں اور درزوں میں جھانکوں، تب تک میں نے اپنے متعلق بنیادی سچائی کا سامنا نہ کیا تھا: یہ کہ چاہے باہر سے کامیاب، اقبال مند اور آسودہ حال سہی، اندر سے میں تنہا، اداس اور بے تسکین تھا۔

یوں تھا جیسے آپ برسوں میں ایک ذاتی لغت مرتب کرتے ہیں۔ اُس میں آپ ہر اُس خیال یا تصور کی تعریف بیان کرتے ہیں جو آپ کے لیے اہم ہوتا ہے، جیسا کہ "سچ"، "خوشی" یا "حُسن"۔ زندگی کے ہر اہم اور فیصلہ کن موڑ پر آپ اس لغت سے استفادہ کرتے ہیں اور اس کے سرنامہ یا تمہید پر سوال اٹھانے کی ضرورت بہ مشکل ہی کبھی محسوس کرتے ہیں۔ پھر کسی روز کوئی اجنبی آتا ہے اور آپ کی قیمتی لغت چھین کر پھینک دیتا ہے۔

"تمہاری تمام تعریفوں کی نئے سرے سے وضاحت کی ضرورت ہے۔" وہ کہتا ہے، "اب وقت ہے کہ تم وہ سب کچھ فراموش کر دو جو تم پہلے سے جانتے ہو۔"

اور آپ، کسی ایسے سبب سے جو آپ کے دماغ کے لیے ناقابل فہم اور دل کے لیے واضح ہے،

کوئی اعتراض اٹھانے یا پھر اُس کے ساتھ بحث کی بجائے خوشی سے تعمیل کرتے ہیں۔ شمس تبریز نے میرے ساتھ یہی کیا ہے۔ ہماری دوستی نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر انہوں نے مجھے وہ سب فراموش کرنا سکھایا، جو میں پہلے سے جانتا تھا۔

جب آپ کسی سے اِس قدر محبت کرتے ہیں تو آپ اردگرد موجود تمام لوگوں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ بھی اُس سے محبت کریں، آپ کی مسرت اور راحت کو بانٹیں۔ اور جب ایسا نہیں ہوتا تو آپ حیرت محسوس کرتے ہیں، پھر اشتعال اور پھر جیسے اُن کی بے وفائی۔

میں اپنے خاندان اور دوستوں کو ممکنہ طور پر وہ سب کیسے دکھا سکتا تھا جو میں دیکھتا ہوں؟ میں ناقابلِ بیان کو کیسے بیان کر سکتا تھا؟ شمس تبریز میرے لیے بحرِ رحمت وعنایت ہیں۔ وہ میرے لیے سچائی اور ایمان کے شمس ہیں۔ میں انہیں روح کا شاہِ شاہاں کہتا ہوں۔ وہ میرے لیے سرچشمۂ حیات ہیں اور میرے بلند قامت سرو کے درخت، پُرشکوہ اور سدابہار۔ اُن کی رفاقت قرآن پاک کی چوتھی بار قرأت جیسی ہے... ایک سفر جس کا تجربہ صرف باطن سے کیا جا سکتا ہے لیکن اُسے باہر سے یا ظاہراً کبھی بھی سمجھا نہیں جا سکتا۔

بدقسمتی سے بیشتر لوگ عمومی تاثر یا سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اپنے جائزے اور اندازے بناتے ہیں۔ ان کے نزدیک شمس تبریز ایک سنکی درویش ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ شمس تبریز عجیب وغریب برتاؤ رکھتے اور کفریہ باتیں کہتے ہیں، یہ کہ وہ بالکل ناقابلِ پیش گوئی اور ناقابلِ بھروسا ہیں۔ تاہم میرے نزدیک وہ اُس محبت کا لب لباب یا نچوڑ ہیں جو پوری کائنات کو حرکت دیتی ہے، کبھی کبھار پس منظر میں پسپا ہو کر اور ہر شے یا ٹکڑے کو باہم جوڑ کر، کبھی کبھار پھٹ کر پُرزے پُرزے ہو کر۔ اس قسم کا اتفاق زندگی بھر میں ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے۔ اڑتیس برس میں ایک بار۔

جب سے شمس تبریز ہماری زندگیوں میں آئے ہیں، لوگ مجھ سے پوچھتے رہے ہیں کہ ان میں مجھے ایسا کیا خاص نظر آتا ہے۔ لیکن کوئی صورت نہیں کہ میں انہیں جواب دے سکوں۔ انجام کار، وہ لوگ جو سوال پوچھتے ہیں، وہی ہیں جو اس بات کو سمجھ نہیں سکتے اور جہاں تک اُن لوگوں کی بات ہے جو سمجھ سکتے ہیں، وہ ایسی باتیں پوچھتے ہی نہیں۔ میں خود کو جس گومگو کے عالم میں پاتا ہوں، وہ مجھے لیلیٰ اور مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی یاد دلاتا ہے۔ ہارون الرشید نے جب یہ سنا کہ قیس نامی ایک بدوی شاعر، لیلیٰ کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنے عقل وہوش کھو بیٹھا تھا اور اس لیے اُسے مجنوں کہا جاتا تھا، یعنی دیوانہ... خلیفہ اُس عورت کے بارے میں متجسس ہوا جو اس کی غم زدگی اور بدحالی کا سبب بنی تھی۔

''یہ لیلیٰ ضرور کوئی خاص مخلوق ہوگی۔'' اس نے سوچا، ''دوسری تمام عورتوں سے کہیں برتر عورت۔ شاید وہ لاثانی حُسن اور دل فریبی کی مالک کوئی ساحرہ ہے۔''

پُرجوش، متجسس خلیفہ نے لیلیٰ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے ہر چال چلی۔

آخر کار ایک روز اُس کے لوگ لیلیٰ کو خلیفہ کے محل لے آئے۔ جب ہارون الرشید نے لیلیٰ کا نقاب اٹھایا تو اُس کا طلسم ٹوٹ گیا، ازالۂ سحر ہو گیا۔ یہ نہ تھا کہ لیلیٰ کوئی بدصورت، معذور یا بوڑھی تھی لیکن وہ پُرکشش بھی نہ تھی۔ وہ عام انسانی ضرورتوں اور کئی خامیوں والی عام انسان تھی، ایک سادہ سی عورت، لاتعداد دوسری عورتوں جیسی۔

خلیفہ نے اپنی مایوسی چھپائی نہیں۔ ''کیا تم وہی ہو جس کے لیے مجنوں دیوانہ ہوا پھرتا ہے؟ کیوں؟ تم تو اس قدر معمولی سی دکھائی دیتی ہو۔ تم میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

لیلیٰ مسکرا دی۔ ''ہاں، میں ہی لیلیٰ ہوں۔ لیکن آپ مجنوں نہیں ہیں۔'' اُس نے جواب دیا، ''آپ کو مجھے مجنوں کی آنکھوں سے دیکھنا پڑے گا۔ دوسری صورت میں آپ محبت نامی اس معمے کو کبھی حل نہ کر پائیں گے۔''

میں اسی طرح کے معمے کو اپنے خاندان، دوستوں یا طالب علموں کے سامنے کیسے بیان کر سکتا ہوں؟ میں انہیں یہ کیسے سمجھا سکتا ہوں کہ یہ جاننے کے لیے کہ شمس تبریز میں ایسی کیا خاص بات ہے، انہیں شمس تبریز کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھنا پڑے گا؟

کیا پہلے خود محب بنے بغیر کوئی صورت ہے کہ سمجھا جا سکے کہ محبت سے کیا مراد ہے؟
محبت بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔
محبت کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ تاہم، خود محبت ہر شے کی وضاحت کرتی ہے۔

کیمیا

قونیہ،17اگست1245ء

بلاوے کی میں بے چینی سے منتظر رہتی ہوں،لیکن مولانا رومی کے پاس مجھے تعلیم دینے کا اب مزید وقت نہیں۔ مجھے جس قدر اپنے اسباق کی کمی اور اپنا نظر انداز کیے جانا محسوس ہوتا ہے، میں اُس قدر مولانا رومی سے خفا نہیں۔شاید اس لیے کہ مجھے مولانا رومی سے اتنی محبت ہے کہ میں ان سے کوئی تکرار نہیں کرسکتی۔ یا پھر اس لیے کہ میں اوروں سے بہتر طور پر سمجھ سکتی ہوں کہ وہ کیسا محسوس کرتے ہیں کیوں کہ خود میں بھی اس سرکش بہاؤ میں بہہ چکی ہوں جس کا نام ہے،شمس تبریز۔

مولانا رومی کی نگاہیں یوں شمس تبریز کا پیچھا کرتی ہیں جیسے سورج مکھی کا پھول سورج کا۔اُن دونوں کی ایک دوسرے کے لیے محبت اتنی واضح اور شدید ہے، اوران کی یہ محبت اس قدر نایاب ہے کہ اُن کے آس پاس ہوتے انسان یہ جان کر خود کو شکستہ دل محسوس کرتا ہے کہ اُس کی زندگی میں ایسے عظیم تعلق کی کتنی کمی ہے۔گھر میں ہر کسی سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی،سب سے پہلے تو علاؤالدین کو۔ میں نے کئی بار اُسے شمس تبریز کو کاٹ دار نظروں سے گھورتے پایا۔ کیرا بھی بے چین ہے،لیکن وہ کچھ کہتی ہے نہ میں ہی کچھ پوچھتی ہوں۔ ہم سب کسی بارود کے تھیلے میں بند ہیں۔ عجیب بات ہے کہ وہ شخص جو اس سب تناؤ کا ذمے دار ہے،شمس تبریز،وہ اس سب سے لاعلم ہیں یا پھر اُنہیں کوئی پرواہ ہی نہیں۔

میرا ایک حصہ تو شمس تبریز سے خفا ہے کہ اُنہوں نے مولانا رومی کو ہم سے دور کر دیا۔ تاہم،میرا دوسرا حصہ شمس تبریز کو بہتر طور پر جاننے کے لیے بے چین ہے۔ میں کچھ عرصے سے اپنی ان ملی جلی کیفیات کے ساتھ لڑ رہی ہوں،لیکن آج میں خائف ہوں کہ میں نے شاید اپنا آپ ہار دیا ہے۔

سہ پہر ڈھلنے کو تھی جب میں نے طاق سے قرآن پاک اٹھایا کہ میں خود سے پڑھ لوں۔ ماضی میں مولانا رومی اور میں قرآن پاک کو ہمیشہ ترتیب وار آیات کی صورت پڑھتے تھے،لیکن اب جب کہ رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں اور ہماری زندگی الٹ پلٹ ہو چکی ہیں، میں نے کسی ترتیب کے بغیر پڑھنے میں

کوئی حرج محسوس نہ کیا۔ لہٰذا میں نے قرآن کو یونہی درمیان سے کھول کر صفحے کی پہلی آیت پر انگلی رکھ دی۔ یہ سورۃ النساء کی آیت تھی، پورے قرآن میں سے ایک ایسی آیت جو مجھے سب سے زیادہ مشکل لگی تھی۔ خواتین کے بارے احکامات کے حوالے سے، سورۃ النساء مجھے سمجھنے میں مشکل اور قبول کرنے میں مشکل ترین لگتی تھی۔ اُس آیت کو وہاں کھڑے پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اس آیت کو سمجھنے کے لیے کسی کی مدد حاصل کروں۔ مولانا رومی تو باقاعدگی سے اسباق نہیں دے رہے تھے، لیکن کوئی وجہ نہ تھی کہ میں ان سے کوئی سوال نہ پوچھ سکتی۔ لہٰذا میں نے قرآن پاک اٹھایا اور اُن کے کمرے میں چلی آئی۔

کمرے میں مولانا رومی کی بجائے شمس تبریز کو پا کر میں حیران ہوئی، وہ کھڑکی کے پاس ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھے تھے۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی اُن کے چہرے کو سہلا رہی تھی۔ وہ اس قدر وجیہہ لگ رہے تھے کہ مجھے اپنی نگاہیں چرانا پڑیں۔

''معافی چاہتی ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا، ''میں مولانا کو ڈھونڈ رہی تھی۔ میں بعد میں آجاؤں گی۔''

''اتنی جلدی کیوں ہے؟ رُکو۔'' شمس تبریز نے کہا، ''لگتا ہے کہ تم یہاں کچھ پوچھنے آئی ہو۔ شاید میں کوئی مدد کر سکوں۔''

مجھے اُن کے ساتھ یہ بات کرنے میں کوئی مضائقہ محسوس نہ ہوا۔ ''قرآن پاک کی ایک آیت ہے جسے سمجھنے میں مجھے دشواری ہو رہی ہے۔'' میں نے یوں ہی آزمائشی طور پر کہہ دیا۔

شمس تبریز جیسے خود سے مخاطب کچھ بڑبڑائے۔ ''قرآن کسی شرمیلی دلہن کی طرح ہے۔ وہ اپنا نقاب صرف اُس وقت اٹھائے گا جب اُسے یقین ہو کہ اُسے دیکھنے والا ایک نرم اور دردمند محبت کرنے والے دل کا مالک ہے۔'' پھر اُنہوں نے کندھے اچکائے اور پوچھا، ''کون سی سورۃ ہے؟''

''سورۃ النساء۔'' میں نے کہا، ''اس سورۃ میں کچھ آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے۔ یہاں تک کہ مرد اپنی بیویوں کو مار پیٹ بھی سکتے ہیں...''

''کیا ایسا ہی ہے؟'' شمس تبریز نے اتنی مبالغہ آمیز دلچسپی سے پوچھا کہ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سنجیدہ تھے یا مجھے تنگ کر رہے تھے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد، وہ ہولے سے مسکرائے اور اُس آیت کو زبانی پڑھا۔

''مرد، عورتوں پر قوام ہیں، اس لیے کہ اللہ نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمانبردار ہوتی ہیں اور ان کی پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت میں مال و آبرو کی خبرداری کرتی ہیں اور جن عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سرکشی اور بدخوئی کرنے لگی ہیں تو پہلے ان کو زبانی سمجھاؤ، اگر نہ سمجھیں تو پھر ان کے ساتھ سونا ترک کر دو، اگر اس پر بھی باز نہ آئیں تو زدوکوب کرو۔ پھر اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان کو ایذا دینے کا کوئی بہانہ مت ڈھونڈو۔

صرف ایک دریا نظر آتا ہے۔ لیکن جو اس کے اندر اُتر کر تیرتے ہیں، اُن کے لیے اس میں چار قسم کے بہاؤ ہیں۔ مختلف قسم کی مچھلیوں کی طرح، ہم میں سے کچھ سطح کے قریب رہ کر تیرتے ہیں جب کہ کچھ لوگ اس کے اندر گہرے پانیوں میں تیراکی کرتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ میں سمجھی نہیں۔'' میں نے کہا، اگرچہ میں سمجھنے لگی تھی۔

''سطح کے قریب رہ کر تیرنے والے قرآن کے ظاہری مطالب پر قانع ہیں۔ بیشتر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ آیات کو اُن کے ظاہری معانی میں ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی حیرت نہیں کہ جب وہ سورۃ النساء کی تلاوت کرتے ہیں تو وہ یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ کیوں کہ یہی ہے جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''دوسرے بہاؤ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

شمس تبریز نے ہولے سے سانس بھری، اور میں خود کو ان کے ذہن کا جائزہ لینے سے روک نہ پائی، کسی خفیہ باغ کی طرح پُراسرار اور دعوت انگیز۔

''تین اور بہاؤ ہیں۔ دوسرا بہاؤ پہلے کی نسبت ذرا گہرا ہے، لیکن پھر بھی وہ سطح سے قریب ہے۔ آگہی جتنی بڑھتی جائے گی، اتنی ہی قرآن پاک پر گرفت بھی بڑھے گی۔ لیکن اس کے لیے، تمہیں دریا میں چھلانگ لگانا ہوگی۔''

اُن کو سنتے ہوئے، میں نے خود کو ایک ہی وقت میں خالی اور مطمئن دونوں محسوس کیا۔ ''جب آپ چھلانگ لگا دیں تو کیا ہوتا ہے؟'' میں نے محتاط ہو کر پوچھا۔

''تیسرا بہاؤ مخفی باطنی علم ہے۔ اگر باطن کی آنکھ کھول کر سورۃ النساء کی تلاوت کی جائے تو تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ آیت عورتوں اور مردوں کے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ مردانگی اور نسوانیت کے بارے میں ہے۔ اور ہم میں سے ہر ایک میں، بہ شمول تمہارے اور میرے، نسوانیت اور مردانگی موجود ہیں، مختلف درجے اور رنگ میں۔ ہم ان دونوں کو اپنا اور خود میں سمو کر ہی ہم آہنگ وحدت یا یکتائی حاصل کر سکتے ہیں۔''

''کیا آپ مجھے بتا رہے ہیں کہ میرے اندر مردانگی موجود ہے؟''

''ہاں بالکل۔ اور میرا بھی ایک نسوانی پہلو ہے۔''

میں اپنی بے ساختہ ہنسی روک نہ سکی۔ ''اور مولانا رومی؟ اُن کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

شمس تبریز ذرا مسکرائے۔ ''ہر آدمی کے اندر کسی حد تک نسوانیت موجود ہوتی ہے۔''

''حتیٰ کہ اُن میں بھی جو جواں مرد ہیں؟''

''خاص طور پر اُن ہی میں، میری عزیزہ۔'' شمس تبریز نے اپنے الفاظ کو ایک چٹکی سے سجاتے اور اپنی آواز کو سرگوشی میں ڈھالتے ہوئے کہا، یوں جیسے کسی راز میں شریک کر رہے ہوں۔

کسی ننھی بچی کی طرح محسوس کرتے میں نے اپنی ہنسی دبالی۔ وہ شمس تبریز کے اس قدر قریب ہونے کا اثر تھا۔ وہ عجیب شخص تھے، اُن کی آواز عجیب طور پر مسحور کن تھی، اُس کے ہاتھ مضبوط اور لچک دار تھے، اور سورج کی کرن جیسی اُن کی نگاہ، جو جس چیز پر پڑتی اُسے مزید زندگی اور رونق بخش دیتی تھی۔ اُن کے قریب میں نے اپنی نوجوانی کو بھرپور طریقے سے محسوس کیا اور ماتا کی بوجھل دودھیا خوشبو پھیلاتے میرے اندر کہیں ممتا کی حس بیدار ہوگئی۔ میں اُن کی حفاظت چاہتی تھی۔ کیسے اور کس سے؟ میں نہیں بتا سکتی تھی۔

شمس تبریز نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا، اُن کا چہرہ اتنا قریب تھا کہ میں اُن کے سانسوں کی حدت محسوس کرسکتی تھی۔ اب اُن کی آنکھوں میں ایک نئی، خواب ناک سی کیفیت تھی۔ اپنے لمس سے اُنہوں نے مجھے جیسے مقید کرلیا تھا، میرے رخسار سہلاتی ان کی انگلیوں کی پوریں کسی شعلے کی سی تپش دے رہی تھیں۔ میں حیران وششدر تھی۔ پھر اُن کی انگلیاں میرے نچلے ہونٹ کی طرف بڑھیں۔ ہکا بکا اور چکراتے ہوئے، اپنے سینے میں اٹھتے جوش وخروش کے ساتھ، میں نے اپنی آنکھیں موندلیں۔ لیکن انہوں نے میرے لبوں کو چھوتے ہی اپنا ہاتھ پرے کھینچ لیا۔

''تمہیں اب جانا چاہیے، پیاری رکمیا۔'' میرے نام کو کسی اُداسی بھرے لفظ میں بدلتے ہوئے شمس تبریز زیرلب بولے۔

میں باہر نکل آئی، میرا سر چکرا رہا تھا اور میرے رخسار سرخ تھے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹتے اور چھت کو گھورتے ہوئے یہ سوچتے کہ شمس تبریز کو بوسہ دینا کیسا محسوس ہوگا، تبھی مجھ پر آشکار ہوا کہ میں نے اُن سے ندی کے چوتھے زیرآب دھارے کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں تھا... قرآن کا گہرائی سے مطالعہ۔ وہ کیا تھا؟ کوئی شخص وہ گہرائی کیسے حاصل کرسکتا تھا؟

اور اُن کے ساتھ کیا رونما ہوا جنہوں نے غوطہ لگالیا؟

سلطان ولد

قونیہ، 4 ستمبر 1245ء

بڑا بھائی ہونے کے ناتے، میں علاؤالدین کے بارے میں ہمیشہ فکرمند رہا ہوں، لیکن آج کل سے زیادہ کبھی نہیں۔ بچپن ہی سے غصہ ہمیشہ سے اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے، لیکن آج کل تو وہ زیادہ جھگڑالو اور جلد مشتعل ہونے والا ہو گیا ہے۔ ذرا سی اور معمولی سی بات پر بھی جھگڑا کرنے کو تیار، آج کل وہ اس قدر جھکی اور چڑچڑا ہو گیا ہے کہ گلی کے بچے تک اُسے آتا دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ صرف سترہ برس کی عمر ہی میں، تیوریاں چڑھانے اور آنکھیں سکیڑنے کے باعث اُس کی آنکھوں کے گرد جھریاں نمودار ہو گئی ہیں۔ آج صبح ہی میں نے اُس کے ہمیشہ سختی سے بھینچے دہن کے قریب ایک نئی شکن دیکھی ہے۔

میں بھیڑ کی کھال کے چرمی کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا جب میں اپنے پیچھے ہلکا سا شور سن کر چونک گیا۔ وہ علاؤالدین تھا، اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے اور پیشانی پر بل تھے۔ خدا ہی جانے وہ کب سے وہاں اس حالت میں کھڑا اپنی بھوری آنکھوں میں تناؤ بھرا تاثر لیے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کر رہا تھا۔

''میں بابا کے ایک پرانے وعظ کو تحریر کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا، ''اچھا ہو کہ ہر وعظ کی ایک اضافی نقل موجود ہو۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' علاؤالدین بلند آواز میں بولا، ''بابا نے وعظ دینا ہی بند کر دیا ہے۔ اگر تمہیں محسوس نہیں ہوا تو بتا دوں کہ وہ اب مدرسے میں بھی تعلیم نہیں دیتے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ انہوں نے اپنی تمام ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دیا ہے؟''

''یہ عارضی ہے۔'' میں نے کہا، ''وہ جلد دوبارہ پڑھانا شروع کر دیں گے۔''

''تم بس اپنے آپ کو بے وقوف بنا رہے ہو۔ کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ بابا کے پاس اب کسی کے لیے بھی وقت نہیں، سوائے شمس تبریز کے؟ کیا یہ مضحکہ خیز نہیں؟ وہ آدمی جو کوئی سرگرداں درویش

ہے، اُس نے تو ہمارے گھر میں ڈیرہ ہی جما لیا ہے۔''

اس انتظار میں کہ میں اس سے اتفاق کروں، علاؤالدین ایک طنزیہ ہنسی ہنسنے لگا لیکن جب میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ کمرے میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ میں اُس کی طرف دیکھے بغیر بھی اُس کی آنکھوں سے نکلتے غصے کے شعلے محسوس کر سکتا تھا۔

''لوگ باتیں بنانے لگے ہیں۔'' علاؤالدین نے اب چڑچڑے پن سے کہا، ''سب ایک ہی سوال پوچھ رہے ہیں: اُن جیسے معزز عالم نے خود کو ایک کافر کے ہاتھوں کیسے بے وقوف بننے دیا؟ ہمارے والد کی نیک نامی سورج تلے پگھلتی برف جیسی ہو گئی ہے۔ اگر انہوں نے جلد خود پر اختیار حاصل نہیں کیا تو انہیں دوبارہ اس شہر میں انہیں کبھی شاگرد نہیں مل پائیں گے۔ کوئی بھی انہیں اپنا معلم نہیں بنانا چاہے گا۔ اور اس پر میں لوگوں کو الزام نہیں دوں گا۔''

میں نے کاغذ ایک طرف ہٹایا اور اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی نوعمر لڑکا ہی تھا، اگرچہ اُس کا ہر تاثر اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ خود کو مردانگی کی حد میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ گزشتہ ایک سال میں بہت بدل گیا تھا اور مجھے شک سا ہونے لگا تھا کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار تھا۔ بس میں یہ نہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی کون ہو سکتی تھی اور اُس کے قریبی دوست مجھے کچھ بتاتے نہیں۔

''برادر، میں جانتا ہوں کہ تمہیں شمس تبریز پسند نہیں، لیکن وہ ہمارے گھر میں مہمان ہیں اور ہمیں اُن کا احترام کرنا چاہیے۔ لوگوں کی باتوں پر توجہ مت دو۔ ایمان داری سے کہوں تو چھچھوندر کی کھودی مٹی کو پہاڑ مت کہو۔''

اپنے زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہی مجھے اپنے حکمیہ لہجے پر پچھتاوا سا ہوا۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ علاؤالدین کو کسی خشک لکڑی کی طرح فوراً ہی آگ لگ جاتی تھی۔

''چھچھوندر کا بل؟'' علاؤالدین نے ناک چڑھایا۔ ''ہم پر نازل ہونے والی آفت کو تم ایسا کہہ رہے ہو؟ تم اتنے اندھے کیسے ہو سکتے ہو؟''

میں نے ایک اور چرمی کاغذ نکالا اور اُس کی نازک سطح سہلانے لگا۔ مجھے اپنے والد کے الفاظ تحریر کر کے اور یہ سوچ کر کہ ایسا کر کے میں ان الفاظ کی زندگی بڑھا رہا ہوں، ہمیشہ بہت خوشی ہوتی تھی۔ چاہے ہزار برس گزر جاتے تب بھی لوگ میرے والد کی تعلیمات پڑھ سکتے اور اُن سے متاثر ہو سکتے تھے۔ اس میں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے، چاہے چھوٹا ہی سہی، مجھے فخر محسوس ہوتا تھا۔

اب بھی شکایت کرتے، علاؤالدین میرے پہلو میں کھڑا، اپنی متفکر اور تلخ نگاہوں سے میرا کام دیکھ رہا تھا۔ لمحے بھر کے لیے، میں نے اُس کی نظروں میں جھانکا اور اُس لڑکے کا چہرہ پہچان لیا جو اپنے باپ کی محبت چاہتا تھا۔ ڈوبتے دل کے ساتھ، مجھے ادراک ہوا کہ وہ دراصل شمس تبریز سے نہیں بلکہ بابا سے خفا تھا۔

اپنے والد سے محبت نہ ملنے اور وہ جیسا تھا ویسا ہی نہ چاہنے پر علاؤالدین ناراض تھا۔ میرے والد ممتاز شخصیت اور مشہور ہو سکتے تھے لیکن وہ اُس موت کے سامنے بے بس ہی تھے جس نے ہمارے بچپن میں ہی ہم سے ہماری ماں کو چھین لیا تھا۔

''لوگ کہتے ہیں شمس تبریز نے ہمارے والد پر جادو کر دیا ہے۔'' علاؤالدین نے کہا، ''لوگ کہتے ہیں کہ اُسے حشاشین نے بھیجا ہے۔''

''حشاشین!'' میں نے احتجاج کیا۔ ''کیا بکواس ہے۔''

حشاشین ایک ایسا فرقہ تھا جو قتل کے پیچیدہ طریقوں اور زہر کے وسیع پیمانے پر استعمال کے سبب معروف تھا۔ بارسوخ شخصیات کو ہدف بناتے ہوئے وہ انہیں سرِ عام قتل کرتے تا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی دہشت اور رعب بیٹھ جائے۔ یہاں تک کہ انہوں نے سلطان صلاح الدین کے خیمے میں ایک خط کے ساتھ زہریلا کھانا رکھا تھا، خط میں لکھا تھا کہ تم ہماری دسترس میں ہو۔ اور عظیم مسلمان سپہ سالار صلاح الدین جو عیسائی صلیبی سپاہ کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے اور یروشلم کو دوبارہ فتح کیا تھا، حشاشین کے خلاف لڑنے کی ہمت انہیں بھی نہ ہوئی، انہوں نے اُن کے ساتھ پُرامن طریقے سے رہنے کو ترجیح دی۔ لوگ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ شمس تبریز کا تعلق اس دہشت گرد فرقے سے ہو سکتا تھا؟

میں نے اپنا ہاتھ علاؤالدین کے شانے پر رکھا اور اُسے اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔ ''اس کے ساتھ ساتھ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ فرقہ اب پہلے جیسا نہیں رہا؟ وہ اب نام کو ہی رہ گئے ہیں۔''

علاؤالدین نے ذرا دیر کو اس امکان پر سوچا۔ ''ہاں، لوگ کہتے ہیں کہ حسن بن صباح کے تین وفادار سالار تھے جو اس عہد کے ساتھ قلعہ الموت سے نکل گئے تھے کہ جہاں بھی جائیں گے، خوف و دہشت پھیلائیں گے۔ لوگوں کو شبہ ہے کہ شمس تبریز اُن کا سرغنہ ہے۔''

میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ ''خدا میری مدد فرمائے! اور برائے مہربانی کیا تم مجھے بتانا چاہو گے کہ کوئی حشاشین ہمارے والد کو کیوں قتل کرنا چاہے گا؟''

''کیوں کہ وہ بارسوخ لوگوں سے نفرت کرتے ہیں اور انہیں انتشار پھیلانا پسند ہے۔'' علاؤالدین نے جواب دیا۔ وہ اپنے سازشی نظریات پر خود ہی اتنا مشتعل تھا کہ اس کے رخسار سرخ ہو چکے تھے۔

میں جانتا تھا کہ مجھے اس سب سے بڑی احتیاط سے نمٹنا تھا۔ ''دیکھو، لوگ تو ہمیشہ ہر طرح کی باتیں کرتے ہی ہیں۔'' میں نے کہا، ''تم ان فضول افواہوں کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لے سکتے۔ اپنے دماغ کو بدطینت سوچوں سے پاک کرو۔ یہ تمہیں زہر آلود کر رہی ہیں۔''

علاؤالدین نے خفگی سے ہنکارا بھرا لیکن میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہو سکتا ہے ذاتی طور پر تمہیں شمس تبریز پسند نہ ہوں۔ پسند کرنا ضروری بھی نہیں۔ لیکن ہمارے والد کی خاطر تمہیں اُن کو عزت دینی چاہیے۔''

علاؤالدین نے مجھے تلخ اور ناراض نظروں سے دیکھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی نہ صرف والد سے ناراض اور شمس تبریز پر غصے میں تھا بلکہ وہ مجھ سے بھی ناامید ہو چکا تھا۔ اُس نے شمس تبریز کے لیے میری تعریف کو میری کمزوری کی نشانی سمجھا۔ شاید اُس نے سوچا ہوگا کہ اپنے والد کی پسندیدگی حاصل کرنے کی خاطر میں خوشامد پسند اور کمزور ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا شبہ سا ہی ہوا، لیکن اس شک پر مجھے بہت تکلیف ہوئی۔

پھر بھی، میں اُس پر غصہ نہ کر سکا اور اگر کرتا بھی، تو میری خفگی زیادہ دیر نہ رہتی۔ وہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔ میرے لیے وہ ہمیشہ وہی بچہ رہے گا جو آوارہ بلیوں کے پیچھے بھاگتا تھا، بارش سے بننے والے کیچڑ کے تالابوں میں اپنے پیر گندے کر لیتا تھا اور سارا دن روٹی پر دہی رکھ کر کھاتا رہتا تھا۔ میں خود کو اس کے چہرے میں وہ بچہ دیکھنے سے روک نہ پایا جو قدرے فربہی مائل اور چھوٹا سا تھا، وہ بچہ جس نے اپنی ماں کی موت کی خبر ایک بھی آنسو بہائے بغیر سنی تھی۔ وہ صرف اپنے پیروں کو دیکھتا رہا تھا، یوں جیسے اچانک ہی اُسے اپنے جوتوں پر شرمندگی ہونے لگی ہو اور اپنا نچلا ہونٹ چباتا رہا، یہاں تک کہ وہ زرد پڑ گیا۔ اُس کے منہ سے کوئی لفظ نکلا نہ ہی اس نے کوئی سسکی ہی بھری۔ کاش وہ تب رو لیتا۔

''کیا تمہیں وہ وقت یاد ہے جب محلے کے ایک بچے سے تمہاری لڑائی ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا، ''تم خون آلود ناک کے ساتھ روتے ہوئے گھر واپس آئے تھے۔ اُس وقت ہماری ماں نے تم سے کیا کہا تھا؟''

علاؤالدین کی آنکھیں پہلے سکڑیں اور پھر جیسے کچھ یاد آنے پر پھیل گئیں، لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔

''انہوں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں جب کبھی کسی پر غصہ آئے، تو اپنے ذہن میں اُس شخص کا چہرہ کسی ایسے شخص کے چہرے سے بدل دو جس سے تمہیں محبت ہو۔ کیا تم نے شمس تبریز کا چہرہ ہماری ماں کے چہرے سے بدلنے کی کوشش کی؟ شاید یوں تم شمس تبریز کے اندر کچھ ایسا تلاش کر سکو جو تمہیں پسند ہو۔''

کسی گزرتے بادل جیسی ایک ہلکی سی وزدیدہ مسکراہٹ علاؤالدین کے لبوں پر منڈلائی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس مسکراہٹ نے اُس کے تاثرات کو کتنا نرما دیا تھا۔

''شاید میں ایسا کر سکتا ہوں۔'' اُس نے کہا۔ اُس کے لہجے سے اب سارا غصہ نچڑ گیا تھا۔

میرا دل جیسے پگھل گیا۔ میں نے اپنے بھائی کو گلے لگا لیا، نہ جانتے ہوئے کہ مزید کیا کہوں۔ جب اُس نے جواباً مجھے گلے لگایا تو مجھے اعتماد محسوس ہوا کہ وہ شمس تبریز سے اپنا تعلق بہتر کرے گا اور ہمارے گھر میں سکون اور ہم آہنگی لوٹ آئے گی۔

لیکن میں اس سے زیادہ غلط فہمی کا شکار نہ ہو سکتا تھا، یہ مجھے بعد میں ہونے والے واقعات سے ہی معلوم ہو سکا۔

کیرا

قونیہ، 22 اکتوبر 1245ء

بند دروازے کے پیچھے اگلے روز خدا ہی جانے کہ شمس تبریز اور مولانا رومی جوش وخروش سے کون سی باتیں کر رہے تھے۔ میں حلوے کا طشت لیے دستک دے کر جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلی آئی۔ میری موجودگی میں شمس تبریز کچھ نہیں کہتے، یوں جیسے میری موجودگی اُنہیں خاموش رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ کبھی میرے کھانے پکانے کی صلاحیت پر بھی تبصرہ نہیں کرتے۔ وہ یوں بھی بہت کم ہی کھاتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یہ لگتا ہے کہ اُنہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اُن کے لیے کوئی شان دار کھانا بناؤں یا پھر سادہ وخشک روٹی ہی پیش کروں۔ لیکن اس بار حلوے کا لقمہ لیتے ہی اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

''یہ تو بہت مزیدار ہے، کیرا۔ تم نے یہ کیسے بنایا؟'' اُنہوں نے پوچھا۔

پتا نہیں میرے ذہن پر کیا خیال سوار ہوا۔ تعریف پر خوش ہونے کی بجائے، میں نے خود کو ترکی بہ ترکی یہ کہتے پایا، ''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں اگر بتا بھی دوں تو آپ اِسے بنا نہیں سکتے۔''

شمس تبریز نے میری نظروں میں اپنی نگاہیں گاڑیں اور ہولے سے سر ہلایا، یوں جیسے میری کسی بات سے اتفاق کر رہے ہوں۔ میں منتظر رہی کہ وہ مزید کچھ کہیں، لیکن وہ بس خاموش اور پُرسکون کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد، میں کمرے سے نکل کر اس واقعے کے بارے میں سوچتی ہوئی واپس باورچی خانے میں آ گئی۔ جو کچھ آج صبح ہوا، نہ ہوتا تو شاید مجھے یہ واقعہ دوبارہ کبھی یاد بھی نہ آتا۔

☼

میں باورچی خانے میں چولہے کے پاس بیٹھی مکھن بلو رہی تھی جب میں نے باہر صحن میں کچھ شور سنا۔ میں باہر بھاگی اور مجھے ایک عجیب پاگلانہ منظر دکھائی دیا۔ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں بکھری تھیں، اونچے میناروں کی صورت پڑی تھیں اور فوارے کے اندر بھی کتابیں تیر رہی تھیں۔ کتابوں کی روشنائی تحلیل ہونے سے فوارے کا پانی گہرا نیلا ہو گیا تھا۔

مولانا رومی کی موجودگی میں شمس تبریز نے اُس ڈھیر سے ایک کتاب اٹھائی...المتنبی کا مجموعۂ کلام... اُسے بڑی سخت تاثرات سے دیکھا اور پانی میں اچھال دیا۔ کتاب کے پانی میں غرق ہوتے ہی اُنہوں نے دوسری کتاب اٹھالی۔ اس مرتبہ وہ فریدالدین عطار کی ''کتاب اسرار'' تھی۔

میں نے دہشت کے عالم میں سانس روک لی۔ ایک ایک کرکے، وہ مولانا رومی کی پسندیدہ کتابیں ضائع کررہے تھے! اگلی کتاب جو اُنہوں نے پانی میں اچھالنے کے لیے اٹھائی، وہ مولانا رومی کے والد کی تھی، الہامی علوم۔ جانتے ہوئے کہ مولانا رومی کو اپنے والد سے کتنی محبت و عقیدت تھی اور یہ قدیم نسخے اُنہیں کتنے عزیز تھے، میں نے اس امید میں مولانا رومی کو دیکھا کہ اُنہیں غصے کا دورہ پڑ جائے گا۔

اس کی بجائے میں نے مولانا رومی کو موم جیسا زرد چہرے لیے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ ایک طرف کھڑے دیکھا۔ میں بالکل سمجھ نہ پائی کہ اُنہوں نے شمس تبریز کو کیوں کچھ نہ کہا۔ وہ شخص جس نے مجھے ایک بار کتابوں سے گرد جھاڑنے پر سختی سے ڈانٹا تھا، اب مہر بہ لب کھڑا ایک دیوانے کو اپنے کتب خانے کی ساری کتابیں برباد کرتے دیکھ رہا تھا۔ یہ ناانصافی تھی۔ اگر مولانا رومی مداخلت نہیں کرتے تو میں کروں گی۔

''آپ یہ کیا کررہے ہو؟'' میں نے شمس تبریز سے پوچھا، ''ان کتابوں کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں۔ یہ بہت قیمتی ہیں۔ آپ انہیں پانی میں کیوں پھینک رہے ہیں؟ دیوانے تو نہیں ہوگئے؟''

شمس تبریز نے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنا رُخ مولانا رومی کی طرف موڑا۔ ''کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟'' اُنہوں نے پوچھا۔

مولانا رومی اپنے ہونٹ بھینچے اور ذرا سا مسکرا دیے مگر خاموش رہے۔

''آپ کچھ کہتے کیوں نہیں؟'' میں نے چلا کر اپنے شوہر سے کہا۔

مولانا رومی اس پر میرے قریب آئے اور نرمی سے میرا ہاتھ تھام کر بولے، ''پُرسکون ہوجاؤ کیرا، مجھے شمس پر بھروسا ہے۔''

پُرسکون اور پُراعتماد شمس تبریز نے انکھیوں سے مولانا رومی کو دیکھتے ہوئے، اپنی آستینیں اوپر چڑھائیں اور کتابوں کو پانی سے نکالنے لگے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ہر کتاب جو انہوں نے پانی سے باہر نکالی، وہ بالکل خشک تھی۔

''کیا یہ کوئی جادو ہے؟ آپ نے ایسا کیسے کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''لیکن تم پوچھ کیوں رہی ہو؟'' شمس تبریز کہنے لگے، ''میں اگر بتا بھی دوں تو تم ایسا نہیں کرسکتی۔''

غصے سے کانپتے اور اپنی سسکیوں کا دَم گھونٹتے ہوئے میں باورچی خانے کی طرف بھاگی، جو ان دنوں میری جائے پناہ بن چکا ہے۔ اور وہاں برتنوں اور دیگچوں، جڑی بوٹیوں اور مصالحوں کے ڈھیر کے درمیان بیٹھ کر میں جی بھر کر روئی۔

رومی

قونیہ، دسمبر 1245ء

باہر کھلی فضا میں نمازِ فجر ادا کرنے کے ارادے سے میں اور شمس تبریز صبح پُو پھٹتے ہی گھر سے نکل آئے تھے۔ وادیوں اور سبزہ زاروں میں اور خنک ندیوں کے کنارے ہم نے اپنے چہروں کو چھوتی ہوا سے لطف اندوز ہوتے کچھ دیر گھڑسواری کی۔ گندم کے کھیتوں میں بیچ کاگ نے ایک عجیب دل آویزی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہمارے گزرنے کے دوران کسانوں کے گھروں کے سامنے پھیلے تازہ دُھلے کپڑے نیم تاریکی میں جیسے چہار اطراف اشارہ کرتے ہوئے ہوا سے پھڑ پھڑائے۔

واپسی پر، شمس تبریز نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور شہر کے باہر شاہ بلوط کے ایک بڑے سے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں درخت تلے بیٹھ گئے۔ ہمارے سروں پر آسمان گہرا نیلا رنگ بدل رہا تھا۔ شمس تبریز نے اپنی چادر زمین پر بچھائی اور جب قریب و دُور کی مساجد سے اذانیں بلند ہوئیں تو ہم نے وہاں اکٹھے نماز ادا کی۔

''جب میں پہلی بار قونیہ آیا تو اسی درخت تلے بیٹھا تھا۔'' شمس تبریز نے کہا۔ وہ کسی پرانی یاد پر مسکرا دیے لیکن پھر متفکر ہو کر بولے، ''ایک دہقان نے مجھے اپنی بیل گاڑی پر سوار کیا تھا۔ وہ آپ کا عقیدت مند تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ آپ کے درس افسردگی رفع کرتے تھے۔''

''لوگ مجھے لفظوں کا ساحر کہتے تھے۔'' میں نے کہا، ''لیکن اب یہ جیسے کوئی پرانی بات لگتی ہے۔ میں اب مزید وعظ نہیں دینا چاہتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے حصے کا کام کر چکا ہوں۔''

''آپ واقعی لفظوں کے ساحر ہیں۔'' شمس تبریز نے پُرعزم لہجے میں کہا، ''لیکن اب آپ تبلیغ کرنے والا دماغ نہیں بلکہ گنگناتا دل ہیں۔''

مجھے نہیں معلوم کہ اُن کا کیا مطلب تھا اور میں نے پوچھا بھی نہیں۔ صبح نے آسمان کو بے داغ نارنجی رنگوں میں بدلتے ہوئے رات کی باقیات بھی مٹا دی تھیں۔ دُور شہر بیدار ہو رہا تھا، کوے سبزی کے

کھیتوں میں غوطہ لگا کر جھپٹ رہے تھے تا کہ جو ملے اچک لے جائیں، دروازے چرچرا رہے تھے، گدھے رینک رہے تھے اور چولہے جل رہے تھے کہ ہر کوئی ایک نئے دن کے استقبال کی تیاری میں تھا۔

''لوگ ہر جگہ اپنی تکمیل کی تگ و دو میں ہیں، لیکن بغیر کسی رہنمائی کے کہ اسے حاصل کیسے کریں۔'' شمس تبریز نے زیرِ لب کہتے ہوئے سر جھٹکا۔ ''آپ کے الفاظ اُن کی مدد کرتے ہیں۔ اور میرے اختیار میں جو کچھ ہوا، میں آپ کی مدد کے لیے کروں گا۔ میں آپ کا خادم ہوں۔''

''ایسا مت کہیے۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''آپ میرے رفیق ہیں۔''

میرے اعتراض سے بے نیاز شمس تبریز نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں صرف اُس خول کے بارے میں فکرمند ہوں جس میں آپ رہتے رہے ہیں۔ ایک معروف مبلغ کی حیثیت سے، آپ کے گرد خوشامدی مداحوں کا ہجوم رہا ہے۔ لیکن عام لوگوں کو آپ بھلا کیا جانتے ہیں؟ شرابی، گداگر، چور، طوائفیں، جواری... یہ لوگ سب سے زیادہ دل شکستہ اور پامال لوگ ہیں۔ کیا ہم خدا کی ساری مخلوق سے محبت رکھ سکتے ہیں؟ یہ ایک مشکل امتحان ہے جس سے صرف چند لوگ ہی کامیابی سے گزر سکتے ہیں۔''

میں نے اُن کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے ہمدردی اور فکرمندی دیکھی اور کچھ ایسی کیفیت جو ماں کے درد جیسی تھی۔

''آپ درست کہتے ہیں۔'' میں نے اتفاق کیا۔ ''میں نے ہمیشہ ایک محفوظ زندگی گزاری ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ عام لوگ کیسے رہتے ہیں۔''

شمس تبریز نے مٹی کا ڈھیلا اٹھایا اور اسے اپنی اُنگلیوں کے درمیان مسل دیا، پھر وہ نرمی سے بولے، ''اگر ہم کائنات کو پوری طرح اپنا لیں، اس کے تمام اختلافات اور تضادات کے ساتھ، تو سب کچھ پگھل کر وحدت میں بدل جائے گا۔''

یہ کہہ کر شمس تبریز نے زمین پر گری شاخ اٹھائی اور شاہ بلوط کے گرد ایک دائرہ کھینچا۔ اس کے بعد، انہوں نے اپنے بازو آسمان کی طرف اٹھائے، یوں جیسے کسی غیر مرئی رسّی پر اوپر چڑھنا چاہتے ہوں، اور اللہ کے ننانوے اسمائے مبارک دہرائے۔ اس دوران، وہ اُس کھینچے گئے دائرے کے اندر گھومنے لگے، پہلے آہستگی اور دھیرج سے، اور پھر تیزی سے رفتار بڑھاتے ہوئے وہ سہ پہر کی ہوا کی طرح گھومنے لگے۔ اُن کا یہ جنون اس قدر سحر انگیز تھا کہ میں خود کو یہ محسوس کرنے سے روک نہ پایا جیسے پوری کائنات... یہ زمین، ستارے، اور چاند... سب کے سب اُن کے ساتھ گردش میں رقصاں تھے۔ میں یہ بے حد غیر معمولی رقص دیکھ رہا تھا جس سے خارج ہوتی توانائی میرے روح و بدن کو گھیر رہی تھی۔

بالآخر شمس تبریز آہستہ آہستہ رُک گئے، ان کی سانس کے ساتھ اُن کا سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا، ان کا چہرہ سفید تھا اور آواز اچانک اتنی گمبھیر ہو گئی جیسے کہیں دُور سے آ رہی ہو۔ ''یہ کائنات وجودِ واحد ہے۔ ہر شے اور ہر شخص کہانیوں کے غیر مرئی دھاگوں سے ایک دوسرے سے جڑا ہے۔ چاہے ہم اس بات سے

واقف ہوں یا نہیں، لیکن ہم سب ایک خاموش گفتگو میں شریک ہیں۔ کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ دردمندی سے پیش آؤ۔ کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی مت کرو، بہ ظاہر کوئی بے ضرر تبصرہ بھی نہیں! ہماری زبان سے نکلے الفاظ فنا نہیں ہوتے بلکہ اس فضائے بسیط میں ہمیشہ کے لیے ذخیرہ ہو جاتے ہیں اور پھر وقتِ مقررہ پر ہم تک واپس پلٹ آئیں گے۔ کسی ایک شخص کا درد ہم سب کو تکلیف میں مبتلا کردے گا۔ کسی ایک شخص کی خوشی ہم سب کو خوش کردے گی۔" وہ زیرِ لب بولے، "چالیس اصولوں میں سے ایک ہمیں یہی بتاتا ہے۔"

پھر انہوں نے اپنی متجسس نگاہ مجھ پر جمادی۔ اُن کی آنکھوں کی بے انت گہرائی میں مایوسی کا سایہ سا تھا، افسردگی کی ایک لہر تھی جو اس نے پہلے میں نے اُن میں کبھی نہ دیکھی تھی۔

"ایک دن آپ صدائے عشق کے طور پر جانے جائیں گے۔" شمس تبریز نے کہا، "مشرق و مغرب میں ایسے لوگ جنہوں نے آپ کو کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا، وہ آپ کی صدا سے متاثر ہوں گے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"آپ کے الفاظ کے ذریعے۔" شمس تبریز نے جواب دیا، "لیکن میں آپ کے درس اور خطبوں کی بات نہیں کر رہا۔ میں شاعری کی بات کر رہا ہوں۔"

"شاعری؟" میری آواز چیخ گئی۔ "میں شاعری نہیں لکھتا۔ میں تو ایک عالم ہوں۔"

اس بات پر شمس تبریز ہولے سے مسکرا دیے۔ "میرے دوست، آپ ان بہترین شعراء میں سے ایک ہوں گے جنہیں دنیا کبھی جانے گی۔"

میں اس بات پر احتجاج کرنے کو تھا، لیکن شمس تبریز کی نگاہوں کے عزم بھرے تاثر نے مجھے روک دیا۔ اس کے ساتھ، میں نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ "بہر حال جو بھی ضروری ہوا، ہم ساتھ مل کر ہی کریں گے۔ ہم اس راہ پر ساتھ چلیں گے۔"

شمس تبریز نے غائب دماغی سے سر ہلایا اور اُفق پر مدھم پڑتے رنگوں پر نگاہیں جمائے ایک عجیب سی خاموشی میں گم ہو گئے۔ جب وہ دوبارہ بولے تو انہوں نے وہ منحوس الفاظ ادا کیے، جو میری روح کو دہشت زدہ کرتے ہوئے مجھے کبھی فراموش نہیں ہوئے۔ "میری چاہے جتنی بھی آرزو ہو کہ میں آپ کا ساتھ دوں، مجھے خدشہ ہے کہ یہ رستہ آپ کو تنہا ہی چلنا ہوگا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اپنے ہونٹ بھینچ کر شمس تبریز نے اپنی نگاہیں جھکالیں۔ "یہ میرے بس سے باہر ہے۔"

اچانک ہوا چلنے لگی اور موسم خنک ہو گیا، یوں جیسے ہمیں متنبہ کر رہا ہو کہ موسم خزاں رخصت ہونے کو تھا۔ بے بادل نیلے آسمان سے دن کی روشنی میں بارش برسنے لگی، گرم بوندیں، اتنی ہلکی اور نازک جیسے کسی تتلی کا لمس۔ اور وہ پہلی بار تھی کہ شمس تبریز کے مجھے چھوڑ جانے کے خیال سے میرے سینے میں تیز درد اٹھا۔

سلطان ولد

قونیہ، دسمبر 1245ء

بعض لوگوں کے نزدیک یہ فضول گوئی گویا دل لگی ہی ہوگی لیکن مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ لوگ اُن باتوں تحقیر اور تنفر سے کیسے دیکھ سکتے ہیں جن کا انہیں علم ہی نہیں؟ یہ دہشت خیز نہیں تو عجیب ضرور ہے کہ لوگ سچائی سے کس قدر دور ہیں! وہ میرے والد اور شمس تبریز کے تعلق کی گہرائی کو سمجھتے ہی نہیں۔ ظاہر یہی ہے کہ اُنہوں نے قرآن نہیں پڑھا کیوں کہ اگر وہ پڑھتے تو جان لیتے کہ ایسی روحانی رفاقت کے قصے قرآن پاک میں بھی مذکور ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا احوال۔

یہ قصہ سورۃ الکہف میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ ایک مثالی شخصیت تھے، اتنے عظیم کہ وہ ایک روز پیغمبر کے رتبے پر فائز ہوئے، وہ ایک عظیم سالار اور قانون ساز بھی تھے۔ لیکن ایک وقت آیا کہ اُنہیں اپنی تیسری آنکھ کھولنے کے لیے روحانی رفیق کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور وہ رفیق حضرت خضرؑ تھے، ستائے ہوئے مصیبت زدوں اور غم زدوں کے چارہ گر۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا، ''میں دائمی مسافر ہوں۔ خدا نے مجھے دنیا گھومنے اور جو ضروری ہو، کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ آپ میرے شریک سفر بننا چاہتے ہیں، لیکن اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو آپ کو میرے کسی اقدام پر کوئی سوال نہیں کرنا ہوگا۔ کیا آپ سوال کیے بغیر میرے رفیق سفر بن سکتے ہیں؟ کیا آپ مجھ پر کامل بھروسا کر سکتے ہیں؟''

''جی ہاں، میں ایسا کر سکتا ہوں۔'' حضرت موسیٰؑ نے اُنہیں یقین دلایا۔ ''مجھے اپنے ساتھ لے چلیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔''

یوں وہ رستے میں آنے والی آبادیوں کا دورہ کرتے سفر پر نکل پڑے۔ لیکن جب اُنہوں نے حضرت خضرؑ کو بے معنی کام کرتے دیکھا، جیسے نوعمر لڑکے کا قتل یا کشتی میں سوراخ کرنا تو حضرت موسیٰؑ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکے۔ ''آپ نے یہ ناگوار کام کیوں کیے؟'' اُنہوں نے بے تابی سے پوچھ لیا۔

''آپ کا وعدہ کیا ہوا؟'' خضرؑ نے پوچھا، ''کیا میں نے بتایا نہیں تھا کہ آپ مجھ سے کوئی سوال نہیں کر سکتے؟''

ہر مرتبہ حضرت موسیٰؑ نے معذرت کی اور دوبارہ سوال نہ پوچھنے کا وعدہ کیا لیکن ہر بار ہی وعدہ خلافی کی۔ آخر میں، خضرؑ نے انہیں اپنے ہر ایک کام کی حکمت بتائی۔ رفتہ رفتہ مگر مکمل یقین کے ساتھ، موسیٰؑ کو یہ بات سمجھ آگئی کہ کچھ کام دیکھنے میں برے یا غلط نظر آ سکتے ہیں، لیکن وہ در پردہ رحمت ہوتے ہیں جب کہ کچھ چیزیں دکھائی تو خوب دیتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ نقصان دہ ہوتی ہیں۔ خضرؑ کے ساتھ ان کی مختصر رفاقت اُن کی زندگی کا سب سے چشم کشا تجربہ ثابت ہوئی۔

اس مثال ہی کی طرح، اس دنیا میں کچھ دوستیاں ایسی ہوتی ہیں جو عام لوگوں نا قابل فہم لگتی ہیں لیکن درحقیقت وہ حکمت و معرفت کی حامل ہوتی ہیں۔ شمس تبریز کی اپنے والد کی زندگی میں موجودگی کو بھی میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ دوسرے لوگ اس دوستی کو اس نظر سے نہیں دیکھتے اور یہی بات مجھے فکر مند کرتی ہے۔ بدقسمتی سے، شمس تبریز بھی اس بات میں کوئی آسانی پیدا نہیں کرتے کہ لوگ انہیں پسند کرنے لگیں۔ وہ مدرسے کے داخلی دروازے پر خجالت آمیز سرکش انداز میں بیٹھ جاتے ہیں، وہ ہر اُس شخص کو روک کر پوچھ کچھ کرتے ہیں جو اندر جا کر میرے والد سے کوئی بات کرنا چاہے۔

''تمہیں مولانا سے کس لیے ملنا ہے؟'' وہ پوچھتے ہیں، ''تم نذرانہ کیا لائے ہو؟''

لوگوں کو سمجھ نہیں آتی کہ جواب کیا دیں، وہ ہکلاتے اور ہچکچاتے ہوئے معذرت کرنے لگتے ہیں۔ اور شمس تبریز اُنہیں واپس بھیج دیتے ہیں۔

ان میں سے کچھ لوگ چند روز بعد نذرانوں کے ساتھ واپس آتے ہیں، خشک میوے، نقرئی درہم، ریشمی قالین یا نوزائیدہ میمنے اٹھائے ہوئے۔ لیکن یہ اشیا دیکھ کر شمس تبریز مزید برہم ہو جاتے ہیں۔ اُس کی سیاہ آنکھیں دہکنے لگتی ہیں، اُس کا چہرہ برہمی سے چمکنے لگتا ہے اور وہ انہیں بھگا دیتے ہیں۔

ایک دن ایک آدمی شمس تبریز پر غصے سے برس پڑا، ''تمہیں مولانا کا دروازہ روک کر بیٹھنے کا حق کس نے دیا ہے؟ تم ہر کسی سے پوچھتے رہتے ہو کہ نذرانے میں کیا لائے ہو! اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ تم اُن کے لیے کیا لائے ہو؟''

''میں اپنا آپ، اپنی ذات لایا ہوں۔'' شمس تبریز نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ بہ مشکل سنائی دی۔ ''میں نے اپنا آپ اُن پر قربان کر دیا۔''

وہ آدمی زیر لب بڑبڑاتا، غصے سے زیادہ الجھن کا شکار دکھائی دیتے ہوئے پلٹ گیا۔

☼

اُسی روز میں نے شمس تبریز سے پوچھا کہ کیا انہیں اس پر پریشانی نہیں ہوتی کہ انہیں غلط سمجھا

جاتا اور ان کی ناقدری کی جاتی ہے۔ اپنے خدشات سے اپنا اختیار کھو کر میں نے اشارتاً بتایا کہ گزشتہ دنوں میں اُنہوں نے اپنے بہت دشمن بنا لیے تھے۔

شمس تبریز نے مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھا، جیسے اُنہیں کچھ اندازہ نہ ہو کہ میں کس بارے میں بات کر رہا تھا۔ ''لیکن میرے کوئی دشمن نہیں۔'' اُنہوں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا، ''محبانِ الٰہی کے حریف تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کے کوئی دشمن نہیں ہو سکتے۔''

''جی ہاں، مگر آپ لوگوں کے ساتھ جھگڑتے ہیں۔'' میں نے اعتراض کیا۔

شمس تبریز جلال میں آ گئے۔ ''میں اُن کے ساتھ نہیں بلکہ اُن کی انا کے ساتھ جھگڑتا ہوں۔ یہ بالکل مختلف بات ہے۔''

پھر وہ نرمی سے کہنے لگے، ''یہ بھی چالیس اصولوں میں سے ایک ہے: یہ دنیا ایک برف پوش پہاڑ کی مانند ہے جس سے تمہاری آواز ٹکرا کر بازگشت کی صورت پلٹتی ہے۔ تم جو کچھ بھی کرو گے، اچھا یا بُرا، وہ کسی طور تم تک واپس پلٹ آئے گا۔ اس لیے، اگر کوئی تمہارے بارے میں بُرا سوچتا ہے تو اُس کے لیے اسی طرح بُرے کلمات ادا کرنے سے معاملہ صرف بگڑے گا۔ تم منفی توانائی کے منحوس دائرے میں مقید ہو جاؤ گے۔ اس کی بجائے اُس شخص کے بارے میں چالیس دن رات اچھا بولو اور سوچو۔ چالیس روز بعد سب کچھ بدلا ہوا محسوس ہو گا کیوں کہ خود تم اندر سے بدل چکے ہو گے۔''

''مگر لوگ آپ کے بارے میں ہر طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ دو مرد اگر ایک دوسرے کے اس حد تک مشتاق ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ اُن کے درمیان کوئی ناگفتہ بہ تعلق ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میری آواز نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔

یہ سن کر شمس تبریز نے اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھا اور اپنے مخصوص پُرسکون انداز میں مسکرا دیئے۔ پھر انہوں نے مجھے ایک قصہ سنایا۔

دو آدمی ایک سے دوسرے شہر کا سفر کر رہے تھے۔ وہ ایک ندی کنارے پہنچے جس میں بارشوں کے سبب طغیانی آئی ہوئی تھی۔ جب وہ اسے پار کرنے کو تھے، انہیں وہاں ایک جوان اور خوب صورت عورت مدد کی منتظر کھڑی دکھائی دی۔ اُن میں سے ایک فوراً اُس کی مدد کو آگے بڑھا۔ اس نے عورت کو اپنی بانہوں میں اٹھایا اور اُسے ندی پار کروا دی۔ اُسے دوسرے کنارے اُتار کر انہوں نے الوداع کہا اور اپنی راہ چل دیئے۔

باقی سفر کے دوران، دوسرا مسافر غیر معمولی طور پر خاموش اور خفا تھا، اس نے اپنے دوست کے سوالوں کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ کئی گھنٹوں کی ناراضی کے بعد، جب وہ مزید خاموش نہ رہ سکا تو کہنے لگا، ''تم نے اُس عورت کو ہاتھ کیوں لگایا؟ وہ تمہیں ورغلا سکتی تھی! نامحرم مرد اور عورت اس طرح ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے۔''

پہلے مسافر نے بڑے سکون سے جواب دیا، ''میرے دوست، میں اُس عورت کو ندی پار کروائی اور اُسے وہیں چھوڑ آیا۔ وہ تم ہی ہو جو اُسے اب تک ساتھ اٹھائے ہوئے ہو۔''

''کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' شمس تبریز نے کہا، ''وہ خود اپنے خوف و خدشے اور تعصب اپنے شانوں پر اٹھائے پھرتے ہیں اور اُس بوجھ تلے کچلے جاتے ہیں۔ اگر تم کسی ایسے شخص کی بات سنو جو تمہارے والد اور میرے تعلق کی گہرائی کو سمجھ نہیں سکتا، تو اُسے کہنا کہ وہ اپنا دماغ دھو کر صاف کر لے!''

ایلا

نارتھمپٹن، 15 جون 2008ء

میری محبوب ایلا،

تم نے پوچھا کہ میں صوفی کیسے بنا۔ ایسا راتوں رات نہیں ہوا۔ میں سکاٹ لینڈ کے ایک پہاڑی ساحلی گاؤں Kinlochbervie میں کریگ رچرڈسن کی حیثیت سے پیدا ہوا تھا۔ میں جب بھی ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ماہی گیر کشتیاں، ان کے مچھلیوں اور سبز سانپوں کی طرح لشکتی سمندری جڑی بوٹیوں سے بھرے جال، ساحل پر ریت کریدکر کیڑے مکوڑے کھاتی ٹٹیریاں، غیر متوقع ترین جگہوں پر اگتی سدابہار جڑی بوٹیاں اور پس منظر میں سمندر کی تیز اور نمکین مہک یاد آتے ہیں۔ وہ مہک اور اس کے ساتھ وہ پہاڑ اور کھاڑی، اور جنگ کے بعد یورپ پر طاری بے کیف سکون، وہ پس منظر بناتے ہیں جس میں میرا بچپن گزرا۔

1960ء کی دہائی کا زمانہ جب دنیا طلبا مظاہروں، ہائی جیکنگ اور انقلابات کا منظر نامہ پیش کررہی تھی، میں تب ان سب چیزوں سے الگ تھلگ اپنے خاموش سرسبز گوشے میں تھا۔ میرے والد کی پرانی کتابوں کی دکان تھی اور میری ماں بھیڑیں پالتی تھیں جن سے اعلیٰ درجے کی اون بنتی تھی۔ اپنے بچپن میں میں نے کسی چرواہے کی سی تنہائی اور کسی کتب فروش کے مشاہدۂ نفس کا تجربہ کیا۔ کئی روز میں کسی پرانے درخت پر چڑھ کر قدرتی منظر دیکھتا رہتا، پُریقین کہ میں اپنی ساری زندگی وہیں گزاروں گا۔ اکثر اوقات میرا دل کسی مہم جوئی کی خواہش میں مچلتا، لیکن مجھے اپنا گاؤں پسند تھا اور میں اپنی زندگی کی لگی بندھی ڈگر پر مطمئن تھا۔ مجھے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ خدا نے میرے لیے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا؟

بیس برس کا ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی، میں نے دو چیزیں دریافت کیں جن سے میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل گئی۔ پہلی چیز تھی، ایک پروفیشنل کیمرا۔ میں نے فوٹوگرافی کی کلاس میں نام درج کروایا تھا، نہ جانتے ہوئے کہ میں جسے صرف ایک عام سا مشغلہ سمجھ رہا تھا، وہ میرا عمر بھر کا جنون بن جائے

گا۔ دوسری چیز تھی محبت... ایک ڈچ لڑکی جو اپنے دوستوں کے ہمراہ یورپ کی سیر کی خاطر آئی تھی۔ اس کا نام تھا مارگٹ۔

وہ عمر میں مجھ سے آٹھ سال بڑی تھی، خوب صورت، خوش قامت اور انتہائی خود رائے۔ مارگٹ خود کو بوہیمین، مثالیت پسند، انقلابی، دوجنسی، لیفٹسٹ، انفرادیت کی حامی انارکسٹ، کثیر ثقافتی، حقوقِ انسانی کی علمبردار، کاؤنٹر کلچرا یکٹوسٹ، ایکو فیمنسٹ کہتی تھی... ایسے نام کہ اگر کوئی مجھ سے ان کا مطلب پوچھے تو میں بتا نہ پاؤں۔ لیکن میں نے اس سے متعلق شروع میں ہی ایک بات مشاہدہ کر لی کہ وہ ایک پنڈولم سی عورت تھی۔ چند لمحے میں انتہائی خوشی سے انتہائی مایوسی اور ناامیدی کو پہنچنے کی اہل۔ مارگٹ پر ناقابل پیش گوئی ہر جگہ لکھا تھا۔ وہ اس پر ہمیشہ مشتعل ہوتی جسے وہ "بورژوا طبقے کے طرزِ زندگی کی منافقت" کہتی تھی، وہ زندگی میں ہر بارے میں اعتراض اور سوال اٹھاتی، سماج کے خلاف جنگیں لڑتی۔ میرے لیے یہ بات آج بھی معمہ ہے کہ میں اس سے بھاگا کیوں نہیں۔ اس سے دور بھاگنے کی بجائے میں نے خود کو اس کی متحرک شخصیت کے گرداب میں دھنسنے دیا۔ میں اس کی محبت میں سر کے بل ڈوب چکا تھا۔

وہ ایک ناممکن امتزاج تھی، انقلابی نظریات اور تخلیقی پن سے بھری، سرکش ہمت و حوصلے کی مالک اور پھر بھی کسی بلوریں پھول کی طرح نازک۔ میں نے خود سے عہد کیا کہ اس کے ساتھ رہ کر نہ صرف بیرونی دنیا سے بلکہ خود اس سے بھی اس کی حفاظت کروں گا۔ کیا اس نے مجھ سے اتنی ہی محبت کی تھی جتنی میں اس سے کرتا تھا؟ میرا نہیں خیال۔ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، چاہے اپنے خود پرستانہ اور خود شکستہ انداز میں ہی سہی۔

یوں بیس سال کی عمر میں مَیں ایمسٹرڈیم پہنچا۔ ہم نے وہاں شادی کر لی۔ مارگٹ نے اپنا وقت اُن پناہ گزینوں کی مدد کے لیے وقف کر دیا تھا جو سیاسی یا انسانی اسباب کے باعث یورپ آئے تھے۔ تارکینِ وطن کے لیے مخصوص ایک تنظیم کے لیے کام کرتے ہوئے مارگٹ نے دنیا کے دشوار ترین علاقوں کے مصیبت زدہ لوگوں کو ہالینڈ میں قدم جمانے میں مدد دی۔ وہ اُن کے لیے محافظ فرشتہ تھی۔ انڈونیشیا، صومالیہ، ارجنٹائن اور فلسطین کے خاندانوں نے اپنی بچیوں کو اس کا نام دیا۔

جہاں تک میری بات ہے تو کارپوریٹ دنیا میں کامیابی کے زینے چڑھنے کی کوشش میں مجھے بڑے مقاصد میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بزنس سکول سے گریجویشن کے بعد، میں نے ایک بین الاقوامی فرم کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ حقیقت کہ مارگٹ کو میرے سٹیٹس یا تنخواہ سے کوئی غرض نہ تھی، اس پر مجھے مزید کامیابیاں حاصل کرنے کی تمنا ہوئی۔ طاقت و اختیار کا حریص ہو کر میں نے ہر اہم کام اپنے ہاتھوں میں لینا چاہا۔

میں نے ہماری زندگی کی ساری منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ دو سال بعد ہمارے بچے ہوں گے۔ دو ننھی لڑکیاں میرے خیالی مثالی خاندان کو مکمل کرتیں۔ مجھے اس مستقبل کا بھروسا تھا جو ہمارا منتظر تھا۔ ہم دنیا

کی محفوظ ترین جگہ پر بستے تھے، ان مصیبت زدہ ممالک میں سے کسی ایک میں نہیں جو پانی کے کسی ٹوٹے پائپ کی طرح یورپ میں تارکین وطن کی کھیپ بھیجتے رہتے تھے۔ ہم جوان اور صحت مند تھے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ کچھ بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ میں اب 54 برس کا ہوں اور مارگٹ اب دنیا میں نہیں۔

وہ صحت مند تھی۔ ایک پکی سبزی خور تھی، اُس زمانے میں جب لوگ ابھی اس لفظ کے معنی سے بھی نا آشنا تھے۔ وہ صرف صحت بخش کھانا کھاتی، باقاعدگی سے ورزش کرتی اور منشیات سے دُور رہتی تھی۔ اس کے فرشتوں جیسے چہرے پر صحت کی چمک تھی، ان کا بدن ہمیشہ سے دبلا پتلا اور چست تھا۔ وہ اپنا اتنا خیال رکھتی تھی کہ عمروں کے فرق کے باوجود، میں دیکھنے میں اُس سے بڑا ہی لگتا تھا۔

اس کی موت بہت غیر متوقع اور سادہ تھی۔ ایک شب اُس مشہور روسی صحافی سے ملنے کے بعد، جس نے سیاسی پناہ کی درخواست دے رکھی تھی، واپسی پر اُس کی گاڑی ہائی وے پر خراب ہو گئی۔ وہ ہمیشہ قوانین کی پابند رہی تھی، لیکن اس وقت اس نے اپنے مزاج کے برخلاف ایک کام کیا۔ فلیش لائٹس جلا کر مدد کا انتظار کرنے کی بجائے وہ اپنی گاڑی سے باہر نکلی اور پیدل ہی اگلے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے سیاہ ٹراؤزر کے ساتھ گہرے بھورے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا، اُس کے پاس کوئی فلیش لائٹ یا ایسا کچھ نہ تھا جس سے وہ نمایاں دکھائی دے جاتی۔ ایک گاڑی نے اُسے ٹکر مار دی... یوگوسلاویہ سے آتے ایک ٹرک نے۔ ڈرائیور کا کہنا تھا کہ وہ اُسے بالکل دکھائی نہیں دی تھی۔ یوں مارگٹ رات کے اندھیرے میں مکمل طور پر تحلیل ہو گئی۔

میں کبھی نوجوان لڑکا تھا۔ محبت نے ایک بھرپور زندگی مجھ پر روشن کی۔ اس عورت کو کھو دینے کے بعد، جس سے مجھے محبت تھی، میری کایا پلٹ ہی ہو گئی۔ میں لڑکا رہا نہ کوئی بالغ مرد، میں کسی پھندے میں پھنسا جانور بن گیا۔ اپنی زندگی کے اس مرحلے پر میرا سامنا لفظ "صوفی" کے حرف "ص" سے ہوا۔

امید ہے کہ میں نے اپنے اتنے طویل خط سے تمہیں اکتا نہیں دیا ہوگا۔

محبت کے ساتھ

عزیز

طوائف، گُلِ صحرا

قونیہ، جنوری 1246ء

بدنامی کے بعد جو مسجد والے رسوا کن واقعے کے باعث ہوئی، قحبہ خانے کی نائکہ نے مجھ پر پابندی لگادی اور مجھے اب کہیں بھی آنے جانے نہیں دیتی۔ مجھے ہمیشہ کے لیے محبوس کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے اس پر کوئی پریشانی نہیں۔ سچ تو ہے کہ آج کل میں کچھ محسوس ہی نہیں کر رہی۔

ہر صبح جو چہرہ مجھے آئینے میں ملتا ہے، وہ پہلے سے زیادہ زرد نظر آتا ہے۔ میں اپنے بال بناتی ہوں اور نہ ہی رخسار سرخ کرنے کے لیے ان پر چٹکیاں کاٹتی ہوں۔ دوسری لڑکیاں میرے برے حلیے پر مسلسل شکایت کناں ہوتی ہیں کہ یوں گاہک بھاگ جاتے ہیں۔ شاید یہ سچ ہی ہو۔ لیکن مجھے بہت حیرت ہوئی جب اگلے روز مجھے بتایا گیا کہ ایک مخصوص گاہک صرف مجھ ہی سے ملنا چاہتا تھا۔

میں دہشت زدہ ہوگئی کہ وہ بھرس تھا۔

جیسے ہی ہم کمرے میں تنہا ہوئے، میں نے پوچھا، ''تم جیسا سپاہی یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''خیر، میرا قحبہ خانے پر آنا کسی طوائف کے مسجد جانے سے زیادہ برا نہیں۔'' اُس نے کہا۔ اُس کا لہجہ طنز و تحقیر سے بوجھل تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم اُس روز بہ خوشی مجھے جان سے مار ڈالتے۔'' میں نے کہا، ''میں اپنی زندگی کے لیے شمس تبریز کی مقروض ہوں۔''

''یہ نفرت انگیز نام مت لو۔ وہ شخص کافر ہے!''

''نہیں، ایسا نہیں ہے!'' نہیں معلوم مجھے کیا ہوا لیکن میں نے خود کو یہ کہتے سنا، ''اُس روز کے بعد شمس تبریز کئی بار مجھ سے ملنے آئے ہیں۔''

''ہا! قحبہ خانے میں درویش!'' بھرس نے طنزیہ کہا، ''مجھے یہ سن کر حیرت کیوں نہیں ہوئی؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا، ''بالکل بھی ایسی بات نہیں۔''

میں نے یہ پہلے کسی کو نہ بتایا تھا اور معلوم نہیں اب کیوں بھرس کو یہ بتا رہی تھی، لیکن شمس تبریز پچھلے کئی مہینوں سے ہر ہفتے مجھ سے ملنے آتے تھے۔ میری فہم و ادراک سے باہر تھا کہ وہ کسی کی خاص طور پر نائکہ کی نگاہوں میں آئے بغیر کیسے اندر داخل ہو جاتے تھے۔ دوسرا کوئی شخص یہ سمجھتا کہ یہ کالے جادو کی کارستانی تھی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ ایسا نہ تھا۔ شمس تبریز نیک آدمی تھے۔ صاحب ایمان۔ اور وہ خاص صلاحیتوں سے نوازے گئے تھے۔ بچپن میں میری ماں کے علاوہ، شمس تبریز ہی ایسے دوسرے شخص تھے جنہوں نے مجھ سے بے لوث دردمندی سے سلوک کیا۔ اُنہوں نے مجھے کسی بھی حال میں مایوس نہ ہونا سکھایا۔ جب بھی میں نے اُنہیں بتایا کہ مجھ جیسی عورت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنا ماضی بھلا دے، تو وہ ہمیشہ اپنا ایک اصول یاد دلاتے: ''ماضی ایک تعبیر ہے۔ مستقبل ایک فریبِ خیال۔ دنیا وقت سے کسی ایسے خطِ مستقیم کی صورت نہیں گزرتی جو ماضی سے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اس کی بجائے وقت ہمارے اندر سے اور ہم سے لامتناہی مرغولوں کی صورت گزرتا ہے۔

ابدیت سے مراد لامتناہی وقت نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے وقت سے ماورا ہونا۔

اگر تم ابدی نور کا تجربہ کرنا چاہتے ہو تو ذہن سے ماضی اور مستقبل نکال دو اور فقط لمحۂ موجود میں باقی رہو۔''

شمس تبریز نے ہمیشہ مجھے یہی بتایا، ''تم جانتی ہو، لمحۂ موجود ہی سب کچھ ہے اور یہی سب کچھ رہے گا۔ جب یہ سچائی تمہاری سمجھ میں آ جائے گی، تو پھر تمہیں کسی شے کا خوف نہیں رہے گا۔ تبھی تم اس قحبہ خانے کو چھوڑ کر نکل سکتی ہو۔''

☼

بھرس غور سے میرا چہرہ تک رہا تھا۔ جب وہ مجھے دیکھتا تو اس کی دائیں آنکھ دوسری جانب دیکھنے لگتی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کمرے میں ہمارے علاوہ کوئی تیسرا شخص بھی موجود تھا، کوئی ایسا جسے میں دیکھنے سے قاصر تھی۔ اُس نے مجھے دہشت زدہ کر دیا۔

میں سمجھ گئی کہ بہتر ہوتا کہ میں شمس تبریز کے بارے میں بات نہ کرتی۔ میں نے اُسے شراب کی صراحی پیش کی جسے وہ فوراً ہی چڑھا گیا۔

''تو تمہاری خاصیت کیا ہے؟'' بھرس نے دوسرا جام حلق سے اتارتے پوچھا، ''کیا تم سب لڑکیوں میں کوئی خاص صلاحیت نہیں ہوتی؟ کیا تم رقص کر سکتی ہو؟''

میں نے اُسے بتایا کہ مجھ میں ایسی کوئی قابلیت نہیں اور ماضی میں جو بھی مجھے حاصل تھا، اب نہیں رہا، کیوں کہ میں ایک نامعلوم بیماری میں مبتلا ہوں۔ نائکہ مجھے جان سے مار ڈالتی، اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ میں کسی گاہک سے ایسی باتیں کہہ رہی تھی، لیکن میں نے پرواہ نہ کی۔ سچ یہ تھا کہ دل ہی دل میں میں چاہ رہی تھی کہ بھرس کسی اور لڑکی کے ساتھ رات گزارے۔

لیکن مجھے مایوسی ہوئی جب ہیرس نے اپنے کندھے اچکا کر کہا کہ اُسے پرواہ نہیں۔ پھر اُس نے ایک تھیلی نکالی، اُس سے سرخی مائل بھورا سفوف اپنی ہتھیلی پر انڈیل کر اپنے منہ میں ڈالا اور آہستگی سے چبانے لگا۔ ''تم لینا چاہو گی؟'' اُس نے پوچھا۔

میں نے اپنا سر ہلا کر انکار کیا۔ وہ کیا تھا، میں جانتی تھی۔

''تم نہیں جانتی، تم کس چیز کھو رہی ہو۔'' بستر پر ٹیک لگاتے وہ حشیش کے خمار میں اپنے ہوش کھوتے ہوئے ہنسا۔

اُس شام شراب اور حشیش کے خمار میں ہیرس باتیں کرتا رہا کہ اس نے میدانِ جنگوں میں کیا کچھ دیکھا تھا۔ اگرچہ چنگیز خان مر چکا تھا اور اُس کی لاش تک گل سڑ چکی تھیں، اُس کا بھوت منگول فوج کے ساتھ ہی رہتا تھا، ہیرس کا یہ کہنا تھا۔ بھوت کے اکسانے پر، منگول فوجی کارواں پر حملہ کرتے، دیہات میں لوٹ مار کرتے اور مردوں اور عورتوں کا یکساں قتل عام کرتے تھے۔ اُس نے مجھے خاموشی کی اُس چادر کے بارے میں بتایا جو سرما کی خنک شب میں پہلے لحاف جیسی نرم و سکون بخش تھی، وہ خاموشی جو میدانِ جنگ میں سینکڑوں لوگوں کے قتل اور زخمی ہونے کے بعد اور جب درجنوں لوگ اپنی آخری سانسیں لے رہے ہوتے تو پھیلتی چلی جاتی تھی۔

''بڑے پیمانے پر تباہی کے بعد یہ خاموشی اس روئے زمین پر سکون بخش ترین آواز ہے۔'' ہیرس نے اپنی نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

''کتنی افسوس ناک بات ہے۔'' میں بڑبڑائی۔

اچانک ہی وہ لفظوں سے خالی ہو گیا۔ کہنے کو مزید کچھ نہ رہا۔ اُس نے میرا بازو تھام کر مجھے بستر پر گرا دیا اور میرا پیرہن کھینچ کر اتارنے لگا۔ اُس کی آنکھیں لہو رنگ تھیں اور آواز بھرا رہی تھی، اُس سے حشیش، پسینے اور ہوس کی ملی جلی ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔ میں نے پرے ہونا چاہا مگر اس کے دونوں ہاتھ میرے سینے پر یوں سختی سے جمے تھے کہ میرے لیے ہلنا تک ناممکن تھا۔ میری تکلیف کی پرواہ کیے بغیر اس نے بے رحمی سے مجھ سے قربت رکھی۔ دھاگوں سے بندھے کسی پُتلے کی طرح جس کو کوئی اَن دیکھے ہاتھ ہلا رہے ہوں اور جس کا رکنا ممکن نہ ہو، وہ مشغول رہا۔ وہ پھر بھی یوں غیر مطمئن تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرا پیچھا نہ چھوڑے گا لیکن پھر اچانک وہ رک گیا۔ اس نے میرے چہرے کو یوں خالص نفرت سے دیکھا، جیسے وہ بدن جو ابھی لحظہ بھر پہلے اُس کے اتنے قریب تھا، اب اُسے اسی بدن سے کراہت آ رہی تھی۔

''اپنا لباس پہن لو۔'' اُس نے پرے ہٹتے ہوئے حکم دیا۔

اپنا پیرہن پہنتے میں نے اسے انکھیوں سے مزید حشیش منہ میں ڈالتے دیکھا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آج کے بعد تم صرف میری داشتہ رہو۔'' اس نے کہا۔

گاہکوں کا ایسے مطالبے کرنا عام بات تھی۔ ایسی نازک صورتِ حال سے نمٹنا میں جانتی تھی،

گاہکوں کو جھوٹا تاثر دیتا کہ میں شوق سے صرف انہی کی داشتہ بن کر اُن کی خدمت کروں گی، لیکن اس کی خاطر انہیں رقم خرچ کر کے نائکہ کو خوش کرنا ہوگا۔ لیکن آج ایسی اداکاری کا میرا جی نہ چاہا۔

''میں تمہاری داشتہ نہیں بن سکتی۔'' میں نے کہا، ''میں بہت جلد یہاں سے بھاگنے والی ہوں۔''

ھورس نے یوں قہقہہ لگایا جیسے یہ مضحکہ خیز ترین بات تھی جو اس نے کبھی سنی ہو۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتی۔'' اُس نے یقین سے کہا۔

میں جانتی تھی مجھے اُس سے تکرار نہیں کرنی چاہیے، لیکن میں خود پر قابو نہ رکھ پائی۔ ''تم اور مجھ میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ہم دونوں نے ماضی میں ایسا کچھ کیا ہے جس پر ہمیں گہرا پچھتاوا ہے۔ لیکن تمہیں تمہارے چچا کے عہدے کے سبب ضابطہ سپاہی کی ملازمت مل گئی۔ میرا ایسا کوئی چچا نہیں تھا جو میری پشت پناہی کرتا۔''

ھورس کا چہرہ جیسے لکڑی کا ہوگیا اور اُس کی آنکھیں جواب تک سرد اور اجنبی تھیں، غیظ و غضب سے پھیل گئیں۔ میری جانب جھپٹ کر اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔ ''میں تمہارے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آرہا تھا، ہے ناں؟'' وہ غرایا، ''تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟''

میں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا، لیکن درد کے ایک تیز گھاؤ نے مجھے چپ کروا دیا۔ ھورس نے میرے چہرے پر گھونسا دے مارا اور مجھے دیوار سے لگا دیا۔

یہ کوئی پہلی مرتبہ نہیں تھی۔ مجھے پہلے بھی گاہکوں نے پیٹا تھا، لیکن اس قدر بے دردی سے کبھی نہیں۔

☼

میں فرش پر گر گئی اور ھورس گالیاں دیتے ہوئے میری پسلیوں اور ٹانگوں پر ضربیں لگانے لگا۔ تبھی تھا کہ مجھے وہ عجیب و غریب ترین تجربہ ہوا۔ جب میں تکلیف سے دہری ہوئی جا رہی تھی اور میرا جسم ہر ضرب کے ساتھ کچلا جا رہا تھا، میری روح... یا کچھ جو روح جیسا محسوس ہوا... خود کو جیسے کسی پتنگ میں ڈھال کر، ہلکی پھلکی اور آزاد، میرے جسم سے الگ ہوگئی۔

میں خلا میں تیر رہی تھی۔ یوں جیسے کسی پُرسکون خلا میں جہاں مزاحمت کو کچھ تھا نہ ہی جانے کو کوئی جگہ تھی، میں بس معلق ہوگئی۔ میں گندم کے تازہ فصل کٹے کھیتوں سے گزری، جہاں ہوا گاؤں کی لڑکیوں کے سرپوش لہرا رہی تھی اور رات کو جگنو خواب ناک روشنی کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ وہ گرنے جیسا محسوس ہوا، مگر یوں جیسے میں اُوپر بے انت آسمان کی طرف گر رہی تھی۔

کیا میں مر رہی تھی؟ اگر یہ موت اس جیسی تھی تو بالکل بھی دہشت انگیز نہ تھی۔ میری فکریں تحلیل ہوگئیں۔ میں ایک بالکل ہلکی پھلکی اور خالص جگہ کی طرف رواں تھی، ایک طلسمی کرہ جہاں کوئی شے مجھے

واپس نیچے نہیں کھینچ سکتی تھی۔ اور اچانک مجھے ادراک ہوا کہ میں اپنے خوف کو جی رہی تھی، اور حیرت یہ کہ وہ بالکل بھی خوف زدہ کرنے والا نہ تھا۔ کیا مجھے یہ خوف نہ تھا کہ قحبہ خانے کو چھوڑنے پر مجھے تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی؟ اگر میں موت سے ہراساں نہ ہونے میں کامیاب رہی تھی تو میں چوہوں کے اس بل کو بھی چھوڑ سکتی تھی، مجھے اپنے پھیلتے ہوئے دل کے ساتھ ادراک ہوا۔

شمس تبریز سچ کہتے تھے۔ واحد ناپاکی صرف اندر کی ناپاکی ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے دوسرے وجود کا تصور کیا، قدیم، پاک اور نادم اور بہت کم عمر، قحبہ خانے سے نکل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا وجود۔ نوجوانی اور اعتماد سے چمکتا، میرا چہرہ ایسا دکھائی دیتا اگر مجھے زندگی میں تحفظ اور محبت کا تجربہ ہوا ہوتا۔ وہ تصور اس قدر دلکش اور اتنا حقیقی تھا کہ آنکھوں میں بہ کر جاتے خون اور پسلیوں سے اٹھتی ٹیسوں کے باوجود، میں اپنی مسکراہٹ کو روک نہ پائی۔

رکمیا

قونیہ، جنوری 1246ء

باوجود اس کے کہ میرا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا اور میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھی، میں نے شمس تبریز سے بات کرنے کا حوصلہ مجتمع کیا۔ میں اُن سے قرآن پاک کے گہرے مطالب سمجھنا چاہتی تھی، لیکن کئی ہفتوں سے مجھے موقع نہیں مِل پا رہا تھا۔ اگرچہ ہم ایک ہی چھت تلے رہ رہے تھے، لیکن ہمارا کبھی آمنا سامنا نہ ہوا۔ لیکن آج صبح جب میں صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی، شمس تبریز میرے سامنے نمودار ہوئے، وہ اکیلے تھے اور باتیں کرنا چاہ رہے تھے۔ اور اس بار میں نہ صرف اُن سے زیادہ دیر باتیں کر پائی بلکہ میں اُن سے نظریں ملانے میں بھی کامیاب رہی۔

''کیا احوال ہیں، پیاری رکمیا؟'' اُنہوں نے خوش مزاجی سے پوچھا۔

میں نے محسوس کیا کہ شمس تبریز کچھ بدحواس سے تھے، یوں جیسے ابھی نیند سے بیدار ہوئے ہوں، یا پھر کوئی الہامی کیفیت۔ میں جانتی تھی کہ اُنہیں کشف ہوتے تھے، آج کل پہلے سے زیادہ، اور یہ کہ اب تک میں اشارے سمجھنا سیکھ گئی تھی۔ جب بھی کشف ہوتا، اُن کا چہرہ زرد پڑ جاتا اور آنکھیں خواب ناک ہو جاتی تھیں۔

''ایک طوفان قریب آ رہا ہے۔'' وہ آنکھیں سکیڑ کر آسمان کو دیکھتے بڑبڑائے، جہاں تیرتے بادلوں کے ٹکڑے موسم کی پہلی برف باری کا اعلان کر رہے تھے۔

وہ مناسب وقت لگتا تھا کہ میں اپنا سوال پوچھ لیتی۔ ''یاد ہے جب آپ نے مجھے بتایا تھا کہ ہم سب قرآن کو اپنی اپنی بصیرت کے مطابق سمجھتے ہیں؟'' میں نے محتاط سی ہو کر کہا، ''میں تب سے آپ سے پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ چوتھا درجہ کیا ہے۔''

اب شمس تبریز میری جانب مڑے، اُن کی نگاہ میرے چہرے پر تھی۔ مجھے اُن کا یوں مجھے غور سے دیکھنا اچھا لگا۔ میں نے سوچا کہ وہ ایسے وقت میں وجیہہ ترین ہوتے تھے، ان کے بھنچے ہوئے لب اور

پیشانی پر سوچ کی ہلکی سی لکیریں۔

''چوتھا درجہ نا قابل بیان ہے۔'' اُنہوں نے کہا، ''ایک ایسا مرحلہ ہے جہاں زبان و الفاظ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ عشق کے نگر میں پہنچ کر الفاظ کی ضرورت نہیں رہتی۔''

''میری خواہش ہے کہ کسی روز میں وادیٔ عشق میں بھی قدم دھر سکوں۔'' میں کہہ اٹھی لیکن فوراً ہی مجھے خجالت ہوئی۔ ''میرا مطلب ہے، تاکہ میں قرآن کو گہری بصیرت کے ساتھ سمجھ سکوں۔''

شمس تبریز کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اگر تم میں یہ موجود ہے تو مجھے یقین ہے، تم ضرور ایسا کرو گی۔ تم چوتھے بہاؤ میں چھلانگ لگاؤ گی اور پھر تم خود ندی بن جاؤ گی۔''

میں اس ملے جلے احساس کو فراموش کر بیٹھی جسے صرف شمس ہی میرے اندر اکسانے کے اہل تھے۔ ان کے قریب میں خود کو کوئی بچہ محسوس کرتی جو زندگی کو نئے سرے سے جان رہا ہو اور ساتھ ہی ایک ایسی عورت بھی جو اپنی کوکھ میں ایک نئی زندگی کی پرورش کو تیار تھی۔

''آپ کا اس سے کیا مطلب ہے، اگر وہ مجھ میں ہے تو؟'' میں نے پوچھا، ''آپ کا مطلب ہے، تقدیر کی طرح؟''

''ہاں، یہ درست ہے۔'' شمس تبریز نے سر ہلایا۔

''مگر تقدیر سے کیا مراد ہے؟''

''میں تمہیں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ تقدیر کیا ہے۔ البتہ اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ تقدیر کیا نہیں ہے۔ درحقیقت اس سوال سے متعلق ایک اور اصول ہے: تقدیر سے مراد یہ نہیں کہ تمہاری زندگی پہلے سے طے شدہ امر ہے۔ اس لیے ہر بات کو مقدر پر چھوڑ کر کائنات کی موسیقی کی لے پر سرگرمی سے نہ جھومنا جہالت کی نشانی ہے۔

کائناتی موسیقی ہر طرف سرایت کیے ہوئے ہے اور یہ چالیس مختلف درجوں پر ترتیب دی جاتی ہے۔ تمہاری تقدیر وہ درجہ ہے جہاں تم اپنی دھن بجاتے ہو۔ تم اپنا ساز تو تبدیل نہ کر سکتے مگر تم اس ساز کو بجاتے کیسے ہو، یہ مکمل طور پر تمہارے ہاتھوں میں ہے۔''

میں نے ضرور اُنہیں کچھ چکرا کر دیکھا ہو گا کہ شمس تبریز کو وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُنہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہولے سے دبایا۔ سیاہ گہری چمکتی آنکھوں کے ساتھ وہ کہنے لگے، ''اجازت دو کہ میں ایک قصہ سنا سکوں۔''

اور یہ تھا جو انہوں نے مجھے سنایا:

ایک روز کسی نوجوان لڑکی نے کسی درویش سے پوچھا کہ مقدر کیا ہے۔ درویش نے کہا، ''میرے ساتھ آؤ۔ آؤ، اس دنیا کو ہم ایک ساتھ دیکھتے ہیں۔'' جلد ہی وہ ایک جلوس کے قریب سے گزرے۔ کسی قاتل کو پھانسی گھاٹ لے جایا جا رہا تھا۔ درویش نے پوچھا، ''اس آدمی کو پھانسی دی

جائے گی۔ لیکن کیا اس لیے کہ کسی نے اُسے رقم دی کہ وہ قتل کے لیے ہتھیار خریدے؟ یا پھر اس لیے کہ کسی نے اُسے جرم کرتے ہوئے روکا نہیں؟ یا پھر اس لیے کہ کسی نے اُسے بعد میں پکڑ لیا؟ اس معاملے میں علت و معلول کیا ہے؟''

میں نے اُن کا قصہ مختصر کرتے ہوئے ان کی بات کاٹی، ''اُس شخص کو پھانسی اس لیے دی جا رہی تھی کہ اس نے غلط کیا تھا۔ وہ اپنے کیے کی قیمت چکا رہا ہے۔ علت بھی موجود ہے اور معلول بھی۔ نیکی ہے اور گناہ بھی، اور اُن دونوں کے درمیان فرق بھی موجود ہے۔''

''آہ، پیاری کمیا۔'' شمس تبریز نے بہت دھیمی آواز میں یوں کہا جیسے یکا یک وہ تھک گئے ہوں۔ ''تمہیں امتیاز و تفریق پسند ہے کیوں کہ تمہارا خیال ہے اس سے زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ کیا ہو اگر چیزیں ہمیشہ اتنی واضح نہ ہوں؟''

''لیکن خدا چاہتا ہے کہ ہم واضح رہیں۔ دوسری صورت میں تو حلال اور حرام کا تصور ہی نہ رہے۔ کوئی جنت ہو نہ ہی دوزخ۔ تصور کریں اگر لوگ جہنم کے خیال سے خوف زدہ نہ ہوں یا جنت کے تصور سے اُنہیں ترغیب نہ ملے۔ یہ دنیا تو بدتر ہو جائے گی۔''

برف کے گالے ہوا میں نرمی سے تیر رہے تھے۔ شمس تبریز نے آگے جھک کر میری شال درست کی۔ گزرتے لمحے کو میں اُن کی خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہ خوشبو صندل کی مہک اور عنبر کا ایسا امتزاج تھی جس میں بارش کے بعد نم مٹی کی خوشبو کا احساس بھی شامل تھا۔ مجھے اپنے معدے میں ایک حدت سی محسوس ہوئی اور چاہت کی ایک لہر میرے وجود میں اٹھی۔ کتنی خجالت آمیز بات تھی یہ... اور پھر بھی عجیب بات تھی کہ خجالت آمیز نہیں بھی تھی۔

''محبت میں حدود دھندلا جاتی ہیں۔'' شمس تبریز نے کچھ دردمندی اور کچھ فکر مندی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا وہ عشق حقیقی کی بات کر رہے تھے یا پھر مرد و عورت کی محبت کی؟ کیا اُن کی مراد ہم دونوں سے تھی؟ کیا ''ہم'' جیسی کوئی چیز موجود بھی تھی؟

میری سوچ سے بے خبر، شمس تبریز نے بات جاری رکھی۔ ''مجھے حلال و حرام کی پرواہ نہیں۔ میں جہنم کی آگ سرد کر دوں گا اور جنت نذرِ آتش کر دوں گا تا کہ لوگ خدا سے صرف محبت کی خاطر محبت کریں۔''

''آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے۔ لوگ کم ظرف ہیں۔ یہ بات ہر کوئی نہیں سمجھ پائے گا۔'' میں نے یہ جانے بغیر کہہ دیا کہ مجھے اس تجربہ کے مکمل نتائج سمجھنے کے لیے مزید غور کرنا چاہیے۔

شمس تبریز کے چہرے پر ایک دلبرانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے انہیں خود کو تھامے رکھنے کی اجازت دی، اُن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پُرحدت اور بوجھل تھا۔

''شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو، لیکن کیا تمہارا خیال نہیں کہ یہی سبب ہے کہ میں اپنے دل کی بات کرتا ہوں؟ اس کے ساتھ ساتھ تنگ ذہن لوگ بہرے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے مہر لگے کانوں کے لیے تو میں جو بھی کہوں، وہ ان کے نزدیک سراسر کفر ہی ہوگا۔''

''حالاں کہ میرے نزدیک تو آپ جو کچھ بھی کہتے ہیں، وہ صرف شیریں ہے!''

شمس تبریز نے مجھے ایسی بے یقینی سے دیکھا جو حیرت کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ لیکن میں خود اُن سے زیادہ متحیر تھی۔ میں ایسی بات کہہ بھی کیسے سکتی تھی؟ کیا میں اپنے حواس کھو بیٹھی تھی؟ مجھ پر یقیناً کوئی جن یا ایسی ہی کوئی شے حاوی ہوگئی تھی۔

''معاف کیجئے۔ مجھے اب جانا چاہیے۔'' میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

میرے رخسار شرم سے دہک رہے تھے۔ میرا دل ان سب باتوں پر دھڑک رہا تھا جو ہم نے کہیں اور وہ جنہیں ہم نے اَن کہا رہنے دیا۔ میں تیزی سے صحن سے گزر کر گھر کے اندر چلی گئی۔ لیکن بھاگتے ہوئے بھی مجھے احساس تھا کہ دلیز پار کی جا چکی تھی۔ اس لمحے کے بعد میں اس سچائی کو نظر انداز نہ کر سکی جسے میں پہلے سے جانتی تھی: میں شمس تبریز کی محبت میں مبتلا ہو چکی تھی۔

شمس

قونیہ، جنوری 1246ء

بعض لوگوں کی فطرتِ ثانیہ دوسروں کی عیب جوئی ہوتی ہے۔ میں نے اپنے متعلق افواہیں سنی تھیں۔ جب سے میں قونیہ آیا، بہت سی افواہیں گردش میں ہیں۔ مجھے ان پر حیرت نہیں۔ اگرچہ قرآن میں واضح الفاظ میں درج ہے کہ عیب جوئی بڑا گناہ ہے، لیکن بیشتر لوگ اس سے گریز کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ اُن لوگوں کی مذمت کرتے ہیں جو مے نوشی کرتے ہوں یا پھر کسی زانیہ کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ جسے سنگسار کر سکیں، لیکن جب بات غیبت کی ہو جو خدا کی نگاہ میں کہیں بدتر گناہ ہے تو وہ اس خطاکاری پر توجہ ہی نہیں دیتے۔

یہ سب مجھے ایک قصے کی یاد دلاتا ہے۔

ایک روز کوئی آدمی کسی صوفی کے پاس بھاگتا آیا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا، ''ارے، وہ ہاتھوں میں طشت اٹھائے ہوئے ہیں، اُدھر دیکھو!''

صوفی نے سکون سے جواب دیا، ''اس سے ہمیں کیا؟ کیا میرا اس سے کوئی لینا دینا ہے؟''

''لیکن وہ لوگ طشت تمہارے گھر لے جا رہے ہیں!'' اُس آدمی نے بے ساختہ کہا۔

''کیا پھر تمہیں اس سے کوئی لینا دینا ہونا چاہیے؟'' صوفی نے کہا۔

بدقسمتی سے لوگ ہمیشہ دوسروں کے طشت دیکھتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھنے کی بجائے، وہ دوسرے لوگوں پر رائے زنی کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی من گھڑت باتوں پر میری حیرانی نہیں جاتی! شک اور عیب جوئی کی بات ہو تو اُن کے تخیل کی کوئی حد ہی نہیں۔

بہ ظاہر شہر کے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں درپردہ حشاشین کا سالار ہوں۔ کچھ لوگ تو یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ میں قلعہ الموت کے آخری اسماعیلی امام کا بیٹا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں کالے جادو اور ساحری میں ماہر ہوں، اس قدر کہ جس کسی کو بددعا دوں، وہ موقع پر ہی مر جائے گا۔ کچھ دوسرے

لوگ کھلے عام یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں نے مولانا رومی پر سحر کر دیا ہے۔ کہیں وہ سحر زائل نہ ہو جائے، اس یقین دہانی کے لیے میں انھیں روزانہ صبح سویرے سانپ کی یخنی پینے پر مجبور کرتا ہوں۔

ایسی واہیات بکواس سنوں تو میں ہنس کر اپنی راہ لیتا ہوں۔ بھلا اور کیا بھی کیا جائے؟ دوسروں کی ترش کلامی سے کسی درویش کا بھلا کیا جاتا ہے؟ اگر ساری دنیا کو سمندر نگل جائے تو بھی کسی بطخ کو اس سے کیا فرق پڑے گا؟

اس کے باوجود، میں دیکھ سکتا ہوں کہ میرے اردگرد لوگ فکر مند ہیں، خصوصاً سلطان ولد۔ وہ ایک ذہین نوجوان ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ جلدی اپنے والد کا دایاں بازو بنے گا۔ اور پھر، کمیا بھی ہے، پیاری کمیا... وہ بھی فکر مند لگتی ہے۔ لیکن بدترین بات یہ ہے کہ اس بدنامی و رسوائی میں مولانا رومی کو بھی ان کا حصہ مل رہا ہے۔ میرے برعکس، وہ لوگوں کی بدگوئی کے عادی نہیں۔ جب وہ جاہلوں کی باتیں سن کر پریشان ہوتے ہیں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ مولانا کا باطن نہایت خوب صورت ہے۔ اس کے برعکس، میرے پاس حُسن اور بدصورتی دونوں ہی ہیں۔ ان کی نسبت، میرے لیے دوسروں کی بدصورتی سے نمٹنا آسان ہے۔ لیکن ایک ایسا فاضل عالم، جاہلوں کی فضول گوئی سے کیسے نمٹے جسے سنجیدہ گفتگو اور منطقی نتائج اخذ کرنے کی عادت ہو؟

کوئی حیرت نہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ''اس جہان میں تین طرح کے لوگوں پر ترس کھاؤ۔ دولت مند شخص جس نے اپنی دولت کھو دی ہو، عزت دار شخص جس نے اپنا احترام کھو دیا ہو اور وہ صاحب حکمت جو جاہلوں میں گھر جائے۔''

اور پھر بھی میں خود کو یہ سوچنے پر مجبور پاتا ہوں کہ ہو سکتا ہے اس سب میں مولانا رومی کی کوئی بھلائی ہو۔ یہ عیب جوئی تکلیف دہ تو ہے مگر مولانا رومی کے قلب کے بدلنے کے لیے ضروری ہے۔ انھیں عمر بھر تعریف و تحسین، عزت ملی ہے، ان کی پیروی کی گئی ہے، ان کی شہرت بے داغ رہی ہے۔ انھیں معلوم نہیں کہ لوگ جب آپ کو غلط سمجھیں اور تنقید کریں تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے اس قسم کی زدپذیری اور تنہائی کی تکلیف بھی نہیں اٹھائی کہ جو کوئی ایسا شخص وقتاً فوقتاً محسوس کرتا ہے۔ ان کی انا لوگوں کے ہاتھوں زخمی تو کیا اسے کبھی ہلکی سی چوٹ بھی نہیں پہنچی۔ لیکن انھیں اس کی ضرورت ہے۔ یہ عیب جوئی جتنی تکلیف دہ ہے، اتنی ہی راہِ حق کے مسافر کے لیے بہتر ہے۔ یہ تیسواں اصول ہے: ''سچے صوفی پر چاہے ناحق الزام لگایا جائے، تہمت لگائی جائے اور ہر کوئی اس کی مذمت کرے، وہ اپنے ناقدوں کے خلاف کچھ بھی کہے بغیر سب کچھ صبر سے جھیلتا ہے۔ کوئی صوفی کسی کو بھی الزام نہیں دیتا۔ اس کے کوئی بھی مخالف یا حریف یا حتیٰ کہ ''دوسرے'' کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ اس کے ہاں کسی ''میں'' یا کسی ذات کا کوئی تصور ہی نہیں؟

کسی دوسرے کو کوئی الزام کیسے دیا جا سکتا ہے جب کہ کسی دوسرے کا وجود ہی نہیں، ذات واحد ہی ہے جو موجود ہے۔

ایلا

نارتھمپٹن، 17 جون 2008ء

میری محبوب ایلا،

سو تم چاہتی ہو کہ میں اپنے بارے میں مزید بتاؤں۔ سچ کہوں تو اپنی زندگی کے اس دور کے بارے میں لکھنا آسان نہیں کیوں کہ یہ ماضی کی ان چاہی یادیں واپس لے آتا ہے۔ لیکن پھر بھی سنو:

مارگٹ کی موت کے بعد میری زندگی بڑی ڈرامائی تبدیلیوں سے گزری۔ منشیات کے عادی لوگوں میں گم ہو کر، رات بھر جاری رہنے والی پارٹیوں اور ایمسٹرڈیم کے ان ڈانس کلبوں میں جاتے ہوئے جن کے نام کا بھی مجھے پہلے علم نہ تھا، میں نے سب غلط جگہوں پر سکون اور دردمندی کو تلاش کیا۔ غلط دوستیاں پال کر، اجنبی عورتوں کے بستر پر بیدار ہوتے میں رات کی مخلوق بن گیا تھا اور چند ہی ماہ میں میرا وزن پچیس پاؤنڈ سے زیادہ گر گیا۔

پہلی بار جب میں نے ہیروئن سونگھی تو مجھے قے ہو گئی اور طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ سارا دن مجھ سے اپنا سر نہ اٹھایا گیا۔ میرے جسم نے نشے کو مسترد کر دیا تھا۔ یہ ایک اشارہ تھا لیکن میں ایسی حالت میں نہ تھا کہ اسے سمجھ پاتا۔ اس سے پہلے کہ مجھے خبر ہوتی، میں ہیروئن سونگھنے کی بجائے اس کے انجکشن لینے لگا۔ میری جوانا، حشیش، ایسڈ، کوکین... میرے ہاتھ جو نشہ لگتا میں کر لیتا۔ مجھے جسمانی اور ذہنی طور پر خود کو برباد کرنے میں دیر نہ لگی۔ نشے میں ڈوبے رہنے کی خاطر میں سب کچھ کرتا تھا۔

اور اس نشے کی حالت میں مَیں نے اپنی جان لینے کو بہترین منصوبے بنائے۔ میں نے سقراط کی طرح Hemlock کھانے کی کوشش بھی کی، لیکن اس کے زہر نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا یا پھر وہ پودا ہی کوئی عام بے ضرر سا تھا جو میں نے ایک چینی دکان سے خریدا تھا۔ شاید انہوں نے مجھے کسی قسم کی سبز چائے بیچی تھی اور بعد میں مجھ پر ہنستے رہے تھے۔ کبھی صبحوں کو میں کسی انجان جگہ پر اپنے پہلو میں کسی نئی صورت کے ساتھ بیدار ہوتا لیکن وہ خالی پن دہیں موجود رہتا جو مجھے اندر سے کھائے جا رہا تھا۔ عورتوں نے میرا خیال

رکھا۔ کچھ مجھ سے کم عمر تھیں اور کچھ خاصی بڑی۔ میں اُن کے گھر میں رہا، اُن کے بستر پر سویا، اُن کے موسم گرما کی قیام گاہوں میں ٹھہرا، اُن کا پکا کھانا کھایا، اُن کے شوہروں کے لباس پہنے، اُن کے کریڈٹ کارڈز پر خریداری کی اور انہیں ذرہ برابر بھی وہ محبت دینے سے انکار کیا جو انہوں نے مجھ سے چاہی تھی یا جس کی وہ مستحق تھیں۔

جو زندگی میں نے چنی تھی، جلد ہی اپنی قیمت لینے لگی۔ میری ملازمت چلی گئی، دوست چھوٹ گئے، آخر کار وہ اپارٹمنٹ بھی چلا گیا جہاں مارگٹ اور میں نے بہت سے حسین دن گزارے تھے۔ یہ عیاں ہونے پر کہ میں اس طرزِ زندگی کا مزید متحمل نہیں ہو سکتا تھا، میں ایک Squat House میں رہنے لگا جہاں سب کچھ مشترک تھا۔ میں نے روٹرڈیم کے ایک Squat میں پندرہ مہینے سے زائد عرصہ گزارا۔ وہاں کوئی دروازے نہ تھے، اندر نہ ہی باہر، باتھ روم تک کا کوئی دروازہ نہ تھا۔ سب کچھ ہم شیئر کرتے تھے۔ ہمارے گیت، خواب، پاکٹ منی، منشیات، کھانا، بستر... سوائے درد کے، سب کچھ مشترکہ تھا۔

منشیات اور عیاشی میں زندگی کو جھونکتے، میں اُس شخص کا سایہ سا بن کر پاتال میں اتر چکا تھا جو میں کبھی ہوا کرتا تھا۔ ایک صبح منہ دھوتے میں نے آئینے میں دیکھا۔ میں نے تب تک کبھی کسی کو اتنی نوجوانی میں اس قدر شکستہ اور افسردہ نہ دیکھا تھا۔ میں دوبارہ اپنے بستر پر جا لیٹا اور کسی بچے کی طرح روتا رہا۔ اسی روز میں نے وہ سارے باکس کھنگالے جن میں مارگٹ کی استعمال شدہ چیزیں رکھی تھیں۔ اس کی کتابیں، کپڑے، ریکارڈز، بالوں کی پنیں، کاغذ کے پرزوں پر لکھی اس کی تحریریں، تصویریں... میں نے ایک ایک کر کے اُس کی ہر نشانی کو الوداع کہا۔ اس کے بعد میں نے انہیں واپس ڈبوں میں رکھا اور انہیں ان تارکینِ وطن کے بچوں کو دے دیا جن کے لیے مارگٹ فکرمند رہا کرتی تھی۔ یہ 1977ء تھا۔

پھر خدا کی طرف سے بھیجے گئے رابطوں سے، مجھے ایک مشہور ٹریول میگزین میں فوٹوگرافی کی ملازمت مل گئی۔ یوں میں کینوس کا سوٹ کیس اور مارگٹ کی فریم شدہ تصویر لے کر اس آدمی سے دور بھاگتے جو میں بن چکا تھا، شمالی افریقہ کے سفر پر روانہ ہوا۔

ایک برطانوی اینتھروپولوجسٹ سے میں صحارا اٹلس میں ملا اور اس نے مجھے ایک مشورہ دیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ایسا پہلا مغربی فوٹوگرافر بننا چاہتا تھا جو اسلام کے مقدس ترین شہروں میں گیا ہو۔ اس نے بتایا کہ سعودی قوانین کے مطابق غیر مسلموں کا مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں داخلہ سختی سے منع تھا۔ کسی عیسائی یا یہودی کو داخلے کی اجازت نہیں، ماسوائے اس کے کہ کوئی کسی طریقے سے چوری چھپے جا سکے اور تصویریں کھینچ لے۔ اگر پکڑے گئے تو آپ کو جیل ہو سکتی ہے یا اس سے بھی بدتر کوئی سزا۔ میں نے اسے غور سے سنا۔ کسی ممنوعہ علاقے میں دخل در اندازہونا اور ایسے کام میں کامیابی حاصل کرنا جو پہلے کوئی نہ کر سکا ہو، شہرت اور رقم کا تو ذکر ہی کیا جو بعد میں ملتی، اس کی سنسنی خیزی ہی بہت تھی... مجھے اس تصور میں کچھ ایسی کشش محسوس ہوئی جیسے کسی شہد کی مکھی کو شہد کے مرتبان میں۔

اُس اینتھروپولوجسٹ نے کہا کہ میں یہ سب تنہا نہیں کرسکتا تھا اور مجھے اس کے لیے کسی رابطوں کی ضرورت تھی۔ اُس نے علاقے کی صوفی برادری سے رابطے کا مشورہ دیا۔ کون جانے وہ کسی مدد کے لیے راضی ہو جائیں، اس نے کہا۔

مجھے صوفی ازم کے بارے میں کچھ علم نہ تھا اور مجھے اس کی پرواہ بھی نہ تھی۔ اگر وہ کسی مدد کی پیشکش کرتے تو مجھے ان صوفیوں سے مل کو مسرت ہوتی۔ میرے نزدیک وہ بس کام نکلوانے کا ایک وسیلہ تھا۔ لیکن پھر اُس وقت ہر کوئی اور ہر چیز میرے لیے ایسی ہی تھی۔

زندگی بہت عجیب ہے، ایلا۔ انجام کار یہ کہ میں کبھی مکہ یا مدینہ نہیں جا سکا۔ تب نہ ہی بعد میں۔ میرے قبولِ اسلام کے بعد بھی نہیں۔ تقدیر مجھے ایک بالکل مختلف راہ پر لے آئی، ایسے غیر متوقع موڑ اور تبدیلیاں جنہوں نے مجھے اس قدر گہرائی سے اور اتنے انداز میں بدلا کہ کچھ عرصے بعد اصل منزل اپنی اہمیت کھو بیٹھی۔ اگرچہ آغاز میں نے بالکل مادی وجوہات کے باعث کیا تھا مگر جب سفر انجام کو پہنچا تو میں مکمل طور پر ایک تبدیل شدہ شخص تھا۔

جہاں تک بات ہے صوفیوں کی، کسے خبر تھی کہ جنہیں میں نے شروع میں مقصد پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا تھا، وہی خود مقصد بن جائیں گے؟ اپنی زندگی کے اس حصے کو میں لفظ "صوفی" میں حرف "و" سے اتفاقیہ ملاقات کہتا ہوں۔

محبت کے ساتھ

عزیز

طوائف، گُلِ صحرا

قونیہ، فروری 1246ء

بد بخت و تاریک چالیس برس میں وہ سرد ترین دن تھا، جس روز میں نے قحبہ خانہ چھوڑا۔ تازہ گرتی برف میں چمکتی ہوئی تنگ بل کھاتی گلیاں اور گھروں کی چھتوں اور مسجدوں کے میناروں سے لٹکتے برف کے جھمکے ہولناک حد تک حسین لگ رہے تھے۔ سہ پہر تک سردی اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ گلیوں میں سردی سے ٹھٹھری منجمد بلیاں دکھائی دینے لگیں جن کے گل مچھے برف کے باریک دھاگوں میں بدل گئے تھے اور کئی خستہ حال مکان برف کے بوجھ تلے دب کر منہدم ہو گئے تھے۔ ان آوارہ بلیوں کے بعد جنہوں نے سب سے زیادہ تکلیف اٹھائی، وہ تھے قونیہ کے بے گھر۔ نصف درجن منجمد لاشیں تھیں... سب کے سب ہلاکت خیز حالت میں اپنے چہروں پر روحانی خوشی بھری مسکراہٹ لیے، یوں جیسے وہ کسی بہتر اور حدت بھری دنیا میں نئے جنم کی توقع کر رہے ہوں۔

ڈھلتی سہ پہر میں، جب ہر کوئی شام کی ہلچل کے آغاز سے پہلے نیند لے رہا تھا، میں چپکے سے اپنے کمرے سے نکل آئی۔ میں نے وہ تمام ریشمی پوشاکیں اور لوازمات پیچھے چھوڑتے ہوئے جو میں خاص گاہکوں کے لیے پہنا کرتی تھی، صرف چند سادہ جوڑے اپنے ساتھ رکھے۔ جو کچھ قحبہ خانے میں کمایا گیا تھا، اسے وہیں قحبہ خانے میں ہی رہنا تھا۔

سیڑھیوں کے بیچ پہنچنے پر مجھے مرکزی دروازے پر منولیا کھڑی نظر آئی، جو بھورے پتے چبا رہی تھی، جن کے نشے کی وہ عادی تھی۔ وہ قحبہ خانے کی تمام عورتوں میں عمر رسیدہ تھی اور حال ہی میں ناگہانی تپش کی شکایت کرنے لگی تھی۔ راتوں کو میں اسے بستر میں کروٹیں بدلتے دیکھتی تھی۔ یہ کوئی راز کی بات نہ تھی کہ اس کی نسوانیت ختم ہو رہی تھی۔ نوعمر لڑکیاں مذاق میں کہتیں کہ انہیں منولیا پر رشک آتا تھا کہ اسے عورتوں کے مخصوص مسائل، حمل اور اسقاط سے نہ گزرنا پڑتا اور اب وہ مہینے کی ہر شب کسی مرد کے ساتھ گزار سکتی تھی، لیکن ہم سب ہی اس بات سے آگاہ تھیں کہ کسی عمر رسیدہ طوائف

کی بقا کے مواقع کم ہی تھے۔

منولیا کو وہاں کھڑے دیکھتے ہی میں جان گئی کہ میرے پاس صرف دو ہی راستے تھے: میں اپنے کمرے میں واپس چلی جاؤں اور فرار کو بھول جاؤں یا پھر اُس دروازے سے نکلوں اور نتائج کا سامنا کروں۔ میرے دل نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔

''منولیا، تمہاری طبیعت بہتر ہوئی؟'' میں نے ایسا لہجہ اختیار کرتے کہا جو مجھے امید تھی کہ پرسکون اور معمول کا سا تھا۔

منولیا کا چہرہ روشن ہوا لیکن میرے ہاتھوں میں تھیلا دیکھ کر پھر تاریک پڑ گیا۔ جھوٹ بولنے کی اب کوئی تُک نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ نانگہ نے قحبہ خانے سے نکلنا ایک طرف، مجھے اپنے کمرے سے نکلنے سے بھی منع کر رکھا تھا۔

''کیا تم جا رہی ہو؟'' منولیا نے یوں گہری سانس بھری جیسے اس سوال نے خود اسے خوف زدہ کر دیا ہو۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب کوئی انتخاب کرنے کی باری اُس کی تھی۔ وہ میرا راستہ روک اور سب کو میرے عزائم سے باخبر کر سکتی تھی یا پھر وہ مجھے جانے دیتی۔ منولیا نے مجھے گھور کر دیکھا، اُس کے تاثرات سنجیدہ اور ناگواری بھرے تھے۔

''اپنے کمرے میں واپس جاؤ، گُلِ صحرا۔'' اُس نے کہا، ''نانگہ، گیڈسر کو تمہارے پیچھے بھیج دے گی۔ کیا تم نہیں جانتی نہیں اُس نے پہلے کیا کیا تھا...؟''

لیکن اُس نے اپنا جملہ مکمل نہ کیا۔ یہ قحبہ خانے کے غیر تحریر شدہ اصولوں میں سے ایک تھا: ہم اُن بدنصیب لڑکیوں کی کہانیاں نہیں کہتیں جو ہم سے پہلے یہاں کام کرتی رہی تھیں اور ان کا وقت سے پہلے انجام ہوا تھا اور شاذ ہی جب ہم ان کا ذکر کرتیں بھی تو خیال رکھتی تھیں کہ ان کا نام نہ لیا جائے۔ انہیں اُن کی قبر میں پریشان کرنے کی کوئی تُک نہ تھی۔ انہوں نے پہلے ہی بڑی مشکل زندگیاں گزاری تھیں، بہتر ہوتا کہ انہیں اب محوِ آرام رہنے دیا جاتا۔

''اگر تم کسی طرح فرار میں کامیاب بھی ہو جاؤ تو تم گزر بسر کیسے کرو گی؟'' منولیا نے اصرار سے کہا، ''تم بھوکوں مر جاؤ گی۔''

مجھے منولیا کی آنکھوں میں خوف نظر آیا... یہ خوف نہیں کہ میں بھاگنے میں ناکام رہوں گی اور پھر نانگہ مجھے سزا دے گی بلکہ یہ خوف کہ شاید میں فرار میں کامیاب رہوں۔ میں وہ کرنے جا رہی تھی جس کا اُس نے ہمیشہ خواب ہی دیکھا تھا اور کبھی فرار کی جرأت نہ کر پائی تھی، اور اب اُسے میری ثابت قدمی کا احترام بھی تھا اور اس سے نفرت بھی ہو رہی تھی۔ مجھے لمحے بھر کو تذبذب ہوا اور شاید میں واپس اندر چلی ہی جاتی،

''مجھے جانے دو، منولیا۔'' میں نے کہا، ''میں مزید ایک روز بھی یہاں نہیں رکوں گی۔''

بھرس کے ہاتھوں پٹنے اور موت کا سامنا کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اندر کچھ اٹل انداز میں بدل گیا تھا۔ یوں جیسے اب مجھ میں کوئی خوف باقی نہ رہا تھا۔ کسی بھی صورت انجام جو بھی ہوتا، مجھے کوئی پرواہ نہ تھی۔ میں اپنی باقی زندگی خدا سے منسوب کرنے کو پُرعزم تھی۔ وہ زندگی چاہے ایک روز کی ہوتی یا پھر برسوں کی، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شمس تبریز نے کہا تھا کہ ایمان اور محبت انسانوں کو بہادر اور مجمع بنا دیتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے دلوں سے ہر قسم کے خوف اور حزن وغم کو نکال دیتے ہیں۔ میں اب سمجھنے لگی تھی کہ اُن کی اس بات سے کیا مراد تھی۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ منولیا بھی سمجھ گئی۔ اُس نے مجھ پر ایک طویل درد بھری نگاہ ڈالی اور پھر ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دے دیا۔

Scanned by CamScanner

ایلا

نارتھمپٹن، 19 جون 2008ء

میری محبوب ایلا،

اس قدر دردمند ہونے کا شکریہ۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں میری زندگی کی کہانی پسند آئی اور یہ کہ تم اس بارے میں بہت سوچتی بھی ہو۔ میں کسی سے بھی اپنے ماضی کے بارے میں بات کرنے کا عادی نہیں اور عجیب بات یہ کہ تم سے بات کر کے میرا دل جیسے ہلکا پھلکا سا ہو گیا ہے۔

میں نے 1977ء کا موسم گرما مراکش میں کچھ صوفیوں کے ساتھ گزارا تھا۔ میرا کمرا سفید، چھوٹا اور سادہ سا تھا۔ اس میں بس عام ضرورت کی چیزیں ہی موجود تھیں: بوریا، تیل کا چراغ، عنبریں تسبیح، کھڑکی کے پاس پھولوں کا گملا، نظر بٹو اور اخروٹ کی لکڑی کی میز جس کی دراز میں مولانا روم کی شاعری کا نسخہ رکھا تھا۔ کوئی فون موجود تھا، نہ ٹیلی ویژن، نہ گھڑی نہ ہی بجلی۔ مجھے اس کی کوئی پرواہ بھی نہ تھی۔ برسوں Squat Houses میں رہنے کے باعث، مجھے درویشی خانقاہ میں کیا مسئلہ ہو سکتا تھا۔

میری پہلی شام شیخ سمید ملنے کے لیے میرے کمرے میں آئے۔ انہوں نے کہا کہ میں مکہ روانگی کے لیے تیار ہونے تک اُن کے ساتھ رہ سکتا ہوں، انہیں خوشی ہوگی۔ البتہ ایک شرط پر: کوئی منشیات نہیں۔

مجھے اپنے چہرے کا سرخ پڑنا یاد ہے، جیسے کسی بچے کو کوکیز کے جار میں ہاتھ ڈالے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ انہیں کیسے خبر ہوئی؟ کیا جب میں باہر کہیں تھا تو انہوں نے میرے سوٹ کیس کو کھنگالا تھا؟ شیخ نے اس کے بعد جو کچھ کہا، میں کبھی فراموش نہیں کر پاؤں گا: ''یہ جاننے کے لیے کہ تم منشیات استعمال کرتے ہو، ہمیں تمہارے سامان کی تلاشی کی ضرورت نہیں، برادر کریگ۔ تمہاری آنکھیں منشیات کے عادی لوگوں جیسی ہیں۔''

اور مضحکہ خیز بات یہ ہے ایلا کہ اس روز سے پہلے میں نے خود کو نشے کا عادی خیال ہی نہ کیا

تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے خود پر اختیار ہے اور منشیات میری بس ذرا مدد کرتی ہیں۔" درد کوئی کرتا، اس کے علاج کے برابر نہیں۔" شیخ سمید نے کہا۔" استعمیر یا جب ختم ہو جاتا ہے تو درد جوں کا توں موجود ہوتا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ ان کا کہنا درست تھا۔ ایک خود پسند عزم کے ساتھ، میں نے وہ تمام منشیات ان کے سپرد کر دیں جو میرے پاس تھیں، یہاں تک کہ نیند کی گولیاں بھی۔ لیکن جلد ہی مجھ پر واضح ہو گیا کہ میرا عزم اس قدر مضبوط نہیں تھا کہ مجھے آنے والے حالات سے گزار دے۔ اس خانقاہ میں قیام کے چار ماہ میں مَیں نے اپنا عہد کئی بار توڑا اور درجن بھر سے زائد مرتبہ میں اپنی راہ سے بری طرح بھٹکا۔ کسی ایسے شخص کے لیے جو سنجیدہ و متین رہنے پر مخمور رہنے کا انتخاب کرے، وہ چاہے غیر ملکی ہی ہو، اس کے لیے منشیات تلاش کرنا ایسا مشکل کام نہیں۔ ایک شب جب میں نشے سے مخمور حالت میں واپس آیا تو مجھے خانقاہ کے دروازے اندر سے مقفل ملے۔ اس رات مجھے باغ میں سونا پڑا۔ اگلے روز شیخ سمید نے ہی کچھ پوچھا نہ میں نے ہی کوئی معذرت کی۔

ان شرم انگیز واقعات کے علاوہ، شام کے اوقات میں خانقاہ پر طاری سکون سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میری صوفیوں سے اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہاں قیام کچھ الگ سا تھا مگر عجیب طور پر پرسکون بھی تھا۔ میں اگر چہ پہلے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک مشترکہ چھت تلے رہتا آیا تھا مگر خانقاہ میں مجھے کچھ ایسا ملا جس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہ ہوا تھا: داخلی سکون۔

بہ ظاہر ہم ایک اجتماعی زندگی گزار رہے تھے، جہاں ہر کوئی مل کر کھاتا پیتا اور مقررہ وقت پر ایک سے فرائض ادا کرتا، لیکن گہرائی میں ہمیں تنہا رہنے اور اپنے باطن میں جھانکنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ تصوف کی راہ پر، آپ سب سے پہلے ہجوم میں تنہا رہنے کا فن دریافت کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ اپنی تنہائی میں ہجوم دریافت کرتے ہیں... اپنے باطن کی آوازیں۔

جب میں مراکش میں منتظر تھا کہ صوفی مجھے بہ حفاظت چوری چھپے مکہ اور مدینہ بھجوا دیں، میں نے صوفی فلسفے اور شاعری کا گہرا مطالعہ کیا، پہلے تو اکتاہٹ سے نکلنے اور اس لیے کہ کرنے کو اس سے بہتر کچھ نہ تھا، مگر بعد میں اپنی دلچسپی کے سبب۔ کسی ایسے شخص کی طرح جسے پانی کا پہلا گھونٹ بھرنے سے پہلے اپنی پیاس کی شدت کا علم نہ تھا، مجھے معلوم ہوا کہ تصوف سے اس اتفاقی تعارف نے میری اس کے لیے پیاس کو بڑھا دیا تھا۔ اس طویل موسم گرما میں مَیں نے جتنی کتابیں پڑھیں، ان میں مولانا رومی کی شاعری نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

تین ماہ بعد، شیخ سمید نے اچانک کہا کہ مجھے دیکھ کر انہیں کسی کی یاد آتی ہے... شمس تبریز نامی ایک سرگرداں درویش۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگ شمس تبریز کو کافر سمجھتے تھے لیکن اگر مولانا رومی سے پوچھا جاتا تو شمس تبریز، چاند اور سورج تھے۔

مجھے تجسس ہوا۔ لیکن یہ ایک عام تجسس نہ تھا۔ شیخ سمید سے شمس تبریز کے بارے جانتے ہوئے

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں کپکپی سی دوڑتی محسوس ہوئی، التباس کا عجیب سا احساس۔

اب تم سوچو گی کہ میں دیوانہ ہوں۔ لیکن خدا کی قسم، اسی لیے مجھے پس منظر میں ریشمی سرسراہٹ سنائی دی، پہلے دور کہیں، پھر نزدیک آتی ہوئی، اور میں نے کسی ایسے شخص کا سایہ دیکھا جو وہاں موجود نہ تھا۔ شاید وہ شاخوں سے گزرتی شام کی ہوا ہو یا پھر کسی فرشتے کے پر۔ بہر صورت میں جان گیا کہ کہیں جانے کی ضرورت نہ تھی۔ اب نہیں۔ ہمیشہ کہیں اور جانے کی آرزو میں، کہیں دور، ہمیشہ کسی عجلت میں، میں اس خواہش سے تنگ آچکا اور بیزار ہو چکا تھا۔

میں پہلے ہی وہیں تھا جہاں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اب بس وہاں رہ کر اپنے اندر جھانکنا تھا۔

میری زندگی کے اس نئے حصے کو میں لفظ ''صوفی'' میں حرف ''ف'' سے ملاقات کہتا ہوں۔

محبت کے ساتھ

عزیز

شمس

قونیہ، فروری 1246ء

بہ ظاہر وہ ایک مصروف دن متوقع تھا، صبح معمول سے تیزی سے گزری اور آسمان پر سرمئی بدلیاں جھک آئی تھیں۔ سہ پہر دیر گئے، مولانا رومی مجھے اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھے ملے۔ اُن کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں، اُن کی انگلیاں اضطراب سے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔ مخملیں پردے آدھے گرے ہوئے تھے، اس لیے کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ مولانا رومی کی نشست کے آس پاس دھوپ عجیب انداز سے چھن کر پڑتے ہوئے پورے منظر کو خواب ناک بنا رہی تھی۔ میں نے خود کو یہ سوچنے پر مجبور پایا کہ کیا مولانا رومی میری اس بات کے در پردہ نیت کو سمجھ جائیں گے جو میں اُن سے کہنے والا تھا، یا پھر انہیں صدمہ ہوگا اور وہ پریشان ہو جائیں گے؟

میں اُس لمحے کے سکون کو جذب کرتا وہاں کھڑا رہا، لیکن مجھے ہلکی سی گھبراہٹ کے ساتھ کشف کی جھلک بھی دکھائی دی۔ میں نے مولانا رومی کو دیکھا، ابھی سے کہیں عمر رسیدہ اور کمزور، گہرے سبز چغے میں ملبوس، عین اِسی جگہ بیٹھے، پہلے سے کہیں زیادہ مہربان اور مشفق دکھائی دیتے ہوئے، لیکن اُن کے دل میں میری صورت ایک مستقل داغ تھا۔ مجھے ایک ساتھ دو باتیں سمجھ آئیں: یہ کہ مولانا رومی اپنے بڑھاپے کے ایام یہیں اس گھر میں گزاریں گے، اور یہ کہ میری جدائی کا زخم کبھی نہیں بھرے گا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''کیا آپ ٹھیک ہیں؟ آپ زرد دکھائی دے رہے ہیں۔'' مولانا رومی نے کہا۔

میں زبردستی مسکرایا، لیکن میں جو کہنے جا رہا تھا، اس کے بوجھ سے میرے کندھے جھک گئے۔ میری آواز میرے ارادے کی نسبت قدرے شکستہ تھی اور زیادہ پُرزور نہ تھی۔ ''نہیں۔ میں بے حد پیاسا ہوں اور اس گھر میں ایسا کچھ نہیں جو میری پیاس بجھا سکے۔''

''اگر آپ چاہیں تو میں کیرا سے اس سلسلے میں کچھ کرنے کا کہوں؟'' مولانا رومی نے پوچھا۔

"نہیں، کیوں کہ مجھے جو چاہیے وہ باورچی خانے میں نہیں ہے۔ وہ مے خانے میں ملے گا۔ میں مے نوشی کرنا چاہ رہا ہوں۔"

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں نے مولانا رومی کے چہرے پر عدم فہمی کا سایہ لہراتے نہ دیکھا تھا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "باورچی خانے میں پانی لینے جانے کی بجائے، کیا آپ مے سرخ لینے کی خاطر مے خانے جا سکتے ہیں؟"

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ چاہتے ہیں میں آپ کے لیے مے سرخ لاؤں؟" مولانا رومی نے "مے سرخ" کا لفظ یوں احتیاط سے اپنی زبان سے ادا کیا جیسے اس کے ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو۔

"یہی بات ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر ہمارے لیے مے سرخ لے آئیں۔ دو صراحیاں بہت ہوں گی، ایک آپ کی اور دوسری میری۔ لیکن ایک مہربانی کیجئے۔ جب آپ مے خانے جائیں تو صراحیاں لے کر سیدھے واپس مت آجائیں۔ وہاں کچھ دیر ٹھہریں۔ لوگوں سے گفتگو کریں۔ میں یہاں آپ کا منتظر رہوں گا۔ عجلت کی ضرورت نہیں۔"

مولانا رومی نے کچھ برافروختگی اور کچھ مضطرب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میرے تصور میں بغداد کے نومرید درویش کا چہرہ آ گیا جو میرا ہمراہی بننا چاہتا تھا لیکن اسے اپنی نیک نامی کا بہت خیال تھا۔ اُسے دوسروں کی اپنے بارے میں رائے کی بہت فکر تھی جس نے اسے روک دیا۔ اب میں نے سوچا کہ آیا مولانا رومی کی نیک نامی اور شہرت بھی انہیں روکے گی یا نہیں۔

لیکن مجھے بے حد اطمینان ہوا کہ مولانا رومی اٹھ کھڑے ہوئے اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں کبھی مے خانے نہیں گیا اور میں نے مے نوشی بھی کبھی نہیں کی۔ میرا نہیں خیال کہ مے نوشی کوئی اچھی بات ہے۔ لیکن مجھے آپ پر مکمل بھروسا ہے کیوں کہ مجھے ہماری محبت پر بھروسا ہے۔ ضرور کوئی سبب ہوگا جو آپ نے مجھے ایسا کام کرنے کا کہا ہے۔ مجھے وہ سبب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ میں جا کر ہمارے لیے مے سرخ لاتا ہوں۔"

الوداع کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

ان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی میں وجد کے عالم میں فرش پر گر پڑا۔ اُس عنبریں تسبیح کو تھام کر جو مولانا رومی چھوڑ گئے تھے، میں نے ایسا سچا رفیق عطا کیے جانے پر اللہ کا بار بار شکر ادا کیا اور دعا گو ہوا کہ اُن کی خوب صورت روح ہمیشہ عشق الٰہی کے خمار میں ڈوبی رہے۔

حصہ چہارم

آتش

اشیا جو نقصان پہنچاتی اور تباہ و برباد کرتی ہیں



مدہوش سلیمان

قونیہ، فروری 1246ء

بادۂ سرخ سے بہک کر، مخمور حالت میں مجھے بہت بار دیوانگی بھرے وہم ہو جاتے تھے، لیکن مولانا رومی کو مے خانے کے دروازے سے داخل ہوتے دیکھنا، حتیٰ کہ میرے لیے بھی کوئی بے لگام خیال تھا۔ میں نے خود کو چٹکی کاٹی لیکن وہ خواب تمام نہ ہوا۔

''ارے ہرسٹوس، تم نے پینے کو مجھے کیا پیش کیا تھا؟'' میں چلایا، ''مئے سرخ کی آخری صراحی میں کوئی طاقت ور نشہ تھا۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ اس وقت مجھے کیا فریب خیال دکھائی دے رہا ہے۔''

''شش، احمق۔'' میرے پیچھے کسی نے سرگوشی کی۔

میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی کہ مجھے خاموش کروانے کی کوشش کون کر رہا تھا اور یہ دیکھ کر مبہوت رہ گیا کہ مے خانے میں موجود ہرسٹوس سمیت ہر شخص دروازے کی جانب گھور رہا تھا۔ جگہ ایک عجیب خاموشی میں ڈوب گئی، حتیٰ کے مے خانے کا کتا ساقی بھی ششدر دکھائی دیا کہ وہ اپنے بڑے کان زمین سے لگائے خاموش لیٹا تھا۔ ایرانی قالینوں کے تاجر نے اپنی وہ ناگوار دھنیں بجانا بند کیں جنھیں وہ گیت کہتا تھا۔ اس کی بجائے وہ اپنی ٹھوڑی اونچی رکھتے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑا لہرایا، کسی ایسے شرابی کی سی مبالغہ آمیز سنجیدگی میں، جو اپنی اصل حالت کے برعکس دکھائی دینے کی کوشش میں ہو۔

وہ ہرسٹوس تھا جس نے خاموشی کو توڑا۔ ''مرحبا مولانا۔ میرے مے خانے میں خوش آمدید!'' اُس نے خوش خلقی سے لتھڑے لہجے میں کہا، ''آپ کو اپنی چھت تلے دیکھنا میرے لیے باعث اعزاز ہے۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

میں نے بار بار پلکیں جھپکائیں، یہاں تک کہ مجھ پر روشن ہوا کہ واقعی مولانا رومی ہی وہاں کھڑے تھے۔

''آپ کا شکریہ۔'' مولانا رومی نے کھلی مگر بے تاثر مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''میں مئے سرخ

خریدنا چاہوں گا۔"

بے چارہ ہرسٹوس یہ سن کر اس قدر حیران ہوا کہ اُس کا منہ کھلا رہ گیا۔ جب وہ دوبارہ بلنے کے قابل ہوا تو اُس نے پچھلی خالی میز کی طرف مولانا رومی کی رہنمائی کی، جو اتفاق سے میرے برابر میں تھی۔

"سلام علیکم۔" مولانا رومی نے بیٹھتے ہی مجھے سلام کیا۔

میں نے انہیں سلام کا جواب دیا اور بشاشت سے حال پوچھا، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میری زبان سے درست الفاظ نکلے یا نہیں۔ اپنے پُرسکون تاثرات، قیمتی لبادے اور نفیس گہرے بھورے کافتان کے ساتھ مولانا رومی بالکل بے جگہ لگ رہے تھے۔

میں آگے کو جھکا اور اپنی آواز کو سرگوشی میں ڈھالتے بولا، "کیا بہت گستاخی ہوگی اگر میں پوچھوں کہ آپ جیسی شخصیت یہاں کیا کر رہی ہے؟"

"یہ صوفیانہ آزمائش ہے۔" مولانا رومی نے یوں ایک آنکھ میچتے ہوئے کہا جیسے ہم گہرے دوست ہوں۔ "مجھے یہاں شمس نے بھیجا ہے تاکہ میں اپنی نیک نامی برباد کر سکوں۔"

"اور کیا یہ اچھی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

مولانا رومی ہنس دیئے۔ "خیر، یہ تو اس پر منحصر ہے کہ آپ اسے کیسے دیکھتے ہیں۔ کبھی اپنے نفس پر حاوی ہونے کے لیے تمام وابستگیاں توڑنا پڑتی ہیں۔ اگر ہم اپنے خاندان، معاشرے میں اپنے مقام، حتیٰ کہ اپنے مقامی مدرسے یا مسجد سے اتنے وابستہ ہوں کہ وہ خدا سے وصل کی راہ میں حائل ہو جائے تو ضروری ہے کہ ہم ایسی وابستگی کو توڑ دیں۔"

مجھے نہیں معلوم کہ آیا میں اُن کی بات ٹھیک سے سمجھ پا رہا تھا یا نہیں، لیکن کسی طور وہ وضاحت میرے پراگندہ دماغ کو درست معلوم ہوئی۔ مجھے ہمیشہ سے شبہ تھا کہ یہ صوفی، دیوانوں اور ہر طرح کے سنکی اور عجیب و غریب رنگ برنگے لوگوں کا گروہ تھا۔

اب مولانا رومی کی باری تھی کہ انہوں نے آگے کو جھک کر اسی سرگوشی بھرے لہجے میں پوچھا، "یہ بدتمیزی تو نہ ہوگی کہ اگر میں پوچھوں کہ آپ کے چہرے پر یہ زخم کا نشان کیسا ہے؟"

"یہ کوئی خاص دلچسپ قصہ نہیں۔" میں نے کہا، "میں شب دیر گئے پیدل گھر جا رہا تھا کہ میری مڈھ بھیڑ ضابطہ سپاہی سے ہوگئی جس نے مجھے زدوکوب کیا۔"

"مگر کیوں؟" مولانا رومی نے حقیقت میں فکرمند دکھائی دیتے پوچھا۔

"کیوں کہ میں نے مئے سرخ پی تھی۔" میں نے شراب کی اس صراحی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ہرسٹوس نے ابھی ابھی مولانا رومی کے سامنے رکھی تھی۔

مولانا رومی نے اپنا سر ہلایا۔ پہلے تو وہ بالکل چکرائے ہوئے دکھائی دیئے، یوں جیسے انہیں یقین نہ آیا ہو کہ ایسا بھی کچھ ہو سکتا تھا، لیکن جلد ہی اُن کے ہونٹوں پر ایک دوستانہ مسکراہٹ ابھری۔ اور

یوں ہم باتیں کرتے رہے۔ روٹی اور بکری کے پنیر سے لے کر ہم نے ایمان، دوستی اور ایسی ہی زندگی کی دوسری چیزوں پر بات کی جو میرے خیال میں مَیں عرصہ ہوا فراموش کر بیٹھا تھا لیکن اب انہیں اپنے دل میں نہاں پا کر بے حد مسرور تھا۔

غروب آفتاب کے ذرا دیر بعد مولانا رومی واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مے خانے میں موجود سب لوگ اُنہیں الوداع کہنے کو اٹھے۔ وہ قابل دید منظر تھا۔

''آپ ہمیں یہ بتائے بغیر نہیں جا سکتے کہ مے نوشی ممنوع کیوں ہے۔'' میں نے کہا۔

ہرسٹوس تیوریاں چڑھائے میری طرف بڑھا، وہ فکر مند تھا کہ میرا سوال کہیں اُس کے معزز گاہک کو برہم نہ کر دے۔ ''ہش، سلیمان۔ تمہارا ایسی باتیں پوچھنا آخر کیوں ضروری ہے؟''

''نہیں، واقعی۔'' میں نے مولانا رومی پر نظریں جمائے ہوئے اصرار کیا۔ ''آپ نے ہمیں دیکھا ہی ہے۔ ہم گنہگار اور فاسق لوگ نہیں ہیں، لیکن لوگ ہمیں ہمیشہ یہی کچھ کہتے ہیں۔ آپ بتائیے مے نوشی میں کیا برائی ہے، اس صورت میں کہ ہم خود پر قابو رکھیں اور کسی دوسرے کو نقصان نہ پہنچائیں؟''

کھلی کھڑکی کے باوجود، مے خانے کے اندر کی فضا بوسیدہ اور دھواں دھواں ہو گئی اور جیسے کسی توقع کے عالم میں بھیگ گئی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہاں موجود ہر شخص جواب سننے کو متجسس تھا۔ متفکر، مہربان، متین، مولانا رومی میری طرف بڑھے اور یہ تھا جو انہوں نے کہا:

''اگر کسی مے نوش کے اندر گہری بردباری ہے تو
تو وہ وہی دکھائے گا، حالتِ خمار میں۔
لیکن اگر اُس کے اندر برہمی اور تکبر نہاں ہے،
تو وہی ظاہر ہوں گے،
اور کیوں کہ بیشتر لوگ اپنے اندر یہی کچھ رکھتے ہیں،
اس لیے مۓ سرخ ہر کسی کے لیے ممنوع ہے۔''

ذرا دیر کو سکوت سا چھا گیا کہ ہم سب ہی ان الفاظ پر غور کر رہے تھے۔

''میرے دوستو، شراب کوئی بے ضرر مشروب نہیں۔'' مولانا رومی نے ہم سے ایک نئے لہجے میں خطاب کیا، اس قدر حلیمہ مگر پھر بھی نپا تلا اور مضبوط لہجہ۔ ''کیوں کہ یہ ہمارے بدترین پہلو کو باہر لے آتی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ مے نوشی سے اجتناب کیا جائے۔ یہ بات ایک طرف، ہم ان باتوں کا الزام شراب کو نہیں دے سکتے جن کے ذمے دار ہم خود ہیں۔ ہمیں اپنے تکبر اور غصے پر حاوی ہونے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ آخر میں، جو کوئی مے نوشی کرنا چاہتا ہے، وہ کرے گا ہی، اور جو کوئی شراب سے دور رہنا چاہتا ہے، وہ دور ہی رہے گا۔ ہمیں اپنے طور طریقے دوسروں پر زبردستی نافذ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ دین میں کوئی جبر نہیں۔''

اس پر کچھ گاہکوں نے کشادہ دلی سے سر ہلایا۔ جہاں تک میری بات تھی، میں نے اپنا جام بلند کیا کہ میرا عقیدہ تھا کہ حکمت بھری کسی بات کو بھی بغیر جام ہوا میں بلند کیے نہیں سنا جا سکتا۔

''آپ بڑے دل والے ایک نیک آدمی ہیں۔'' میں نے کہا، ''آج آپ نے جو کیا، اس بارے میں لوگ چاہے کچھ بھی کہیں، اور مجھے یقین ہے لوگ بہت کچھ کہیں گے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک مبلغ کی حیثیت سے یہ آپ کی بہادری ہے کہ آپ یہاں مے خانے میں آئے اور ہمارے بارے میں کوئی رائے یا فیصلہ دیے بغیر ہم سب سے گفتگو کی۔''

مولانا رومی نے مجھے دوستانہ نگاہوں سے دیکھا۔ پھر اُنہوں نے شراب کی صراحیاں اٹھائیں، جنہیں انہوں نے چھوا تک نہ تھا اور باہر شام کی ہوا میں نکل گئے۔

علاؤالدین

قونیہ،فروری1246ء

بے قراری کے عالم میں پچھلے تین ہفتے سے میں کسی درست لمحے کے انتظار میں ہوں کہ اپنے والد سے کیمیا سے شادی کے لیے اس کا ہاتھ مانگ سکوں۔ میں نے ایک ہی جملہ بار بار بدل کر دہراتے ہوئے اپنے خیالوں میں ان سے گھنٹوں بات کی ہے، اس تلاش میں کہ کیسے اپنے دل کی بات کا اظہار بہتر طور پر کرسکوں۔ ان کے ایسے ہر ممکنہ اعتراض کا جواب میں نے تیار کر رکھا تھا جو وہ کرتے۔ اگر انہوں نے کہا کہ کیمیا اور میں بھائی بہنوں کی طرح تھے تو میں اُنھیں یاد دلاؤں گا کہ ہمارا خون کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ میرے والد، کیمیا سے کتنی محبت کرتے تھے، میں یہ بھی کہنے کا سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ہماری شادی کروا دیتے تو اسے اس گھر سے کہیں اور جا کر نہ رہنا پڑے گا اور یوں وہ عمر بھر ہمارے ساتھ رہ سکتی تھی۔ میں نے سب کچھ پہلے سے سوچ رکھا تھا، سوائے اس کے کہ مجھے اپنے والد سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہ مل پا رہا تھا۔

لیکن پھر آج شام میرا اُن سے بدترین ممکنہ طریقے سے آمنا سامنا ہوا۔ میں اپنے دوستوں سے ملنے باہر جا رہا تھا جب دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور میرے والد اپنے دونوں ہاتھوں میں شراب کی صراحیاں تھامے اندر داخل ہوئے۔

میں منہ کھولے ساکت کھڑا رہ گیا۔ ''بابا، آپ یہ کیا اٹھائے ہوئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ، یہ!'' میرے والد نے بغیر کسی خجالت کے کہا: ''یہ مے سرخ ہے، میرے بیٹے۔''

''کیا ایسا ہی ہے؟'' میں نے بے ساختہ کہا، ''کیا ایک عظیم مولانا اب ایسے بن گئے ہیں؟ شراب سے پُرجوش ایک بوڑھے آدمی؟''

''زبان سنبھال کر بات کرو۔'' میرے عقب سے ایک خفگی بھری آواز ابھری۔

وہ شمس تبریز تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر میرے چہرے پر نظریں جمائے اس نے کہا، ''اپنے والد

سے بات کرنے کا یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں۔ میں تھا جس نے انہیں یہ مے خانے سے لانے کا کہا تھا۔"

"مجھے حیرت کیوں نہیں ہوئی؟" میں اپنی استہزائیہ مسکراہٹ روک نہ پایا۔

اگر شمس تبریز میرے الفاظ پر مشتعل ہوا بھی تھا تو اُس نے ظاہر نہ کیا۔ "علاؤالدین، ہم اس بارے میں بات کر سکتے ہیں۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا، "لیکن اگر تم غصے اور برہمی کو اپنی بصیرت دھندلانے نہ دو تو۔" پھر اُس نے اپنا سر ترچھا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اپنا دل نرم کرنا چاہیے۔

"یہ اصولوں میں سے ایک ہے۔" اُس نے کہا، "اگر تم اپنے ایمان کی مضبوطی چاہتے ہو تو تمہیں اپنے باطن کو نرم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ایمان وعقیدے کو مضبوط بنانے کے لیے، دل کو کسی طائر کے پر کی طرح نرم و نازک ہونا چاہیے۔ بیماری، حادثے، نقصان یا خوف، کسی بھی صورت، ہم سب کا سامنا ایسے واقعات سے ہوتا ہے جو ہمیں سکھاتے ہیں کہ خود غرضی اور دوسروں کے بارے رائے زنی سے کیسے بچا جائے اور زیادہ دردمند اور مہربان کیسے بنا جائے۔ تاہم، ہم میں سے کچھ لوگ سبق سیکھتے اور نرم مزاج بن جاتے ہیں جب کہ باقی لوگ پہلے سے زیادہ سخت مزاج ہو جاتے ہیں۔ حق کے قریب ہونے کا یہی واحد راستہ ہے کہ اپنے قلب کو کشادہ کر لیا جائے تاکہ اس میں تمام انسانیت سما سکے اور پھر بھی اس میں مزید عشق کی جگہ باقی رہے۔"

"تم اس معاملے سے دور رہو۔" میں نے کہا، "میں شرابی درویشوں سے حکم نہیں لیتا۔ یعنی اپنے بابا کی طرح نہیں۔"

"علاؤالدین، شرم کرو۔" میرے والد غصے سے پھٹ پڑے۔

مجھے فوراً احساسِ خطا ہوا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ بہت سی خلفشاں جو میرا خیال تھا کہ میں پیچھے ماضی میں چھوڑ آیا تھا، واپس لوٹ آئیں۔

"مجھے کوئی شک نہیں کہ تم مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتے ہو جتنی تم ظاہر کرتے ہو۔" شمس تبریز نے گویا اعلان کیا، "لیکن میرا نہیں خیال کہ تم نے ایک لمحے کو بھی اپنے والد سے محبت کرنا چھوڑی ہو۔ کیا تمہیں سمجھ نہیں آتی کہ تم انہیں دکھ دے رہے ہو؟"

"کیا تمہیں سمجھ نہیں آتی کہ تم ہماری زندگیاں برباد کر رہے ہو؟" میں نے جوابی وار کیا۔

تبھی تھا کہ میرے والد اپنے لب بھینچے، اپنا دایاں ہاتھ اٹھائے تیزی سے آگے بڑھے۔ میں سمجھا کہ وہ مجھے طمانچہ مارنے کو تھے، لیکن جب انہوں نے طمانچہ نہ مارا، وہ طمانچہ مار نہ سکے، تو میرا اضطراب سوا ہو گیا۔

"تم نے مجھے شرمندہ کر دیا۔" میرے والد نے میرے چہرے کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے اپنا رخ موڑا تو اچانک میرا آمنا سامنا کیا سے ہو گیا۔ وہ کب سے وہاں ایک گوشے میں کھڑی خوف بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی؟ اس تکرار کا کتنا

حصہ وہ سن چکی تھی؟

اپنے والد کے ہاتھوں اُس لڑکی کے سامنے ذلت اٹھانے کی شرم جس سے میں شادی کرنا چاہتا تھا، اس پر میرے پیٹ میں بل پڑے اور میرا منہ کسی تلخ ذائقے سے بھر گیا۔ مجھے پورا کمرا گھومتا محسوس ہوا جیسے وہ میرے اوپر آ گرے گا۔

وہاں مزید ایک لمحہ بھی رکنے کے ناقابل، میں نے اپنا چغہ اٹھایا، شمس کو پرے دھکیلا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا، کمیا سے دور، اُن سب سے دُور۔

شمس

قونیہ، فروری 1246ء

بادۂ سرخ کی صراحیاں، سوندھی مٹی، جنگلی جڑی بوٹیوں اور سیاہ بیروں کی خوشبو سے بھری ہمارے درمیان دھری تھیں۔ علاؤالدین جا چکا تھا، مولانا رومی اس قدر افسردہ تھے کہ کچھ دیر تو کوئی بات ہی نہ کر پائے۔ ہم دونوں باہر برف سے ڈھکے صحن میں نکل آئے۔ وہ ماہِ فروری کی اُن خنک اور بے کیف شاموں میں سے ایک تھی جب فضا کسی خاص سکوت سے بوجھل محسوس ہوتی تھی۔ ہم بادلوں کو حرکت کرتے، اُس دنیا کو سنتے وہاں کھڑے رہے جس کے پاس سوائے خاموشی کے ہمیں دینے کو کچھ نہ تھا۔ ہوا دُور دراز کے جنگلوں کی خوشبوؤں سے لدے جھونکے ہم تک لائی اور لمحے بھر کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم دونوں ہی اس شہر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

پھر میں نے شراب کی ایک صراحی اٹھائی۔ میں گلاب کی بیل کے قریب جھکا جو برف سے لدی اور بے برگ و بار اور خار سے بھری تھی، اور اس کے نیچے مٹی میں شراب انڈیل دی۔ نیم متفکر اور نیم پُرجوش مسکراہٹ سے مولانا رومی کا چہرہ روشن ہو گیا۔

آہستگی سے حیرت انگیز طور پر گلاب کو جیسے زندگی مل گئی، اس کی ٹہنیوں کی چھال انسانی جلد کی طرح نرم ہو گئی۔ ہماری نگاہوں کے سامنے اُس پر ایک تنہا گلاب کھل گیا۔ جیسے جیسے میں نے پودے کی جڑ میں مے سرخ انڈیلی، گلاب ایک خوب صورت نارنجی رنگ آشکار کرتا چلا گیا۔

اس کے بعد میں نے شراب کی دوسری صراحی اٹھائی اور اسی طرح انڈیل دی۔ گلاب کا نارنجی رنگ، زندگی سے فروزاں، شوخ قرمزی رنگ میں ڈھل گیا۔ اب صراحی میں جام بھر شراب باقی رہ گئی۔ میں نے اُسے پیالے میں انڈیلا، آدھی خود پی لی اور باقی مولانا رومی کو پیش کی۔

اُنہوں نے جواب میں مہربانی اور جمع خاطر کا مظاہرہ کرتے مسکراتے چہرے مگر کانپتے ہاتھوں کے ساتھ پیالہ تھام لیا، اِس آدمی نے جس نے زندگی بھر کبھی مے یا کسی نشے کو چھوا تک نہ تھا۔

''مذہبی قوانین اور ممنوعات اہم ہیں۔'' اُنہوں نے کہا، ''لیکن اُنہیں مسلمہ تحریمات میں نہیں بدل دینا چاہیے۔ اس آگہی کے ساتھ میں اُس مئے سرخ کو پیتا ہوں جو آج آپ نے مجھے پیش کی ہے، پورے دل سے یہ یقین رکھتے ہوئے کہ محبت کے خمار سے پرے متانت ہے۔''

جیسے ہی مولانا رومی پیالے کو اپنے لبوں تک لے جانے کو تھے، میں نے پیالہ واپس چھین کر اسے زمین پر پھینک دیا۔ مئے سرخ برف پر یوں اچھل کر گری جیسے خون کے قطرے۔

''مت پیجئے اسے۔'' اس آزمائش کو مزید جاری رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔

''اگر آپ مجھے مئے سرخ پینے کا نہیں کہنا چاہتے تھے تو آپ نے مجھے مے خانے بھیجا ہی کیوں؟'' مولانا رومی نے ایسے لہجے میں پوچھا جو تجسس ہونے سے زیادہ مہربان تھا۔

''آپ جانتے ہیں کہ کیوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا، ''روحانی نشوونما محض چند مخصوص پہلوؤں کے بارے وہم سے نہیں بلکہ ہمارے شعور کی کُلی مجموعیت سے متعلق ہے۔ اصول نمبر بتیس: بندے اور رب کے درمیان کچھ بھی حائل نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی امام، پادری، ربی یا کوئی بھی اخلاقی یا مذہبی قیادت کا نگران یا رکھوالا، کوئی نہیں۔ کوئی روحانی رہنما یا مرشد نہ ہی حتیٰ کہ آپ کا اپنا عقیدہ ہی۔ اپنی اقدار اور قوانین کا خود یقین ضرور رکھیں، لیکن انہیں دوسروں پر حکماً نافذ مت کریں۔ اگر آپ دوسروں کے دل توڑتے رہیں تو آپ چاہے مذہبی فرائض کے کتنے ہی پابند ہوں، اس سب کا کوئی فائدہ نہیں۔

ہر قسم کی بت پرستی سے دُور رہیں کیوں کہ یہ آپ کی بصیرت دھندلا دے گی۔ صرف اور صرف اللہ کو ہی اپنا رہنما بنائیں۔ حق کو جانیں میرے دوست، لیکن خیال رہے کہ سچائیوں کو اپنا خبط مت بنالیں۔''

میں نے مولانا رومی کی شخصیت کو ہمیشہ سراہا تھا اور جانتا تھا کہ ان کی لامحدود اور غیر معمولی دردمندی تھی جس کی میری زندگی میں کمی تھی۔ البتہ آج میری ان کے لیے تحسین وستائش بے پناہ بڑھ گئی تھی۔

دنیا، دولت، شہرت یا طاقت کے حصول کے جنون کا شکار لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ انہیں جتنی کامیابی ملے، اتنی ہی اُن کی طلب بڑھ جاتی تھی۔ یہ لالچی اور حریص لوگ دنیاوی ساز وسامان کو ہی اپنا قبلہ سمجھ کر اسی کا طواف کرتے رہتے ہیں، بے خبر کہ جن چیزوں کی انہیں بھوک تھی، انہی کے وہ غلام بن چکے تھے۔ یہ معمول کا عمل تھا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ لیکن ایسا رونما ہونا معمول نہ تھا، یہ یاقوت احمر کی طرح نایاب امر تھا کہ کوئی شخص جو بلند رتبے کو پہنچ چکا ہو، کوئی شخص جس کے پاس دولت، شہرت اور طاقت وحکم ہو، وہ اپنے رتبے سے دستبردار ہو جائے اور اپنی نیک نامی کو اپنے باطن کے سفر کے لیے داؤ پر لگا دے، ایسا سفر جس کے بارے میں کوئی نہ بتا سکتا ہو کہ اس کا انجام کہاں اور کیسے ہوگا۔ مولانا رومی وہ در نایاب تھے۔

''خدا چاہتا ہے کہ ہم منکسر المزاج اور عاجز بندے بنیں۔'' میں نے کہا۔

''اور وہ چاہتا ہے کہ اُسے پہچانا جائے۔'' مولانا رومی نے دھیرے سے میری بات میں اضافہ کیا۔ ''وہ چاہتا ہے کہ ہم اُسے اپنے وجود کے ہر ریشے سے پورے حواس سے پہچانیں۔ اسی لیے خمار آلود اور غنودہ رہنے سے بہتر ہے کہ ہم باخبر اور مستعد رہیں۔''

میں نے ان کی بات سے اتفاق کیا۔ اندھیرا گہرا ہونے اور سردی بڑھنے تک ہم وہیں صحن میں اپنے درمیان گلاب کا تنہا پھول لیے بیٹھے رہے۔ شام کی خنکی کے پردے میں کوئی تازہ و شیریں خوشبو تھی۔ مئے عشق کے خمار میں ہمارے سر ہولے سے چکرانے لگے اور مسرت و تشکر سے مجھے ادراک ہوا کہ ہوا میں اب مزید ناامیدی کی سرگوشی نہ تھی۔

ایلا

نارتھمپٹن، 24 جون 2008ء

''بے بی، شہر میں ایک نیا تھائی ریسٹورنٹ کھلا ہے۔'' ڈیوڈ نے کہا، ''لوگ کہتے ہیں کہ بہت خوب ہے۔ کیوں نہ ہم آج رات وہاں چلیں؟ صرف ہم دونوں۔''

منگل کے اُس روز وہ آخری کام جو ایلا کرنا چاہتی، وہ تھا اپنے شوہر کے ساتھ ڈنر پر کہیں باہر جانا۔ لیکن ڈیوڈ نے اس قدر اصرار کیا کہ وہ منع نہ کرسکی۔

سلور مون، سٹائلش لیمپس، لیدر بوتھ، سیاہ نیپکن اور ہر دیوار پر آویزاں بہت سارے آئینوں والا ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا، اتنے آئینے کہ گاہکوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ خود اپنے عکس کے ہمراہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ایلا کو وہاں خود کے بے جگہ محسوس کرنے میں دیر نہ لگی۔ لیکن یوں محسوس کرنے کا سبب ریسٹورنٹ نہ تھا۔ وہ سبب اُس کا شوہر تھا۔ اُسے ڈیوڈ کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک دکھائی دی تھی۔ کچھ تھا جو نارمل نہ تھا۔ وہ کچھ سوچ میں اور دلگیر دکھائی دیا... حتیٰ کہ پریشان۔ ایلا کو جو سب سے زیادہ پریشانی ہوئی، یہ کہ چند بار وہ ہکلایا بھی۔ ایلا جانتی تھی کہ ڈیوڈ کی بچپن کی اس لکنت کا یوں سامنے آنا اسی باعث ہوسکتا تھا کہ وہ بہت پریشان تھا۔

روایتی ملبوس پہنے ایک نوجوان ویٹرس اُن سے آرڈر لینے کے لیے آئی۔ ڈیوڈ نے ChiliBasil Scallops کا جب کہ ایلا نے اپنی چالیسویں سالگرہ پر کیے گوشت سے اجتناب کے عزم پر قائم رہتے سبزیوں اور کوکونٹ ساس میں Tofu کا آرڈر دیا۔ انہوں نے وائن بھی منگوائی۔

کچھ دیر وہ وہاں کی نفیس آرائش پر باتیں کرتے رہے، سیاہ اور سفید نیپکن کے فرق اور اثر پر۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ شادی کے بیس سال، ایک ہی بستر پر سونے کے بیس سال، ایک ہی شاور، ایک جیسا کھانا کھانے، تین بچوں کو پروان چڑھانے کے بیس برس... اور ان سب کا مجموعہ اس خاموشی کی صورت میں نکلا تھا۔ یا ایسا ایلا کا خیال تھا۔

''میں نے دیکھا کہ تم آج کل رومی کو پڑھ رہی ہو۔'' ڈیوڈ نے تبصرہ کیا۔

ایلا نے اپنا سر ہلایا، اگرچہ حیران ہوتے ہوئے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ کس بات نے اُسے زیادہ حیران کیا تھا: یہ سننا کہ ڈیوڈ، مولانا روم کو جانتا تھا یا پھر یہ کہ اُسے پرواہ تھی کہ وہ کیا پڑھ رہی تھی۔

''میں نے ''دلکش کفر'' پر رپورٹ لکھنے میں مدد کی خاطر مولانا رومی کی شاعری پڑھنی شروع کی، لیکن پھر مجھے اس میں دلچسپی پیدا ہو گئی، اور اب اُسے خود سے پڑھ رہی ہوں۔'' ایلا نے گویا وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

ڈیوڈ کی توجہ میز پوش پر وائن کے داغ کی طرف چلی گئی، پھر نے اپنے چہرے پر الوداعی تاثرات کے ساتھ گہری سانس بھری۔ ''ایلا، میں جانتا ہوں کہ کیا چل رہا ہے۔'' اُس نے کہا، ''میں سب کچھ جانتا ہوں۔''

''تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟'' ایلا نے پوچھا، اگرچہ اُسے یقین نہ تھا کہ وہ اس بات کا جواب سننا بھی چاہتی تھی۔

''کس بارے میں... میں تمہارے افیئر کی بات کر رہا ہوں...'' ڈیوڈ ہکلایا، ''میں اس کے بارے میں باخبر ہوں۔''

ایلا نے حیران و ششدر ہو کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ شمع کی روشنی میں، جو ویٹرس ابھی ابھی اُن کے لیے روشن کر گئی تھی، ڈیوڈ کے چہرے پر خالص مایوسی تھی۔

''میرا افیئر؟!'' ایلا نے بلا ارادہ تیزی سے اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ اُس نے فوراً ہی برابر کی میز پر بیٹھے جوڑے کو رُخ موڑ کر اُن کی جانب دیکھتے پایا۔ خجل ہو کر اُس نے اپنی آواز سرگوشی میں بدلتے دہرایا، ''کون سا افیئر؟''

''میں احمق نہیں ہوں۔'' ڈیوڈ نے کہا، ''میں نے تمہارا ای میل اکاؤنٹ چیک کیا اور اُس آدمی کے ساتھ تمہاری ای میلز کا تبادلہ پڑھ لیا تھا۔''

''تم نے کیا کیا؟'' ایلا نے بے ساختہ پوچھا۔

سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے، ڈیوڈ کا چہرہ اس بات کے بوجھ تلے مسخ ہو گیا جو وہ کہنے جا رہا تھا۔ ڈیوڈ نے کہا، ''میں تمہیں الزام نہیں دیتا، ایلا۔ میں اسی کا مستحق ہوں۔ میں نے تمہیں نظر انداز کیا اور تم کہیں اور محبت تلاش کرنے لگیں۔''

ایلا نے نظریں اپنے گلاس پر جھکا لیں۔ وائن کا رنگ دلکش تھا... گہرا احمریں رنگ۔ لمحے بھر کو اُسے لگا کہ اُس کی سطح پر اسے جھلملاتے دھنک رنگوں کی جھلک دکھائی دی تھی، جیسے اُس کی رہنمائی کرتی رنگین روشنی کی لکیروں کا راستہ۔ اور شاید وہاں راستہ موجود تھا۔ وہ سب ورائے حقیقت محسوس ہوا۔

اب ڈیوڈ نے توقف کیا، یہ فیصلہ کرتے ہوئے کہ جو کچھ اُس کے ذہن میں تھا، اس کا اظہار

اسے کرنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔ ''میں تمہیں معاف کرنے اور یہ سب بھولنے کو تیار ہوں۔'' بالآخر اُس نے کہا۔

اُس لمحے ایلا بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، استہزا سے بھری اور تلخ وتیکھی، تناؤ بھری اور ڈرامائی باتیں، لیکن اُس نے آسان ترین کا انتخاب کیا۔ چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس نے پوچھا، ''اپنے افیئرز کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا تم اُنہیں بھی ماضی میں پیچھے چھوڑ دو گے؟''

تبھی ویٹرس اُن کا کھانے کا آرڈر لے آئی۔ ایلا اور ڈیوڈ بیٹھے اُسے مبالغہ آمیز خوش اخلاقی سے پلیٹیں لگاتے اور گلاس بھرتے دیکھتے رہے۔ اس کے آخر کار جانے کے بعد، ڈیوڈ نے ایلا کی جانب نگاہیں اٹھائیں اور پوچھا، ''سو یہ سارا معاملہ تھا؟ تم نے انتقاماً ایسا کیا؟''

''نہیں۔'' ایلا نے اپنا سر مایوسی سے نفی میں ہلاتے کہا، ''اس کا انتقام سے کوئی لینا دینا نہیں۔ کبھی نہ تھا۔''

''پھر اس کا تعلق کس سے ہے؟''

ایلا نے اپنے ہاتھ باندھے، یوں محسوس کرتے جیسے ریسٹورنٹ میں ہر شے اور ہر شخص... گاہک، ویٹرز، کک، حتیٰ کہ فش ٹینک میں تیرتی حاری مچھلیاں بھی... اچانک ساکت ہو گئے ہوں کہ وہ کیا کہنے جا رہی تھی۔

''یہ محبت ہے۔'' آخر کار اُس نے کہہ دیا، ''مجھے عزیز سے محبت ہے۔''

ایلا کو توقع تھی کہ اُس کا شوہر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جائے گا۔ لیکن آخر جب اُسے ڈیوڈ کی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت ہوئی تو اس کے چہرے پر صرف خوف تھا، جس کی جگہ فوراً ہی کسی ایسے شخص کے تاثرات نے لے لی جو کم سے کم نقصان کے ساتھ مسئلہ حل کرنا چاہ رہا ہو۔ اچانک ہی اُس پر ادراک کا لمحہ اُترا۔ ''محبت'' ایک بے حد سنجیدہ لفظ تھا، گراں بار اور خاصا غیر معمولی اُس کے لیے... وہ جس نے ماضی میں محبت کے بارے میں بہت سی منفی باتیں کہی تھیں۔

''ہمارے تین بچے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اپنے دھیمے پڑتے لہجے میں کہا۔

''ہاں، اور مجھے اُن سے بہت محبت ہے۔'' ایلا نے اپنے کندھے ڈھیلے چھوڑتے کہا، ''لیکن مجھے عزیز سے بھی محبت ہے...''

''یہ لفظ استعمال کرنا بند کرو۔'' ڈیوڈ نے اس کی بات قطع کی۔ دوبارہ بولنے سے پہلے اُس نے اپنے گلاس سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ ''مجھ سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں، لیکن میں نے تم سے محبت کرنا کبھی نہیں چھوڑا، ایلا۔ اور میں نے کبھی کسی دوسری عورت سے محبت نہیں کی۔ ہم دونوں اپنی کوتاہیوں سے سیکھ سکتے ہیں۔ اپنی طرف سے میں تم سے وعدہ کر سکتا ہوں کہ ایسا دوبارہ کبھی نہیں ہوگا۔ تمہیں باہر نکل کر محبت تلاش کرنے کی مزید ضرورت نہیں۔''

''میں محبت کی تلاش میں کہیں باہر نہیں گئی۔'' ایلا نے زیرِ لب، اس سے زیادہ خود سے مخاطب ہوتے کہا، ''رومی کہتے ہیں، ہمیں محبت کو اپنے باہر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں بس اپنے اندر سے اُن رکاوٹوں کو ختم کرنا ہے کہ جو ہمیں محبت سے دُور رکھتی ہیں۔''

''اوہ میرے خدا! تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم ایسی تو نہ تھیں! اتنی رومان پسند بننا بند کرو۔ پرانی ایلا بن جاؤ۔'' ڈیوڈ نے تلملا کر کہا اور پھر بولا، ''پلیز!''

ایلا نے تیوری چڑھا کر اپنے ناخنوں کا جائزہ لیا، یوں جیسے اُن سے متعلق اسے کوئی مسئلہ ہو۔ سچ یہ تھا کہ اُسے گزرے وقت کا ایک لمحہ یاد آ گیا تھا جب حقیقتاً اس نے کچھ ایسے ہی الفاظ اپنی بیٹی سے کہے تھے۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اب دائرہ مکمل ہو گیا تھا۔ آہستگی سے اپنا سر ہلاتے اُس نے اپنا نیپکن ایک طرف رکھ دیا۔

''کیا اب ہم واپس چل سکتے ہیں؟'' اُس نے کہا، ''مجھے بھوک نہیں۔''

اُس شب وہ دونوں الگ سوئے۔ اور صبح سویرے، ایلا نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عزیز کو خط تحریر کیا۔

متعصب

قونیہ، فروری 1246ء

''برے وقت کی تیاری کرلو! شیخ یاسین! شیخ یاسین! کیا آپ نے شرم ناک واقعہ سنا؟'' میرے ایک شاگرد کا باپ عبداللہ، گلی میں میری طرف بڑھتے بے ساختہ بولا، ''مولانا روم کو کل یہودی محلے کے مے خانے میں دیکھا گیا ہے!''

''ہاں، میں نے اس بارے میں سنا تھا۔'' میں نے کہا، ''لیکن مجھے یہ سن کر حیرت نہیں ہوئی۔ اُس شخص کی بیوی عیسائی ہے اور اُس کا بہترین دوست کافر۔ تم توقع کر بھی کیا کرسکتے ہو؟''

عبداللہ نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں اسی کی امید رکھنی چاہیے تھی۔''

کئی راہ گیر ہمارے اردگرد اکٹھے ہو کر ہماری باتیں سننے لگے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ مولانا روم کو اب جامع مسجد میں وعظ کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ تب تک نہیں جب تک کہ وہ کھلے عام معافی نہ مانگ لیں۔ میں نے اتفاق کیا۔ مدرسے میں سبق پڑھانے جانے میں مجھے دیر ہو رہی تھی، سو انہیں باتیں کرتے چھوڑ کر میں عجلت میں آگے بڑھ گیا۔

مجھے ہمیشہ سے اس بات کا شبہ تو تھا کہ مولانا رومی کی شخصیت کا کوئی تاریک پہلو تھا جو کسی نہ کسی روز ضرور سامنے آجاتا۔ لیکن مجھے اس کی توقع نہیں تھی کہ وہ صراحی اٹھا لیں گے۔ یہ بالکل نازیبا حرکت تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ مولانا رومی کے اس اخلاقی زوال کا بنیادی سبب شمس تبریز ہے، اور اگر وہ نہ ہو تو مولانا رومی اپنے معمول کی طرف پلٹ آئیں۔ لیکن میرا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ ایسا نہیں کہ مجھے کوئی شبہ تھا کہ شمس تبریز برا انسان ہے... وہ گنہگار ہے... یا یہ کہ اُس کا مولانا رومی پر کوئی منفی اثر نہیں... بالکل ہے... لیکن سوال یہ ہے کہ شمس دوسرے علما کو کیوں نہیں بھٹکا سکا، جیسا کہ مجھے؟ آخر میں بات یہی ہے کہ وہ دونوں اس سے زیادہ ایک جیسے ہیں جتنا لوگ انہیں پہچاننے پر مائل دکھائی دیتے ہیں۔

کچھ لوگ ہیں جنہوں نے شمس تبریز کو یہ کہتے سنا کہ ''کوئی عالم قلم کے لکھے، اس کی لکیروں کے مطابق جیتا ہے جب کہ صوفی محبت کرتا ہے اور نقوشِ قدم پر جیتا ہے!'' اب بھلا اس کا کیا مطلب ہے؟ بہ ظاہر تو یہی کہ شمس سمجھتا ہے کہ عالم صرف باتیں کرتے ہیں جب کہ صوفی حقیقت میں راستہ چلتے ہیں۔ لیکن مولانا رومی بھی تو ایک عالم ہیں، ہے ناں؟ یا پھر وہ خود کو مزید ہم میں سے ایک نہیں سمجھتے؟

اگر شمس تبریز کبھی میرے کمرۂ جماعت میں داخل ہوا تو میں اُسے کسی مکھی کی طرح بھگا دوں، اُسے اپنی موجودگی میں فضول گوئی کا موقع کبھی نہ دوں۔ مولانا رومی ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ یقیناً ان کے معاملے میں کچھ نہ کچھ غلط ہے۔ جو لوگ اس بات سے واقف نہیں، انہیں بتا دوں کہ اُن کی بیوی عیسائی ہے۔ مجھے پرواہ نہیں کہ اُس نے اسلام قبول کیا یا نہیں۔ یہ اُس کے اور اُس کے بچے کے خون میں شامل ہے۔ بدقسمتی سے، شہر کے لوگ عیسائیت کے خطرے کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیتے جیسے لینا چاہیے اور وہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ ہم ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں۔ لوگ جو اتنے سادہ لوح ہیں کہ اس بات پر یقین کر لیں، میں ان سے ہمیشہ کہتا ہوں، ''کیا پانی اور تیل کبھی باہم حل ہو سکتے ہیں؟ مسلمان اور عیسائی بھی باہم اسی حد تک حل کر رہ سکتے ہیں!''

عیسائی بیوی اور اقلیتوں کے لیے دل میں علانیہ نرم گوشہ رکھنے کے باعث، میری نگاہ میں مولانا رومی پہلے ہی ناقابلِ اعتبار شخص تھے، لیکن جب سے شمس تبریز ان کی چھت تلے رہنے لگا ہے، وہ راہِ مستقیم سے پوری طرح منحرف ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ میں روزانہ اپنے شاگردوں کو بتاتا ہوں کہ ہمیں شیطان سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔ اور شمس مجسم شیطان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا رومی کو مے خانے بھیجنے کا خیال اُسی کو آیا ہوگا۔ خدا ہی جانے اُس نے مولانا رومی کو کیسے قائل کیا ہوگا۔ لیکن کیا شیطان، متقیوں کو صراطِ مستقیم سے بھٹکانے میں ہی مہارت نہیں رکھتا؟

میں ابتدا ہی سے شمس تبریز کی شخصیت کا برا پہلو پہچان گیا تھا۔ اُسے جرأت کیسے ہوئی کہ وہ حضرت محمد ﷺ کا موازنہ ایک بے دین صوفی بسطامی سے کرے؟ کیا بسطامی ہی نے دعویٰ نہ کیا تھا، ''مجھے دیکھو! میری شان اعلیٰ ہے!'' کیا وہی نہیں تھا جس نے پھر کہا، ''میں کعبہ کو اپنا طواف کرتے دیکھتا ہوں''؟ وہ شخص تو دعوے میں اس قدر بڑھ گیا، ''اپنی ذات کا آہن گر میں خود ہی ہوں۔'' اگر یہ کفر نہیں تو کیا ہے؟ ایسے شخص کی باتیں شمس تبریز احترام و عقیدت سے بیان کرتا ہے۔ کیوں کہ بسطامی کی طرح، وہ خود بھی کافر ہی ہے۔

واحد اچھی بات یہ ہے کہ شہر کے لوگوں پر اب سچائی عیاں ہو رہی ہے۔ بالآخر! ہر گزرتے دن کے ساتھ شمس تبریز کے کے ناقدوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور لوگ کیا باتیں کرتے ہیں! بعض اوقات تو میں بھی سن کر دہشت زدہ رہ جاتا ہوں۔ حمام اور چائے خانوں میں، گندم کے کھیتوں اور باغات میں، لوگ اُس کے پرزے اڑا رہے ہیں۔

☼

میں معمول سے ذرا دیر سے مدرسے پہنچا، میرا ذہن ان سوچوں سے بوجھل ہو رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنے کمرۂ جماعت کا دروازہ کھولا، مجھے محسوس ہوا کہ کچھ معمول کے برخلاف تھا۔ میرے طلبا زرد چہروں کے ساتھ سیدھی قطار میں بیٹھے تھے، عجیب طور پر خاموش، یوں جیسے ان سب کو کوئی بھوت دکھائی دے گیا ہو۔

پھر میں سمجھ گیا کہ ایسا کیوں تھا۔ کھڑکی کے قریب، دیوار سے ٹیک لگائے، ایک تکبر بھری مسکراہٹ سے روشن بے بال چہرہ لیے، کوئی اور نہیں وہ شمس تبریز تھا۔

''سلام علیکم، شیخ یاسین۔'' کمرے کے دوسرے سرے سے مجھے غور سے گہری نظروں سے دیکھتے اس نے کہا۔

میں ہچکچایا کہ اسے سلام کا جواب دوں یا نہیں، پھر میں نے جواب نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کی بجائے میں اپنے طلبا کی جانب مڑا اور پوچھا، ''یہ آدمی یہاں کیا کر رہا ہے؟ تم نے اسے اندر گھسنے کیوں دیا؟''

بدحواس اور گھبرائے ہوئے طلبا میں سے کسی میں بھی جواب دینے کی جرأت نہ تھی۔ وہ شمس ہی تھا جس نے اس سکوت کو توڑا۔

مجھ پر اپنی نگاہیں جمائے اپنے گستاخ لہجے میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا، ''انہیں سرزنش مت کیجیے، شیخ یاسین۔ میں نے خود ہی یہاں آنے کا سوچا۔ میں قریب سے گزر رہا تھا کہ مجھے خیال آیا، کیوں نہ مدرسہ جاؤں اور اُس شخص سے جا کر ملوں جو شہر بھر میں سب سے بڑھ کر مجھ سے نفرت کرتا ہے؟''

حسام، طالب علم

قونیہ، فروری 1246ء

بے حد ہشیار اور چوکس ہم سب کمرۂ جماعت کے فرش پر بیٹھے تھے جب دروازہ کھلا اور شمس تبریز اندر داخل ہوئے۔ سب ہی حیران و ششدر رہ گئے۔ زیادہ تر اپنے شیخ سے، اُن سے متعلق اتنی بری اور بھونڈی باتیں سن رکھنے کے بعد، اُنہیں بہ ذاتِ خود سامنے پا کر، سب کی طرح میں بھی خود کو خوف سے سمٹنے سے روک نہ پایا۔ تاہم وہ پُرسکون اور دوستانہ دکھائی دیئے۔ ہم سب کو سلام کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ شیخ یاسین سے کوئی بات کرنے وہاں آئے تھے۔

''معلم کو پسند نہیں کہ کمرۂ جماعت میں کوئی اجنبی داخل ہو۔ شاید آپ کو کسی اور وقت ان سے بات کرنی چاہیے۔'' میں نے کسی ناگوار جھگڑے سے بچنے کی امید میں کہا۔

''اتنی فکرمندی کا شکریہ، نوجوان، لیکن بعض اوقات ناگوار جھگڑے سے گریز نہ صرف ناممکن ہوتا ہے بلکہ وہ ضروری ہوتے ہیں۔'' شمس تبریز نے یوں جواب دیا جیسے انہوں نے میری سوچ کو پڑھ لیا ہو۔ ''تم البتہ فکر مت کرو۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

میرے پہلو میں بیٹھے ارشاد نے اپنے بھینچے دانتوں کے ساتھ زیرِ لب کہا، ''اس کی جرأت دیکھو! یہ تو مجسم شیطان ہے۔''

میں نے سر ہلا دیا، اگرچہ شمس تبریز مجھے کوئی شیطان نہ لگے تھے۔ میں ان کے کھرے پن اور بے باکی و جسارت کو پسند کرنے سے خود کو روک نہ پایا۔

کچھ دیر بعد، شیخ یاسین اندر داخل ہوئے، ان کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ انہوں نے ابھی چند قدم ہی اندر بڑھائے تھے کہ رک گئے اور بن بلائے مہمان کی سمت خالی الذہنی سے بغیر پلکیں جھپکائے دیکھنے لگے۔

''یہ آدمی یہاں کیا کر رہا ہے؟ تم نے اسے اندر گھسنے کیوں دیا؟''

میرے دوستوں اور میں نے پریشان نظروں اور خوف بھری سرگوشیوں کا تبادلہ کیا، لیکن اس سے قبل کہ کوئی کچھ کہنے کی ہمت کرتا، شمس تبریز بے ساختہ کہنے لگے کہ وہ قریب سے گزر رہے تھے کہ انہیں خیال آیا، کیوں نہ مدرسہ جائیں اور اُس شخص سے جا کر ملیں جو قونیہ میں اُن سے سب سے بڑھ کر نفرت کرتا تھا!

میں نے کئی طالب علموں کو بے چینی سے کھنکارتے سنا اور ارشاد نے گہری سانس بھری۔ دونوں آدمیوں میں تناؤ اس قدر کثیف تھا کہ کمرے کی فضا کو چاقو سے چیرا جا سکتا تھا۔

''میں نہیں جانتا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو، لیکن میرے پاس تم سے بات کرنے سے بہتر کئی کام ہیں۔'' شیخ یاسین نے ڈانٹ کر کہا، ''اب، تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے تاکہ ہم اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں؟''

''آپ کا کہنا ہے کہ آپ مجھ سے بات نہیں کریں گے، لیکن آپ میرے متعلق تو باتیں کرتے رہے ہیں۔'' شمس تبریز نے جواب دیا، ''آپ مسلسل میرے اور مولانا رومی کے بارے بدگوئی سے کام لے رہے ہیں اور تصوف کی راہ پر چلنے والے صوفیوں کے بارے میں بھی۔''

شیخ یاسین نے اپنی بڑی سی استخوانی ناک سے سونگھا اور ہونٹوں کو یوں سکیڑا جیسے ان کی زبان تلے کوئی کڑوی شے آ گئی ہو۔ ''جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، مجھے تم سے کسی بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ جو ضروری ہے وہ میں پہلے سے جانتا ہوں، میری اپنی رائے ہے۔''

شمس تبریز ایک تیز اور زہرخند نگاہ کے ساتھ ہماری جانب مڑے۔ ''بہت سی آراء اور کسی سوال کے بغیر ایک شخص! اس سلسلے میں کچھ بہت ہی غلط ہے۔''

''واقعی؟'' شیخ یاسین نے قدرے جوش بھرے اور محظوظ لہجے میں کہا، ''پھر ہم ان طالب علموں سے کیوں نہیں پوچھتے کہ وہ کیا بننا چاہیں گے: کوئی دانا شخص جو صاحب علم ہو اور جوابات جانتا ہو یا پھر کوئی بدحواس شخص جس کے پاس سوائے سوالات کے کچھ نہ ہو؟''

میرے سب دوستوں نے شیخ یاسین کی طرف داری کی، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ بیشتر لڑکوں نے کسی مخلصانہ اتفاق کی بجائے محض اپنے استاد کی حمایت کے لیے ایسا کیا تھا۔ میں نے خاموش رہنے کا انتخاب کیا۔

''کوئی شخص جو یہ سمجھتا ہو کہ اُسے ہر جواب معلوم ہے، وہ سب سے بڑا جاہل ہے۔'' شمس تبریز نے ہولے سے کندھے اچکاتے کہا اور ہمارے معلم کی جانب مڑے۔ ''لیکن کیوں کہ آپ کو سب معلوم ہے، کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟''

تب مجھے کچھ پریشانی شروع ہوئی کہ وہ گفتگو جانے کدھر کا رخ کر رہی تھی۔ لیکن اس بڑھتے تناؤ کو ختم کرنے کو میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔

''چوں کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ میں شیطان کا پیروکار ہوں، کیا آپ برائے مہربانی ہمیں بتانا پسند کریں گے کہ آپ کے خیال میں شیطان کیا ہے؟'' شمس تبریز نے پوچھا۔

''بالکل۔'' شیخ یاسین نے کہا، جو تبلیغ کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے تھے۔ ''ہمارا مذہب، ابراہیمی مذاہب میں سب سے آخری اور بہترین ہے، یہ ہمیں بتاتا ہے کہ شیطان ہی نے آدمؑ اور حوّا کو جنت سے نکلوایا تھا۔ اُن راندۂ درگاہ والدین کی اولاد ہونے کے باعث، ہم سب کو ہوشیار رہنا چاہیے کیوں کہ شیطان مختلف بھیس میں نمودار ہوتا ہے۔ کبھی وہ جواری کی صورت میں ہمیں قمار بازی کی دعوت دیتا ہے، کبھی وہ کسی حسین عورت کے روپ میں ہمیں بہکاتا ہے... شیطان ایسے بھیس میں ہوسکتا ہے جس کی ہمیں سب سے کم توقع ہو، جیسا کہ کوئی سرگرداں درویش۔''

جیسے اسی جواب کی توقع میں، شمس تبریز عمداً مسکرائے۔ ''میں سمجھ گیا کہ آپ کا کیا مطلب ہے۔ بڑا سکون ملتا ہوگا اور بڑی آسانی ہوتی ہوگی یہ سوچ کر کہ شیطان ہمیشہ ہمارے باہر ہی ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' شیخ یاسین نے پوچھا۔

''اگر شیطان اتنا ہی مکار اور بے قابو اور منہ زور ہے، جتنا آپ کا کہنا ہے تو پھر ہم انسانوں کے پاس اپنے بُرے اعمال پر خود کو ذمہ دار ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ زندگی میں جو بھی نیکی اور اچھائی ہو ہم اسے خدا سے منسوب کردیں گے اور ہر گناہ کو شیطان سے۔ بہرصورت، ہم خود ہر تنقید اور اپنی ذات کے احتساب سے مستثنیٰ ہوں گے۔ کس قدر آسان ہے!''

بات کرتے ہوئے شمس تبریز کمرے میں ٹہلنے لگے، ہر لفظ کے ساتھ اُس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ ''لیکن ایک لمحے کو تصور کریں کہ شیطان کا کوئی وجود نہیں۔ کوئی شیاطین ہمیں جہنم کی جھلساتی آگ میں جھونکنے کے منتظر نہیں۔ رگوں میں لہو جما دینے والے یہ سب تصورات ہمیں کچھ دکھانے کو گھڑے گئے ہیں، لیکن پھر وہ گھسی پٹی فرسودہ باتیں بن گئے اور اپنا اصل پیغام کھو بیٹھے۔''

''اور وہ پیغام کیا ہوسکتا تھا؟'' شیخ یاسین نے اپنے بازو سینے پر لپیٹے بیزاری سے پوچھا۔

''آہ، تو آپ کے پاس بھی کوئی سوال تو ہے۔'' شمس تبریز نے کہا، ''پیغام یہ ہے کہ انسان خود کو جس کرب و عذاب میں مبتلا کرسکتا ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں۔ جہنم ہمارے اندر موجود ہیں اور جنت بھی۔ قرآن کا فرمان ہے کہ انسان افضل ترین مخلوق ہے۔ احسن الخالقین بھی ہم ہیں اور اسفل السافلین بھی۔ اگر ہم اس کے مکمل معانی کو گرفت میں لاسکیں تو ہم شیطان کی خود اپنے آپ سے باہر تلاش چھوڑ دیں گے اور اس کی بجائے اپنی توجہ خود پر مرکوز کریں گے۔ ہمیں خلوص سے اپنی خود احتسابی کی ضرورت ہے۔ دوسروں کی خطاؤں کو تلاش کرکے اُن پر داروغہ بننے کی نہیں۔''

''تم جاؤ اور اپنا احتساب کرو، ان شاء اللہ ایک روز تم خود کو نجات دلوا ہی لوگے۔'' شیخ یاسین نے جواب دیا، ''لیکن ایک سچے عالم کو اپنے اردگرد لوگوں پر نظر رکھنی ہی ہوتی ہے۔''

''پھر مجھے ایک قصہ سنانے کی اجازت دیجئے۔'' شمس تبریز نے ایسی تواضع سے کہا کہ ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سنجیدہ تھے یا مذاق کر رہے تھے۔

اور یہ تھا جو انہوں نے ہمیں سنایا:

کسی مسجد میں چار تاجر نماز ادا کر رہے تھے جب انہوں نے مؤذن کو آتے دیکھا۔ پہلے تاجر نے اپنی نماز توڑ دی اور پوچھا، ''مؤذن! کیا اذان ہو چکی ہے؟ یا ابھی ہمارے پاس کچھ وقت ہے؟''

دوسرے تاجر نے نماز توڑی اور اپنے دوست کی طرف مُڑ کر کہنے لگا، ''ارے، تم نماز کی ادائیگی کے دوران بول پڑے۔ تمہاری نماز ضائع ہوگئی۔ تمہیں دوبارہ نماز ادا کرنی چاہیے!''

یہ سن کر، تیسرے تاجر نے مداخلت کی، ''تم اسے کیوں الزام دے رہے ہو، احمق؟ تمہیں اپنی نماز کی پرواہ ہونی چاہیے تھی۔ اب تمہاری نماز بھی ضائع ہوگئی۔''

تب چوتھا تاجر مسکرایا اور بلند آواز میں کہنے لگا، ''انہیں تو دیکھو! ان تینوں نے اپنی نمازیں ضائع کر دیں۔ شکر خدا کا کہ میں گمراہوں میں سے نہیں۔''

یہ قصہ سنا کر شمس تبریز، طلبا کے سامنے کھڑے ہوئے اور پوچھا، ''سو آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کی رائے میں کس تاجر کی نماز ضائع ہوئی؟''

کمرۂ جماعت میں ذرا دیر ہلچل رہی کیوں کہ ہم آپس میں اس جواب پر بات کر رہے تھے۔ آخر پیچھے سے کسی نے جواب دیا، ''دوسرے، تیسرے اور چوتھے تاجر کی نمازیں ضائع ہوگئیں۔ لیکن پہلا تاجر بے گناہ ہے کیوں کہ وہ تو مؤذن سے صرف پوچھنا ہی چاہتا تھا۔''

''ہاں، لیکن اُسے اس طرح نماز ترک نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' ارشاد نے بیچ میں اعتراض اٹھایا۔ ''واضح ہے کہ تمام تاجر ہی غلطی پر تھے، ماسوائے چوتھے کے جو صرف خود کلامی کر رہا تھا۔''

اُن دونوں کے جواب سے اختلاف کرتے میں نے اپنی نگاہ پھیر لی، لیکن میں اپنی زبان بند رکھنے کے لیے پُرعزم تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے خیالات کو شاید پسند نہ کیا جائے۔

لیکن جیسے ہی یہ خیال میرے ذہن سے گزرا، شمس تبریز نے میری طرف اشارہ کیا اور بولے، ''اور تم جو وہاں بیٹھے ہو! تمہارا کیا خیال ہے؟''

بولنے کے قابل ہونے سے پہلے میں نے تھوک نگلی۔ ''ان تاجروں سے غلطی یہ نہیں ہوئی تھی کہ وہ دورانِ نماز بول اٹھے تھے۔'' میں نے کہا، ''بلکہ غلطی یہ تھی کہ اپنے کام سے کام رکھنے اور خدا سے رابطہ قائم کرنے کی بجائے انہیں اس میں زیادہ دلچسپی تھی کہ اُن کے اردگرد کیا ہو رہا تھا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اگر ہم اُن پر کوئی فیصلہ دیں گے تو ہم بھی انہی جیسی قطعی غلطی کا ارتکاب کریں گے۔''

''سو تمہارا جواب کیا ہے؟'' اچانک شیخ یاسین نے اس گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''میرا جواب یہ ہے کہ اُن چاروں تاجروں سے ایک سی غلطی ہوئی، اور پھر بھی اُن میں سے

کسی کو غلط نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ آخر کار یہ فیصلہ دینے کے مجاز ہم نہیں۔''

شمس تبریز نے میری طرف قدم بڑھایا اور مجھے اس قدر شفقت و مہربانی سے دیکھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں والدین کی غیر مشروط محبت سے حظ اٹھاتا کوئی ننھا بچہ تھا۔ اُنہوں نے میرا نام پوچھا اور میرے بتانے پر انہوں نے تبصرہ کیا، ''یہاں تمہارا یہ دوست حسام ایک صوفی قلب رکھتا ہے۔''

یہ سن کر میرے کانوں کی لوئیں تک سُرخ پڑ گئیں۔ کوئی شک نہ تھا کہ بعد میں شیخ یاسین مجھے سرزنش کرتے اور میرے دوست مجھے تضحیک اور مذاق کا نشانہ بناتے۔ لیکن میری ساری فکریں جلد ہی تحلیل ہو گئیں۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھا اور شمس تبریز کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اُنہوں نے جواب میں ایک آنکھ میچی اور مسکراتے ہوئے بیان کرنے لگے۔

''صوفی کہتا ہے کہ مجھے دوسروں سے متعلق رائے دینے کی بجائے خدا سے اپنے باطنی معاملے کی پرواہ ہونی چاہیے۔ تاہم کوئی دقیانوسی عالم ہمیشہ دوسروں ہی میں خامیاں تلاش کرتا رہتا ہے۔ لیکن طالب علمو، یہ فراموش مت کرنا کہ بیشتر اوقات جو شخص دوسروں کے بارے شکایت کناں رہتا ہے، وہی خود غلطی پر ہوتا ہے۔''

''میرے طلبا کے ذہنوں کو الجھانا بند کرو!'' شیخ یاسین نے مداخلت کی۔ ''ایک عالم کی حیثیت سے، ہم دوسروں کے اعمال سے بے پرواہ ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لوگ ہم سے بہت سے سوال پوچھتے اور جوابات کی توقع رکھتے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگیاں اپنے مذہب کے مطابق درست اور بھرپور طریقے سے گزار سکیں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ نکسیر پھوٹ جائے تو کیا دوبارہ وضو کی حاجت ہوتی ہے یا کیا دورانِ سفر روزہ رکھنا ہوگا وغیرہ۔ شافعی، حنفی، حنبلی اور مالکی فقہ، سب کے احکامات ان معاملات پر مختلف ہیں۔ ہر فقہ کے اپنے باریک بیں جوابات ہیں جن کا ہمیں مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔''

''خوب، لیکن ان برائے نام اختلافات سے اس قدر وابستہ بھی مت ہوں۔'' شمس تبریز نے گہری سانس بھری۔ ''کلام اللہ مکمل ہے۔ کُل کو داؤ پر لگا کر جزو یا ذیلی تفصیلات میں مت الجھیں۔''

''جزوی تفصیلات؟'' شیخ یاسین نے تشکک سے دہرایا۔ ''ایمان والے قوانین کو سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ اور ہم عالم ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔''

''رہنمائی کرتے رہیں... یعنی جب تک کہ آپ یہ نہ بھول جائیں کہ آپ کی رہنمائی محدود ہے اور کلام اللہ سے بڑھ کر کچھ نہیں۔'' شمس تبریز نے کہا اور پھر اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگے، ''لیکن جنہیں پہلے ہی آگہی مل چکی ہو، انہیں تبلیغ کی کوشش مت کریں۔ وہ آیات قرآنی سے ایک مختلف مسرت اخذ کرتے ہیں اور یوں انہیں کسی شیخ کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔''

یہ سن کر شیخ یاسین اس قدر برہم ہوئے کہ اُن کے مرجھائے رخسار قرمزی ہو گئے اور اُن کے حلق کی ہڈی اُبھر آئی۔ ''ہم جو رہنمائی کرتے ہیں، اُس میں کچھ بھی عارضی نہیں۔'' اُنہوں نے کہا،

''شریعت ان قوانین وضوابط کا مجموعہ ہے جن کی ہر مسلمان کو پیدائش سے موت تک پیروی کرنی چاہیے۔''

''شریعت محض ایک کشتی ہے جو بحر حق میں رواں ہے۔ راہِ خدا کا سچا سالک جلد یا بدیر اس سے اتر کر سمندر میں چھلانگ لگا دے گا۔''

''تا کہ وہ شکاری مچھلیوں کا لقمہ بن سکے۔'' شیخ یاسین نے ہنستے ہوئے ترکی بہ ترکی کہا، ''یہی ہوتا ہے ایسے شخص کے ساتھ جو رہنمائی لینے سے انکار کرے۔''

کچھ طلبا نے ہنسی میں ان کا ساتھ دیا، لیکن باقی ہم سب بڑھتی ہوئی بے چینی محسوس کرتے ہوئے خاموش رہے۔ سبق کا وقت ختم ہو رہا تھا، اور مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ اس گفتگو کا انجام مثبت طور پر ہو گا۔

شمس تبریز نے بھی یہی ملال محسوس کیا ہو گا کیوں کہ وہ دلگیر بلکہ تقریباً مایوس دکھائی دیے۔ یوں جیسے اچانک اس تمام گفتگو سے تھک کر اُنہوں نے آنکھیں بند کر لیں، اس قدر ہولے سے جنبش کرتے ہوئے جو بالکل نا قابل محسوس تھی۔

''اپنے تمام سفروں میں، میری ملاقات بہت سے شیوخ سے ہوئی۔'' شمس تبریز نے کہا، ''کچھ مخلص تھے، دوسرے متکبر مزاج اور بد اخلاق، اور انہیں اسلام کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔ آج کل کے شیوخ کے سروں کے بدلے میں خدا کے سچے عاشقوں کے پرانے جوتوں کی دھول بھی نہ دوں گا۔ حتیٰ کہ پردے کے پیچھے سایوں کی صورت کرتب دکھانے والے بھی ان سے بہتر ہیں کیوں کہ وہ کم از کم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ دکھاتے ہیں، وہ محض فریب نظر ہے۔''

''بہت ہو گئی! میرا خیال ہے کہ ہم تمہاری دوشاخی زبان سے خاصی بکواس سن چکے ہیں۔'' شیخ یاسین نے گویا اعلان کیا، ''اب، میرے کمرۂ جماعت سے نکل جاؤ!''

''فکر مت کیجیے، میں جانے ہی والا تھا۔'' شمس تبریز نے شرارت بھرے لہجے میں کہا اور پھر ہماری جانب مڑے۔ ''تم لوگوں نے آج جو بھی مشاہدہ کیا، یہ اس قدر پرانی بحث ہے جو حضرت محمد ﷺ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔'' اُنہوں نے بیان کیا، ''لیکن یہ بحث نہ صرف تاریخ اسلام سے متعلق ہے بلکہ یہ ہر ابراہیمی مذہب کے قلب میں موجود ہے۔ یہ عالم اور صوفی، ذہن اور دل کے درمیان نزاع ہے۔ تم سب اپنی مرضی سے انتخاب کرو!''

شمس تبریز نے ذرا توقف کیا کہ ہم اُن کے الفاظ کو مکمل تاثر کے ساتھ محسوس کریں۔ میں نے خود پر بھی اُن کی نگاہ محسوس کی، اور یہ جیسے کسی کو شریک راز کرنے جیسا تھا... کسی اَن کہی، اَن لکھی برادری میں داخلہ۔

پھر انہوں نے مزید کہا، ''آخر میں، تمہارے معلم اور نہ ہی میں، اُس سے زیادہ علم رکھ سکتے تھے، جتنا اللہ ہمیں جاننے کی اجازت دے۔ ہم سب اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر چہ اہمیت صرف

ایک بات کی ہے۔ یہ کہ کسی منکر کے، منکر جو روشنی دیکھنے سے انکار کرے، اس کے نابینا پن سے سورج کی آب وتاب ماند نہیں ہوتی۔"

اس کے ساتھ، شمس تبریز نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے دل کے مقام پر رکھا اور ہم سب کو الوداع کہا، سمیت شیخ یاسین کے جو ایک طرف سنجیدہ اور بے حس سے کھڑے تھے۔ درویش نے باہر نکل کر اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا، ہمیں اس قدر گہری خاموشی میں چھوڑ کر کہ خاصی دیر تک تو ہم کوئی ہنگامہ کیا، بات بھی نہ کر سکے۔

وہ ارشاد تھا جس نے مجھے اس بے خودی کے عالم سے باہر نکالا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے کچھ ناپسندیدگی سے گھور رہا تھا۔ تبھی تھا کہ مجھے ادراک ہوا کہ میرا دایاں ہاتھ میرے دل کے مقام پر رکھا تھا، اُس سچائی کو سلام پیش کرتے ہوئے جسے ابھی ابھی اِس دل نے پہچان لیا تھا۔

بیبرس جنگجو

قونیہ، مئی 1246ء

برباد مگر پھر بھی غیر مغلوب۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آسکا جب میں نے سنا کہ شمس نے طلبا کے سامنے میرے چچا سے دو بدو بحث کی جرأت کی تھی۔ اس آدمی میں کوئی تہذیب نہیں؟ میری کس قدر خواہش تھی کہ کاش اُس کی آمد پر میں مدرسے میں موجود ہوتا۔ اس سے پہلے کہ اسے اپنی فاسق زبان کھولنے کا موقع ملتا، میں اُسے وہاں سے نکال دیتا۔ لیکن میں وہاں موجود نہ تھا، اور لگتا ہے کہ اُس کی چچا سے خاصی لمبی گفتگو ہوئی، جس کے بارے طلبا تب سے بکواس کر رہے ہیں۔ اگرچہ میں ان کی باتوں کو شک سے ہی دیکھ رہا ہوں کیوں کہ اُن کی بتائی رُوداد متضاد ہے اور وہ اس بدکردار درویش کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

مجھے آج شب بہت گھبراہٹ سی ہے۔ یہ سب اُس طوائف گُلِ صحرا کے باعث ہے۔ میں اسے اپنے ذہن سے نکال ہی نہیں پا رہا۔ وہ مجھے خفیہ خانوں والے زیورات کے ڈبے کی یاد دلاتی ہے۔ تمہیں لگتا ہے کہ وہ تمہاری ملکیت ہے، لیکن جب تک کہ تمہارے پاس چابیاں نہ ہوں، وہ مقفل اور ناقابل رسائی ہی رہتا ہے، چاہے تم اُسے بانہوں میں لیے رہو۔

اُس کا دستبردار ہونا مجھے سب سے زیادہ پریشان کرتا ہے۔ میں خود سے پوچھتا رہا کہ اس نے میرے جنونی اشتعال پر کوئی مزاحمت کیوں نہ کی۔ کیسے وہ فرش پر میرے قدموں میں کسی گندے پرانے قالین کی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی؟ اگر وہ مجھ پر ہاتھ اٹھاتی یا مدد کے لیے چیخنے چلاتی تو میں اُسے زدوکوب کرنا بند کر دیتا۔ لیکن وہ بے حرکت پڑی رہی، اُس کی آنکھیں باہر کو ابل رہی تھیں، منہ یوں بند تھا جیسے جو بھی ہوتا، وہ اس کے سامنے کو تیار تھی۔ کیا اُسے واقعی بالکل پرواہ نہ تھی کہ میں چاہے اس کی جان ہی لے لیتا؟

میں دوبارہ قحبہ خانے جانے سے خود کو روکنے کی پوری کوشش کر رہا تھا، لیکن آج میں اُس سے ملنے کی خواہش سے ہار گیا۔ وہاں جاتے ہوئے راستے میں، میں سوچتا رہا کہ مجھے دیکھ کر وہ کیا ردِعمل

دکھائے گی۔ اس صورت میں کہ اُس نے میری شکایت کر دی اور حالات خراب ہوئے تو میں قحبہ خانے کی نائکہ کو بہ طور رشوت کچھ رقم دیتا یا اُسے دھمکاتا۔ میں نے اپنے ذہن میں سب ممکنہ باتیں سوچ رکھی تھیں اور ہر امکان کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا، ماسوائے اس امکان کے کہ وہ فرار ہو سکتی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا، گُلِ صحرا یہاں نہیں ہے؟'' میں پھٹ پڑا۔ ''کہاں گئی ہے وہ؟''

''اُس طوائف کو بھول ہی جاؤ۔'' قحبہ خانے کی نائکہ نے لوکم (Lokum) اچھال کر منہ میں ڈالی اور اس کا رس اپنی انگلیوں سے چاٹتے کہا۔ یہ دیکھ کر کہ میں کس قدر پریشان تھا، اس نے ذرا نرمی سے مزید کہا، ''تم دوسری لڑکیوں پر ایک نظر کیوں نہیں ڈال لیتے، بہرس؟''

''میں گھٹیا طوائفوں سے نہیں ملنا چاہتا، موٹی حرافہ۔ مجھے گُلِ صحرا سے ملنا ہے اور ابھی ملنا ہے۔''

مخنث نے میرے یوں تخاطب پر اپنی گہری تیکھی بھنویں اچکائیں لیکن مجھ سے بحث کی جرأت نہ کی۔ اس کی آواز یوں سرگوشی میں ڈھل گئی جیسے اُسے خود ان الفاظ پر شرمندگی ہو جو وہ کہنے کو تھی۔ ''وہ جا چکی ہے۔ لگتا ہے جب سب سو رہے تھے تو وہ فرار ہو گئی۔''

یہ اس قدر بے تکی بات تھی کہ اس پر ہنسی بھی نہ آتی۔ ''کب سے یہ ہوا کہ طوائفیں اپنے قحبہ خانوں سے بھاگنے لگی ہوں؟'' میں نے پوچھا، ''تم اسے ابھی تلاش کرو!''

نائکہ نے یوں دیکھا جیسے وہ حقیقت میں مجھے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ ''تم مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہو؟'' وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سرکش آنکھوں سے جو بالکل بھی گُلِ صحرا جیسی نہ تھیں، مجھے غصے سے گھورتے ہوئے پھنکاری۔

''میں ایک ضابطہ سپاہی ہوں جس کا چچا اہم عہدے پر فائز ہے۔ میں تمہارے اس اڈے کو بند کروا کر تم سب کو سڑک پر لے آؤں گا۔'' میں نے اُس کی طرف بڑھ کر اس کی گود میں رکھے پیالے سے لوکم اٹھاتے کہا۔ لوکم نرم اور مزے دار تھی۔

میں نے اپنی اُنگلیاں نائکہ کے ریشمی سرپوش سے پونچھ لیں۔ اُس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا، لیکن اُسے مجھ سے جھگڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔

''تم مجھے کیوں الزام دے رہے ہو؟'' وہ بولی، ''الزام اُس درویش کو دو۔ اُسی نے گُلِ صحرا کو ورغلا کر قحبہ خانہ چھوڑنے اور خدا کی جستجو پر قائل کیا تھا۔''

لمحے بھر کو مجھے سمجھ نہ آئی کہ وہ کس کی بات کر رہی تھی، لیکن پھر مجھ پر عیاں ہوا کہ اس کی مراد شمس تبریز کے سوا کسی سے نہیں تھی۔

پہلے اُس نے میرے چچا کو اُن کے طلبا کے سامنے بے عزت کیا اور اب یہ کچھ۔ واضح تھا کہ اُس کافر کو اپنی حدوں کا علم نہ تھا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 26 جون 2008ء

میرے محبوب عزیز،

میں نے اس مرتبہ تمہیں خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ تم جانتے ہو، پرانے طریقے سے، روشنائی سے، خوشبودار کاغذ، ہم رنگ لفافے اور ڈاک ٹکٹ کے ساتھ۔ آج سہ پہر میں اسے ایمسٹرڈیم کی ڈاک میں پوسٹ کروں گی۔ مجھے فوراً ایسا کرنا ہوگا کیوں کہ مجھے خدشہ ہے کہ اگر میں نے دیر کی تو میں ایسا کبھی نہ کر پاؤں گی۔

پہلے آپ کسی سے ملتے ہیں... کوئی ایسا جو آپ کے اردگرد موجود سب لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ایسا شخص جو ہر شے کو کسی مختلف نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور آپ کو اپنا زاویہ نگاہ بدلنے پر مجبور کر دیتا ہے، ہر شے کا نئے سرے سے مشاہدہ، اندر اور باہر دونوں سے۔ آپ کا خیال ہوتا ہے کہ آپ ایسے شخص سے ایک محفوظ فاصلہ رکھ سکتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اس خوب صورت طوفان میں سے رستہ تلاش کرتے ہوئے نکل سکتے ہیں، یہاں تک کہ آپ کو ادراک ہوتا ہے، یکا یک احساس ہوتا ہے کہ آپ ہر طرف سے گھر چکے ہیں اور درحقیقت کچھ بھی آپ کے اختیار میں نہیں۔

میں نہیں بتا سکتی ہوں کہ میں کب تمہارے الفاظ کی اسیر ہوئی۔ مجھے بس یہ معلوم ہے کہ ہماری خط وکتابت مجھے تبدیل کرتی رہی ہے۔ ابتدا سے ہی۔ امکان ہے کہ مجھے یہ سب کہہ کر پچھتاوا ہوگا۔ لیکن ساری زندگی اُن چیزوں پر پچھتاتے رہنے کے بعد جو کرنے میں مَیں ناکام رہی، اب مجھے کچھ ایسا کرنے میں کوئی نقصان دکھائی نہیں دیتا جس پر بعد ازاں کوئی پچھتاوا ہو۔

جب سے میری تم سے تمہارے ناول اور ای میلز کے ذریعے "ملاقات" ہوئی ہے، تم میری سوچوں پر حاوی ہو۔ ہر مرتبہ جب میں تمہاری ای میل پڑھتی ہوں، میرے اندر لہری اٹھنے لگتی ہے اور مجھے ادراک ہوتا ہے کہ ایک عرصے سے میں نے ایسا اطمینان اور جوش محسوس نہیں کیا۔ دن بھر تم میرے

ذہن میں رہتے ہو۔ میں دل ہی دل میں تم سے باتیں کرتی ہوں اور سوچتی ہوں میری زندگی کی ہرنئی تحریک پر تم کیا ردعمل دکھاؤ گے۔ کسی اچھے ریسٹورنٹ جاؤں تو وہاں میں تمہارے ہمراہ جانا چاہتی ہوں۔ جب بھی میں کوئی اپنی دلچسپی کی چیز دیکھتی ہوں تو وہ تمہیں دکھا نہ پانے پر مجھے اداسی ہوتی ہے۔ اگلے روز میری چھوٹی بیٹی نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے بالوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔ میرے بال ہمیشہ جیسے ہی ہیں! لیکن یہ سچ ہے کہ میں مختلف نظر آتی ہوں کیوں کہ اب میں مختلف محسوس کرتی ہوں۔

پھر میں خود کو یاد دلاتی ہوں کہ ہماری تو ابھی ملاقات تک نہیں ہوئی۔ اور یہ بات مجھے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لاتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ تمہارا کیا کروں۔ میں نے تمہارے ناول کا مطالعہ مکمل کرلیا ہے اور اپنی رپورٹ بھیج دی ہے۔ (اوہ ہاں، میں اُس پر ایک ادارتی رپورٹ لکھ رہی تھی۔ ایک وقت تھا جب میں اپنے خیالات میں تمہیں شریک کرنا چاہتی تھی، یا کم ازکم وہ رپورٹ تمہیں بھیجنا چاہتی تھی جو میں نے لٹریری ایجنٹ کو دی لیکن مجھے یہ ٹھیک نہ لگا۔ اگرچہ میں اس رپورٹ کی تفصیلات میں تمہیں شریک نہیں کرسکتی، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے تمہارا ناول بے حد پسند آیا۔ اس مسرت کا شکریہ۔ تمہارے الفاظ ہمیشہ میرے ہمراہ رہیں گے)۔

بہرحال، یہ خط لکھنے کے فیصلے کا تعلق ''دلکش کفر'' سے نہیں، یا پھر سب کچھ کا تعلق اسی سے ہے۔ ہمارے درمیان، جو کچھ بھی یہ ہے، اس نے مجھے مجبور کیا اور اس کا مجھ پر حاوی اثر میرا مجھ پر سے اختیار چھین رہا ہے۔ یہ اتنا گمبھیر ہوتا جارہا ہے کہ میں اب اس سے نمٹ نہیں سکتی۔ پہلے مجھے تمہارے تخیل اور تمہاری کہانیوں سے محبت تھی، اور پھر مجھے ادراک ہوا کہ مجھے اس شخص سے محبت ہے جو ان کہانیوں کے پیچھے ہے۔

اب مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہارا، اس سب کا کروں کیا۔

جیسا کہ میں نے کہا، مجھے یہ خط فوراً ڈاک کے سپرد کرنا ہے۔ اگر نہیں تو میں اس کے درجنوں پرزے کردوں گی۔ میں ظاہر یوں کروں گی کہ جیسے میری زندگی میں کچھ نیا، کچھ بھی غیر معمولی نہیں۔

ہاں، میں وہی سب کرسکتی ہوں جو ہمیشہ کرتی آئی ہوں اور یوں ظاہر کرتی رہوں گی جیسے سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔

میں یہ دکھاوا کرسکتی تھی، اگر میرے دل سے یہ شدید ٹیس نہ اٹھ رہی ہوتی...

محبت کے ساتھ،

ایلا

کیرا

قونیہ، مئی 1246ء

چشمہ آتش کا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹنا ہے۔ آج صبح، اچانک ہی ایک عورت شمس تبریز کا پوچھنے آئی۔ میں نے اُسے ذرا دیر بعد آنے کا کہا کیوں کہ وہ گھر پر نہ تھے، لیکن اس نے بتایا کہ وہ بے خانماں تھی اور یہ کہ وہ صحن میں انتظار کر لے گی۔ تبھی تھا کہ مجھے شک ہوا اور میں نے اُس سے پوچھ گچھ کی کہ وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر سی گئی اور اپنا نقاب ہٹا کر چہرہ دکھایا جو زخموں کے نشانوں سے بھرا اور زدوکوب سے سوجا ہوا تھا۔ خراشوں اور زخموں کے باوجود، وہ انتہائی نرم و نازک حسینہ تھی۔ آنسوؤں اور سسکیوں میں اور حیرت انگیز خوش بیانی سے، اُس نے اسی بات کی توثیق کی جس کا مجھے شبہ تھا۔ وہ کسی قحبہ خانے کی طوائف تھی۔

''لیکن میں وہ دہشت خیز جگہ چھوڑ آئی ہوں۔'' اُس نے کہا، ''میں حمام میں گئی تھی اور میں نے چالیس مرتبہ چالیس دعاؤں کے ساتھ غسل کیا۔ میں نے عہد کیا ہے کہ مردوں سے دُور رہوں گی۔ اب سے میری زندگی خدا سے منسوب ہے۔''

نہ جانتے ہوئے کہ میں کیا کہوں، میں نے اُس کی زخمی آنکھوں میں جھانکا اور سوچنے لگی کہ اس قدر حسین، نوجوان اور نازک ہوتے ہوئے، اس کے اندر اس زندگی کو چھوڑنے کا حوصلہ کیسے آیا جس سے وہ واقف تھی۔ میں کسی گنہگار عورت کو اپنے گھر کے قریب بھی نہ دیکھنا چاہتی تھی، لیکن اُس میں کچھ ایسا تھا جس نے میرے دل پر اثر کیا، ایک قسم کی سادگی، تقریباً معصومیت، جو میں نے پہلے کبھی کسی میں نہ دیکھی تھی۔ اُس کی بھوری آنکھوں نے مجھے مقدس مریمؑ کی آنکھیں یاد دلا دیں۔ میں اُسے وہاں سے بھگا نہ سکی۔ میں نے اُسے صحن میں انتظار کرنے دیا۔ میں بس یہی کر سکتی تھی۔ وہ کسی مرمریں مجسمے کی طرح بے حس و حرکت، خلا میں گھورتے ہوئے، دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

گھنٹہ بھر بعد، جب شمس تبریز اور مولانا رومی چہل قدمی سے واپس آئے، میں عجلت میں

انہیں اس غیر متوقع مہمان کی اطلاع دینے بھاگی۔

''تم نے کہا کہ ہمارے صحن میں کوئی طوائف آئی بیٹھی ہے؟'' مولانا رومی نے الجھن بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں، اور اس کا کہنا ہے کہ وہ خدا کی جستجو میں قحبہ خانے کو چھوڑ آئی ہے۔''

''اوہ، وہ یقیناً گُلِ صحرا ہوگی۔'' شمس تبریز کہہ اٹھے۔ اُن کا لہجہ حیرانی سے زیادہ خوشی بھرا تھا۔ ''تم نے اُسے باہر کیوں رہنے دیا؟ اُسے اندر بلاؤ!''

''لیکن اگر آس پڑوس میں پتا چلا کہ ہماری چھت تلے کوئی طوائف موجود ہے تو لوگ کیا کہیں گے؟'' میں نے اعتراض کیا۔ میری آواز سے تناؤ سے چیخ رہی تھی۔

''کیا ہم سب بہر حال ایک ہی چھت تلے نہیں رہ رہے؟'' شمس تبریز نے اوپر آسمان کی طرف اشارہ کرتے کہا، ''شاہ و گدا، کنواریاں اور طوائفیں، سب کے سب ایک ہی آسمان تلے!''

میں شمس تبریز سے کیسے بحث کر سکتی ہوں؟ اُن کے پاس ہر بات کا جواب تیار ہوتا تھا۔

میں نے طوائف کو گھر میں بلا لیا، یہ دعا کرتے ہوئے کہ ہمسایوں کی متجسس نگاہیں ہم پر نہ پڑی ہوں۔ گُلِ صحرا کمرے میں داخل ہوتے ہی سسکیاں بھرتے ہوئے شمس تبریز کی دست بوسی کو آگے بڑھی۔

''مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم یہاں آگئیں۔'' شمس تبریز یوں چہکے جیسے کسی دیرینہ دوست سے باتیں کر رہے ہوں۔ ''تم اُس جگہ واپس کبھی نہیں جاؤ گی۔ تمہاری زندگی کا وہ مرحلہ بالکل ختم ہو چکا۔ اللہ راہِ حق کو تمہارے لیے مبارک کرے!''

گُلِ صحرا مزید شدت سے رونے لگی۔ ''لیکن نائکہ مجھے کبھی سکون سے نہ رہنے دے گی۔ وہ گیدڑ سر کو میرے پیچھے بھیجے گی۔ آپ نہیں جانتے کیسے...''

''اپنا ذہن کو ان سوچوں سے آزاد کر لو، بچی۔'' شمس تبریز نے اس کی بات قطع کی۔ ''ایک اور اصول یاد رکھنا: اس دنیا میں ہر شخص کہیں نہ کہیں پہنچنے اور کچھ نہ کچھ بننے کی تگ و دو میں ہے، جو سب موت کے بعد یہیں رہ جائے گا، اس صورت میں تم عدم یا نیست کے اعلیٰ ترین مرحلے کا عزم رکھو۔ اس زندگی کو صفر کے ہندسے کی طرح سبک سری اور خالی پن سے جیو۔ ہم کسی برتن سے مختلف نہیں۔ باہر کی سجاوٹ اور خوب صورتی نہیں ہے بلکہ اندر کا خالی پن ہمیں درست سمت میں رکھتا ہے۔ اسی طرح ہمیں وہ کچھ متحرک نہیں رکھتا جو ہم حاصل کرنے کی تمنا اور عزم رکھتے ہیں بلکہ ہمیں اسی خالی پن کا شعور رواں رکھتا ہے۔''

✡

شام گئے، میں نے گُلِ صحرا کو اُس کا سونے کا بستر دکھایا۔ اس کے فوراً لیٹ کر گہری نیند سونے کے بعد، میں مرکزی کمرے میں واپس چلی آئی، جہاں مولانا رومی اور شمس تبریز باہم گفتگو کر رہے تھے۔

''تمہیں ہمارا رقص دیکھنا چاہیے۔'' شمس تبریز نے مجھے وہاں آتے دیکھ کر کہا۔

''کیسا رقص؟'' میں نے پوچھا۔

''روحانی رقص، کیرا۔ ایسا جو تم نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔''

میں نے تعجب سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ کیا ہو رہا تھا؟ وہ کس رقص کی بات کر رہے تھے؟

''مولانا، آپ ایک معزز عالم ہیں، لوگوں کی تفریح طبع کا سامان نہیں۔ لوگ آپ کے متعلق بھلا کیا سوچیں گے؟'' یہ پوچھتے ہوئے مجھے اپنا چہرہ سرخ پڑتا محسوس ہوا۔

''فکر مت کرو۔'' مولانا رومی نے کہا، ''شمس تبریز اور میں اس بارے میں عرصے سے بات کرتے آ رہے ہیں۔ ہم درویشوں کا صوفی رقص متعارف کروانا چاہتے ہیں۔ اسے سماع کہا جاتا ہے۔ عشق الٰہی کا کوئی بھی طلب گار خوشی سے ہم میں شامل ہو سکتا ہے۔''

میرے سر میں شدید درد شروع ہو گیا، لیکن اس درد کا موازنہ میرے دل کے کرب سے نہ کیا جا سکتا تھا۔

''کیا ہو، اگر لوگ اسے پسند نہ کریں؟ ہر کوئی رقص کو اچھا نہیں سمجھتا۔'' میں نے اس امید میں شمس تبریز سے کہا کہ شاید یہ سن کر وہ اپنی اگلی بات کہنے سے رک جائیں۔ ''کم سے کم اس رقص کو ذرا ملتوی ہی کر دیں۔''

''ہر کوئی تو خدا کو بھی اچھا نہیں سمجھتا۔'' شمس تبریز نے اُسی سانس میں جواب دیا، ''کیا ہم اُس پر یقین کو بھی ملتوی کر دیں؟''

اور یوں بحث انجام کو پہنچ گئی۔ کہنے کو مزید کچھ نہ رہا اور دیواروں کے تختوں سے ٹکراتی اور میرے کانوں میں بجتی ہوا کے شور نے گھر کو بھر دیا۔

سلطان ولد

قونیہ، جون 1246ء

''بہ ظاہر حُسن دیکھنے والی آنکھ میں ہوتا ہے۔'' شمس تبریز کہتے، ''ہر کوئی ایک ہی رقص دیکھے گا، مگر ہر کوئی اسے مختلف طور پر دیکھے گا۔ سو پریشانی کیسی؟ کچھ لوگوں کو وہ پسند آئے گا، کچھ کو نہیں۔''

تاہم، سماع کی شام میں نے شمس تبریز سے کہا کہ مجھے تشویش تھی کہ کوئی بھی نہ آئے گا۔

''فکر مت کرو۔'' اُنہوں نے زور دے کر کہا، ''شہر کے لوگ ہوسکتا ہے مجھے ناپسند کرتے ہوں، ہوسکتا ہے وہ تمہارے والد کے بھی اب عقیدت مند نہ رہے ہوں، لیکن وہ ہمیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ انہیں اُن کا تجسس یہاں لائے گا۔''

اور بالکل اسی طرح سماع کی شام میں نے کشادہ دالان کو لوگوں سے بھرا پایا۔ تاجر، آہن گر، بڑھئی، کسان، سنگ تراش، دوا فروش، کاریگر، منشی، کمہار، نانبائی، نوحہ گر، نجومی، چوہے پکڑنے والے، عطر فروش، سب وہاں موجود تھے... حتیٰ کہ شیخ یاسین بھی اپنے مریدوں کے ایک گروہ کے ہمراہ آئے۔ خواتین پچھلی جانب بیٹھی تھیں۔

پہلی قطار میں ہمارے سلطان کیخسرو کو اپنے مشیروں کے ہمراہ بیٹھے دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ یہ دیکھ کر کہ اتنی بارتبہ شخصیت میرے والد کی حامی تھی تو اس پر لوگوں کی زبان بندی ہو جاتی۔

حاضرین کو دالان میں اپنی نشستیں سنبھالنے میں خاصا وقت لگا اور اس کے بعد بھی، دالان کے اندر کا شور پوری طرح ختم نہ ہوا اور لوگوں کی چہ مگوئیاں جاری رہیں۔ کسی ایسے شخص کے برابر بیٹھنے کی کوشش میں، جو شمس تبریز کے بارے بدگوئی نہ کرے، میں مدھوش سلیمان کے برابر جا بیٹھا۔ اُس سے شراب کی بو آرہی تھی، لیکن میں نے پرواہ نہ کی۔

میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں، ہتھیلیاں پسیج گئی تھیں اور اگرچہ اندر فضا اتنی گرم تھی کہ ہم اپنی اوڑھی چادریں اُتار سکتے تھے، میرے دانت بجنے لگے۔ یہ رقص میرے والد کی مائل بہ زوال نیک نامی

کے لیے اس قدر اہم تھا۔ میں نے اللہ سے دعا کی، لیکن چوں کہ میں نہیں جانتا تھا کہ سب ٹھیک رہنے کے سوا کیا مانگوں، میری دعا بڑی مجہول سی تھی۔

کچھ دیر بعد آواز سنائی دی، پہلے کہیں دور اور پھر وہ قریب آتی گئی۔ وہ اس قدر دلفریب صدا تھی کہ سب سانس روک کر سننے لگے۔

''یہ کس قسم کا ساز ہے؟'' سلیمان نے ملی جلی مرعوبیت اور مسرت سے سرگوشی کی۔

''اسے نے (بانسری) کہتے ہیں۔'' میں نے بابا اور شمس تبریز کے مابین گفتگو یاد کرتے کہا، ''اور اس کی صدا، محبوب کے لیے آہ بھرتے محب کی سی ہے۔''

نے کے قدرے دھیما ہونے پر میرے والد سامنے آئے۔ نپے تلے قدم بڑھاتے وہ سامنے آئے اور حاضرین کو سلام کیا۔ اُن کے پیچھے چھے درویش نمودار ہوئے، وہ سب میرے والد کے شاگرد تھے، ان سب نے لمبے سفید چغے پہن رکھے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھے اور دعا لینے میرے والد کے سامنے جھکے۔ پھر موسیقی شروع ہوئی اور ایک ایک کر کے، درویش گھومنے لگے، پہلے آہستہ اور پھر سانس روک دینے والی تیز رفتاری سے، جس پر اُن کے چغے کھل کر کنول کے پھول دکھائی دینے لگے۔

وہ قابل دید منظر تھا۔ میں فخر اور خوشی سے مسکرائے بغیر نہ رہ پایا۔ میں نے انکھیوں سے حاضرین کا ردِعمل دیکھنا چاہا۔ ناگوار ترین افواہ ساز بھی واضح پسندیدگی اور تحسین سے رقص دیکھ رہے تھے۔

تمام درویش گھومتے رہے، رقصاں رہے، جیسے ابد تک۔ پھر موسیقی تیز ہوئی، اور پردے کے پیچھے سے رباب کی آواز بھی نے اور دمامہ کے ساتھ شامل ہوتی چلی گئی۔ تبھی تھا کہ شمس تبریز کسی سرکش صحرائی بگولے کی طرح نمودار ہوئے۔ باقی درویشوں کی نسبت گہرے رنگ کا لبادہ پہنے، وہ بھی تیزی سے گھومنے لگے۔ اُن کے ہاتھ آسمان کی طرف کھلے ہوئے تھے اور چہرہ اوپر کی جانب یوں اٹھا ہوا تھا، جیسے سورج کی جستجو میں سورج مکھی کا پھول۔

میں نے حاضرین میں کئی لوگوں کو مرعوب ہو کر گہری سانس بھرتے سنا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو شمس تبریز سے نفرت کرتے تھے، جیسے اس لمحے کے اسیر ہو گئے۔ میں نے اپنے والد کی طرف نگاہ کی۔ جب شمس تبریز جذب کے عالم میں رقصاں تھے اور باقی مرید اپنے اپنے محور میں آہنگی سے محوِ گردش تھے، میرے والد شاہ بلوط کے کسی بوڑھے درخت کی مانند ساکت تھے، دانا اور طمانیت بھرے، اُن کے ہونٹ مسلسل دعا میں ہل رہے تھے۔

آخر کار موسیقی مدھم ہوئی۔ یکایک تمام درویش تھم گئے، کنول کے ہر پھول نے اپنا منہ بند کر لیا۔ ہولے سے سر کو جھکاتے ہوئے میرے والد نے سب کے لیے دعائے برکت کی اور لمحے بھر کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم سب کامل ہم آہنگی کے ساتھ آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ اچانک ایک گہری

خاموشی چھا گئی۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ کیا ردِعمل ظاہر کرے۔ کسی نے اس سے پہلے کبھی ایسا کچھ نہ دیکھا تھا۔

میرے والد کی آواز نے خاموشی کو چھید دیا۔ ''میرے دوستو، اسے سماع کہتے ہیں... رقصِ درویش۔ آج کے بعد ہر عمر کے درویش سماع کریں گے۔ آسمان کی جانب اشارہ کرتا ایک ہاتھ، دوسرا زمین کی طرف جھکا ہوا، محبت کا ہر ذرہ جو ہم خدا سے وصول کرتے ہیں، ہم اسے لوگوں میں بانٹنے کا عہد کرتے ہیں۔''

حاضرین مسکرائے اور زیرِلب ان سے اتفاق کیا۔ پورے دالان میں ایک گرم جوش اور دوستانہ سی ہلچل دوڑ گئی۔ میں یہ ردِعمل دیکھ کر اس قدر جذباتی ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آخرکار میرے والد اور شمس تبریز کو وہ احترام اور محبت ملنے کا آغاز ہو گیا تھا جس کے وہ یقیناً حق دار تھے۔

وہ شام اسی خوش گوار ماحول میں انجام کو پہنچ سکتی تھی اور میں اس بھروسے کے ساتھ خوش باش گھر واپس جا سکتا تھا کہ اب حالات بہتر ہو رہے تھے، اگر وہ رونما نہ ہوا ہوتا جو اس سب کے بعد ہوا، کچھ ایسا جس نے سب کچھ برباد کر دیا۔

مدہوش سلیمان

قونیہ، جون 1246ء

بے شک انتہائی ناقابل فراموش شام تھی وہ! میں ابھی تک اُس کے اثرات سے نکل نہیں پایا۔ اور وہ سب کچھ جو میں نے آج رات مشاہدہ کیا، ان میں سب سے تعجب خیز، اس کا اختتامی حصہ تھا۔

سماع کے بعد، کیخسرو کھڑے ہوئے اور چہار اطراف رعونت و تحکم بھری نگاہیں دوڑائیں۔ خود پسند انداز میں وہ چبوترے کی طرف بڑھے اور زوردار قہقہے کے بعد کہنے لگے، ''مبارک ہو، درویش حضرات! میں آپ سب کی کارکردگی سے خوش ہوا۔''

مولانا رومی نے بڑے سلیقے سے اُن کا شکریہ ادا کیا اور چبوترے پر موجود دوسرے درویشوں نے بھی۔ پھر موسیقار اٹھ کھڑے ہوئے اور معزز مہمان کو انتہائی احترام سے سلام کیا۔ کیخسرو کا چہرہ طمانیت سے چمک رہا تھا، انہوں نے اپنے ایک محافظ کو اشارہ کیا، جس نے فوراً ایک مخملیں تھیلی انہیں تھما دی۔ کیخسرو نے تھیلی کو کئی مرتبہ ایک سے دوسرے ہاتھ میں اچھالا، یہ دکھانے کو کہ وہ طلائی سکوں سے بھری ہوئی تھی اور پھر اسے چبوترے پر اچھال دیا۔ میرے اردگرد بیٹھے لوگوں نے گہری سانس بھری اور نعرۂ تحسین بلند کیا۔ ہم اپنے سلطان کی سخاوت پر اسی قدر جذباتی ہو گئے تھے۔

مطمئن اور پُراعتماد کیخسرو واپس جانے کو مڑے۔ لیکن انہوں نے بیرونی راستے کی جانب ابھی دوسرا ہی قدم بڑھایا ہو گا کہ وہی تھیلی جو اُنہوں نے چبوترے پر اچھالی تھی، واپس ان کی طرف پھینک دی گئی۔ تمام طلائی سکے، کسی نوبیاہتا دلہن کی چوڑیوں کی طرح چھنچھناتے ہوئے ان کے قدموں میں آ گرے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ لمحے بھر کو تو ہم سب بے حس و حرکت اور پریشان کھڑے رہ گئے، یہ سمجھنے کے ناقابل کہ ہو کیا رہا تھا۔ لیکن بلاشبہ سب سے زیادہ صدمے کی کیفیت میں خود کیخسرو تھے۔ توہین اس قدر کھلے عام اور ذاتی تھی کہ ناقابل معافی تھی۔ انہوں نے بے یقین نگاہوں سے مڑ کر دیکھا کہ ایسی غضب ناک حرکت کا مرتکب کون ہو سکتا تھا۔

وہ شمس تبریز تھے۔ سب نے اپنا رخ ان کی جانب موڑا، وہ چبوترے پر اپنے ہاتھ کولہوں پر جمائے کھڑے تھے اور اُس کی آنکھیں سرکش اور لہو رنگ تھیں۔

''ہم دولت کے لیے رقص نہیں کرتے۔'' ان کی گمبھیر آواز گونجی، ''سماع ایک روحانی رقص ہے جس کا مظاہرہ محبت اور صرف محبت کے لیے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اپنا سونا واپس لے لیجیے حضور! آپ کی دولت کا یہاں کوئی فائدہ نہیں!''

دالان میں ناگوار سی خاموشی چھا گئی۔ مولانا رومی کا بڑا بیٹا اس قدر ہیجان زدہ دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے اس کے نوجوان چہرے سے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ آواز بھی نکالے۔ ہم سب ہلکی سی آہٹ کے بھی بغیر اپنی سانسیں روکے کھڑے تھے۔ یوں جیسے آسمان ایسے کسی اشارے کا ہی منتظر تھا، اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کی بوندوں کے شور میں سب کچھ اور ہر کوئی غرق ہو گیا۔

''چلو چلیں!'' کیخسرو نے چلا کر اپنے آدمیوں کو حکم جاری کیا۔

احساسِ ذلت سے اپنے رخساروں کے بدلتے رنگ، بے اختیار کپکپاتے ہونٹوں اور واضح طور پر جھکے شانوں کے ساتھ اس نے بیرونی دروازے کا رخ کیا۔ اُس کے محافظ اور ملازم فرش پر بکھرے طلائی سکوں کو اپنے بھاری جوتوں تلے کچلتے ہوئے ایک ایک کر کے اس کے پیچھے کھسک لیے۔

جیسے ہی کیخسرو رخصت ہوئے، حاضرین میں ناپسندیدگی اور ناامیدی بھری چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔

''یہ اپنے آپ کو آخر کیا سمجھتا ہے!'' کچھ لوگ غصے سے پھٹ پڑے۔

''اس نے ہمارے سلطان کی توہین کی جرأت کیسے کی؟'' دوسرے لوگ بھی آ شامل ہوئے۔

''کیا ہو، اگر کیخسرو شہر بھر سے اس کی قیمت لیں؟''

بے یقینی سے سر ہلاتے لوگوں کا ایک گروہ کھڑا ہوا اور وہ احتجاج کے طور پر باہر جانے لگے۔ ان احتجاج کرنے والوں میں سب سے آگے شیخ یاسین اور ان کے طلبا تھے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے ان کے درمیان مولانا رومی کے دو پرانے شاگردوں... اور اُن کے بیٹے علاؤالدین کو بھی دیکھا۔

علاؤالدین

قونیہ، جون 1248ء

بخدا، میں زندگی بھر کبھی اس قدر شرمندہ نہیں ہوا۔ یوں جیسے اپنے والد کو کسی کافر کے ساتھ گٹھ جوڑ کرتے دیکھنا شرم انگیز نہ تھا کہ اب مجھے والد کو سب کے سامنے رقص کرتے دیکھنے کی ذلت بھی برداشت کرنی پڑی۔ شہر بھر کے سامنے وہ خود کو کیسے اتنا بے عزت کر سکتے تھے؟ اس پر مستزاد، میں یہ جان کر ہیبت زدہ رہ گیا کہ ناظرین میں قحبہ خانے کی ایک طوائف بھی موجود تھی۔ جب وہاں بیٹھا میں یہ سوچ رہا تھا کہ شمس تبریز سے میرے والد کی محبت ہمیں مزید کس قدر دیوانگی اور بربادی کا شکار کر سکتی ہے، زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے یہ خواہش ہوئی کہ کاش میں کسی اور شخص کا بیٹا ہوتا۔

میرے نزدیک، رقص ہی مذہب کی توہین تھا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تو بالکل ناقابل قبول تھا۔ اُس گستاخ و بے ادب کی جرأت بھی کیسے ہوئی کہ ہمارے سلطان کی توہین کرے؟ وہ خوش قسمت تھا کہ کیخسرو نے اُسے گرفتار کروا کر سولی چڑھانے کا حکم نہیں دیا۔

جب میں نے شیخ یاسین کو کیخسرو کے پیچھے باہر نکلتے دیکھا تو جان گیا کہ مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ آخری بات جو میں چاہتا، یہ ہوتی کہ شہر کے لوگ سمجھیں کہ میں اُس کافر کا طرف دار تھا۔ ایک ہی بار سب کو دیکھ لینا چاہیے تھا کہ اپنے بھائی کے برعکس، میں اپنے والد کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں تھا۔

اُس شب میں گھر نہ گیا۔ میں چند دوستوں کے ہمراہ ارشاد کے گھر رُک گیا۔ جذبات سے مغلوب، ہم دن بھر کے واقعات کے بارے بات کرتے اور سوچتے رہے کہ آگے کیا کرنا چاہیے۔

''اُس شخص کا تمہارے والد پر بُرا اثر پڑا ہے۔'' ارشاد نے تناؤ بھرے لہجے میں کہا، ''اور اب وہ تمہارے گھر کوئی طوائف بھی اٹھا لایا ہے۔ تمہیں اپنے خاندان کی نیک نامی کو بچانا ہوگا، علاؤالدین۔''

میں وہاں کھڑا اُن کی باتیں سنتا رہا۔ تکلیف و شرمندگی سے میرا چہرہ جیسے جل رہا تھا۔ ایک بات مجھ پر صاف واضح تھی: شمس تبریز نے ہمیں پریشانی کے سوا کچھ نہ دیا تھا۔

ہم نے متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ شمس کو شہر چھوڑنا ہوگا... اگر مرضی سے نہیں تو بالجبر۔

☼

اگلے روز میں اس عزم کے ساتھ گھر واپس پہنچا کہ شمس تبریز سے روبرو دوٹوک بات کروں۔ مجھے وہ صحن میں تنہا بیٹھا نے بجاتے ملا، اُس کا سر جھکا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں اور پشت میری جانب تھی۔ اپنی موسیقی میں پوری طرح غرق اُسے میری موجودگی کی خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ میں کسی چوہے کی طرح دبے پاؤں اُس کی طرف بڑھا تاکہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کا مشاہدہ کرسکوں اور اپنے دشمن کو بہتر طور پر جان سکوں۔

خاصی دیر بعد، موسیقی رُک گئی۔ شمس نے ہولے سے اپنا سر اٹھایا اور میری سمت دیکھے بغیر سپاٹ لہجے میں جیسے خود کلامی کرتے ہوئے بڑبڑایا، ''ارے علاؤالدین، تمہیں کیا چاہیے؟''

میں ایک لفظ تک نہ بولا۔ بند دروازوں کے پیچھے دیکھنے کی اس کی صلاحیت سے واقف، مجھے کوئی حیرانی نہ ہوئی کہ اپنے سر کے پیچھے بھی اُس کی آنکھیں تھیں۔

''کل تمہیں سماع پسند آیا؟'' شمس تبریز نے اب میری طرف رخ موڑتے پوچھا۔

''میرے خیال میں وہ موجب رسوائی تھا۔'' میں نے فوراً جواب دیا، ''آؤ ذرا سیدھی باتیں نہ کرلیں؟ میں تمہیں بالکل پسند نہیں کرتا۔ کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ اور میں تمہیں اپنے بابا کی نیک نامی مزید برباد کرنے نہیں دوں گا۔''

نے کو ایک طرف رکھتے شمس کی نگاہوں میں ایک شعلہ سا لپکا اور اس نے کہا، ''تو کیا یہی بات ہے؟ اگر مولانا رومی کی نیک نامی برباد ہوگئی تو لوگ تمہیں معزز و ممتاز شخص کے بیٹے کے طور پر عزت نہیں دیں گے۔ کیا تمہیں یہی بات ڈراتی ہے؟''

پُرعزم کہ میں اُسے خود پر حاوی نہیں ہونے دوں گا، میں نے اُس کی تلخ بات نظرانداز کردی۔ پھر بھی، کچھ کہنے میں مجھے ذرا دیر لگی۔

''تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے، ہمیں سکون سے کیوں نہیں رہنے دیتے؟ تمہاری آمد سے پہلے ہم اچھے تھے۔'' میں نے جواب دیا، ''میرے والد ایک قابل احترام عالم اور کنبے والے شخص ہیں۔ تم دونوں کے درمیان کچھ بھی ایک سا نہیں۔''

اپنی گردن آگے نکالے، پوری توجہ کے عالم میں بھنویں سکیڑے، شمس تبریز نے ایک گہری سانس بھری۔ اچانک ہی وہ بوڑھا اور کمزور دکھائی دیا۔ میرے ذہن میں اچانک اس خیال کا کوندا سا لپکا کہ اس سے پہلے کہ کوئی اسے بچانے آسکتا، میں مار مار کر اس کا بھرکس نکال سکتا تھا۔ وہ خیال اس قدر دہشت انگیز اور بداندیش تھا، اور پھر بھی خوفناک حد تک ترغیب انگیز بھی کہ مجھے اپنی نگاہوں کا رخ بدلنا پڑا۔

جب میں نے دوبارہ اسے دیکھا تو شمس کو اپنا جائزہ لیتے پایا، اُس کی نگاہ گرم جوش اور روشن تھی۔ کیا وہ میری سوچ پڑھ سکتا تھا؟ میرے بدن میں سرتاپیر سنسنی سی رینگ گئی، یوں جیسے مجھ میں ہزاروں

سوئیاں گڑ گئی ہوں اور میرے گھٹنے یوں کپکپانے لگے جیسے میرا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں۔ یہ ضرور کالا جادو رہا ہوگا۔ مجھے کوئی شبہ نہ تھا کہ شمس تبریز سفلی علوم میں ماہر تھا۔

''تم مجھ سے خوف زدہ ہو، علاؤالدین۔'' شمس تبریز نے توقف کے بعد کہا، ''کیا تم جانتے ہو کہ تم مجھے کس کی یاد دلاتے ہو؟ بھینگے معاون کی!''

''تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''یہ ایک کہانی ہے۔ کیا تمھیں قصے کہانیاں پسند ہیں؟''

میں نے کندھے اچکائے۔ ''میرے پاس ان کے لیے فالتو وقت نہیں۔''

شمس تبریز کے ہونٹوں پر تواضع بھری مسکراہٹ چمکی۔ ''کوئی شخص جس کے پاس قصے کہانیوں کے لیے وقت نہ ہو، ایسا شخص ہے جس کے پاس خدا کے لیے وقت نہیں۔'' اس نے کہا، ''کیا تم جانتے نہیں کہ خدا بہترین داستان گو ہے؟''

اور میرے جواب میں کچھ کہنے کا انتظار کیے بغیر، اس نے مجھے یہ کہانی سنائی:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی کاریگر کا تلخ مزاج معاون بالکل بھینگا تھا۔ اس معاون کو ہمیشہ دہری اشیا دکھائی دیتی تھیں۔ ایک روز کاریگر نے اُسے گودام سے شہد کا مرتبان اٹھا لانے کا کہا۔ معاون خالی ہاتھ واپس آیا۔ ''لیکن آفندی، وہاں تو شہد کے دو مرتبان ہیں۔'' اس نے شکایت کی، ''میں کون سا مرتبان لاؤں؟'' کاریگر اپنے معاون کو بہ خوبی جانتا تھا، اس لیے اس نے کہا، ''تم ایک مرتبان کو توڑ دو اور دوسرا میرے لیے اٹھا لاؤ؟''

افسوس، معاون اس قدر خرد ماغ تھا کہ وہ ان الفاظ میں چھپی حکمت سمجھ نہ پایا۔ اُس نے وہی کیا جو کہا گیا تھا۔ اُس نے ایک مرتبان توڑ ڈالا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ دوسرا مرتبان بھی ٹوٹ گیا تھا۔

''تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ شمس کے سامنے اپنے غصے کو عیاں کرنا ایک فاش غلطی تھی، لیکن میں خود پر قابو نہ رکھ پایا۔ ''تم اور تمھاری کہانیاں! لعنت ہو! کیا تم کبھی سیدھی طرح بات نہیں کر سکتے؟''

''مگر یہ بالکل واضح ہے، علاؤالدین۔ میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ بھینگے معاون کی طرح تم بھی دہری اشیا دیکھتے ہو۔'' شمس تبریز نے کہا، ''تمھارے والد اور میں ایک ہیں۔ اگر تم مجھے توڑ دو گے تو تم انھیں بھی توڑ دو گے۔''

''میرے والد اور تم میں کچھ بھی مشترک نہیں۔'' میں نے جوابی وار کیا۔ ''دوسرا مرتبان توڑ کر میں پہلے مرتبان کو آزاد کروا لوں گا۔''

میں غصے اور خفگی سے اس قدر بھرا ہوا تھا کہ میں نے اپنے الفاظ کے نتائج پر غور ہی نہ کیا۔ تب نہیں۔ بہت بعد تک بھی نہیں۔ تب تک نہیں جب تک کہ بہت تاخیر نہ ہو گئی۔

شمس

قونیہ، جون 1246ء

بالعموم، تنگ ذہن لوگوں کا کہنا ہے کہ رقص ایک طرح سے خلاف مذہب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خدا نے ہمیں موسیقی عطا کی... نہ صرف وہ موسیقی جو ہم ساز و آواز سے تخلیق کرتے ہیں بلکہ ہر صورتِ حیات میں نہاں موسیقی اور پھر اس نے ہمیں اسے سننے سے منع فرما دیا۔ کیا انہیں دکھائی نہیں دیتا کہ خود فطرت نغمہ سرا ہے؟ اس کائنات کی ہر شے ایک لَے میں محوِ گردش ہے... دل کا دھڑکنا، پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ، کسی طوفانی شب میں ہوا، آہن گر کی آہن پر ضرب، یا وہ آوازیں جن میں نامولود بچہ رحمِ مادر میں گھرا ہوتا ہے... جوش اور بے ساختگی سے ہر شے ایک عالیشان دُھن میں شامل ہے۔ رقصِ درویشاں بھی اسی ابدی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ بالکل جیسے ایک قطرے میں پورا قلزم سما جاتا ہے، ہمارا رقص اس کائنات کے اسرار کی عکاسی کرتا ہے اور انہیں ڈھانپتا بھی ہے۔

سماع سے خاصی دیر پہلے، مولانا رومی اور میں مراقبے کی غرض سے ایک پُرسکون کمرے میں موجود تھے۔ وہ چھے درویش بھی ہمارے ہمراہ تھے جنہیں اُس شب سماع میں شریک ہونا تھا۔ ہم نے ساتھ وضو کیا اور نماز ادا کی۔ پھر ہم نے اپنے مخصوص لبادے زیبِ تن کیے۔ لباس کے انتخاب کے بارے ہم پہلے ہی بات کر چکے تھے کہ اور ہم نے سادہ کپڑے اور خاکی اور بے کیف رنگوں کا انتخاب کیا تھا۔ شہد رنگ ٹوپی، لوحِ مزار کی علامت تھی۔ لمبا سفید چغہ، کفن اور سیاہ فرغل، قبر کی علامت تھے۔ ہمارا رقص ظاہر کرتا تھا کہ صوفیا اپنی ذات کی نفی کیسے کرتے ہیں، مُردہ جلد کی طرح۔

دالان میں چبوترے پر جانے سے پہلے، مولانا رومی نے ایک نظم پڑھی:

"عارف پانچ حواس سے فرار حاصل کر لیتا ہے
اور چھے سمتوں اور ان سے ماورا کے متعلق تمہیں آگاہ کرتا ہے۔"

ان جذبات کے ساتھ، ہم تیار تھے۔ پہلے لَے کی صدا اٹھی۔ پھر مولانا روم، (ماہرِ رقص)

سمازن باشی (Semazenbaşı) کی حیثیت سے چبوترے پر آئے۔ ایک ایک کر کے سب درویشوں نے احتراماً سر جھکائے اُن کی پیروی کی۔ سب سے آخر میں آنے والا شیخ تھا۔ میں نے جس قدر سختی سے اس کی مزاحمت کی، مولانا رومی نے اتنا ہی آج شب اس کردار کی ادائیگی پر اصرار کیا۔

حافظ نے قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کی: ''اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں ۔ اور خود تمہاری جانوں میں بھی۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں؟'' (سورہ الذٰریات، آیات 20-21)

پھر نَے اور رباب کی چھیدتی دل سوز صدا کے ساتھ آلۂ موسیقی کدم (Kudüm) کا آغاز ہوا:

''سن کہ نَے کہتی ہے اپنی داستاں
دردِ ہجراں سے ہوئی نوحہ کناں
کاٹ کر لے آئے نَے ستاں سے یہاں
مرد و زن میری فغاں سے خوں چکاں''

خود کو خدا کی سپردگی میں دیتے ہوئے، پہلے درویش نے گھومنا شروع کیا، اس کے لبادے کی سنجاف نرمی سے اپنی ہی الگ حیات میں محوِ گردش تھی۔ پھر سب درویش رقصاں ہوئے اور گھومنے لگے، یہاں تک کہ ہمارے اطراف وحدت و یکتائی کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ جو کچھ بھی ہمیں افلاک سے عطا ہوا، ہم نے زمین کو منتقل کر دیا، خدا سے اُس کے بندوں کو۔ ہم میں سے ہر ایک محب کو محبوبِ ازل سے جوڑتا رابطہ بن گیا۔ جب موسیقی رکی، ہم نے کائنات کے بنیادی عناصر کو جھک کر سلام پیش کیا: آتش، ہوا، خاک، آب، اور پانچواں عنصر غیب۔

☼

سماع کے آخر میں، میرے اور کیخسرو کے درمیان جو کچھ رونما ہوا، مجھے اس کا افسوس نہیں۔ لیکن مجھے مولانا رومی کو مشکل صورتِ حال میں ڈالنے کا ضرور افسوس ہے۔ ایسی شخصیت جسے ہمیشہ امتیازی حیثیت، استحقاق اور تحفظ حاصل رہا ہو، انہیں پہلے کبھی کسی حکمران سے کسی رنجش کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اب ان پر ذرا روشن ہوا ہوگا کہ عام لوگوں کا ہر وقت کیسے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے... حکمران اشرافیہ اور عوام کے مابین ایک گہری وسیع دراڑ سے شناسائی ہوئی ہوگی۔

اور اس کے ساتھ میرا خیال ہے کہ قونیہ میں میرے دن اب گنے جا چکے۔

ہر سچی محبت اور دوستی کسی غیر متوقع کایا پلٹ کی داستان ہے۔ اگر محبت میں مبتلا ہونے کے بعد بھی ہم پہلے جیسے ہی رہیں تو اس کا مطلب ہے کہ محبت سچی نہیں۔

شاعری، موسیقی اور رقص کی ابتدا کے ساتھ، مولانا رومی کے قلب کے بدلنے کا بڑا حصہ مکمل ہوا۔ کبھی وہ ایک سخت گیر عالم اور مبلغ تھے، جنہیں شاعری ناپسند تھی اور جنہیں دوسروں کو وعظ کرتی اپنی

آواز پسند تھی، وہی مولانا رومی اب خود شاعر ہوتے جا رہے ہیں، خالص خالی پن کی صدا، اگرچہ خود انہیں اس کا پورا ادراک نہیں ہوا۔ جہاں تک میری بات ہے، میں بھی بدل چکا ہوں اور بدل رہا ہوں۔ میں وجود سے عدم میں ڈھل رہا ہوں۔ ایک سے دوسرے موسم میں، ایک سے دوسرے مرحلے میں، زندگی سے موت کی جانب۔

ہماری دوستی ایک نعمت تھی، خدائی تحفہ۔ ہم نے ایک دوسرے کی صحبت میں کامیابی حاصل کی، مسرت پائی، نمو پائی، کامل مسرت۔

مجھے بابا زمان کی ایک بار بتائی گئی بات یاد آئی۔ ریشم کی نشوونما کے لیے، ریشم کے کیڑے کی موت ضروری ہے۔ سب کے رخصت ہونے اور ہلچل ختم ہونے کے بعد، وہیں دالان میں تنہا بیٹھے، میں جانتا تھا کہ مولانا رومی اور میرا ساتھ اب ختم ہونے کو تھا۔ ہماری رفاقت سے مولانا رومی اور میں نے حُسن ازل کو جانا اور ہم نے جانا کہ ایک دوسرے کے عکس کو منعکس کرتے آئینوں کے ذریعے ابدیت کا سامنا کرنا کیسا تھا۔ لیکن پرانا مقولہ اب بھی موزوں ہے: جہاں محبت ہے، وہاں دردِ دل لازم ہوگا۔

ایلا

نارتھمپٹن،29 جون 2008ء

عزیز نے کہا، جب لوگ غیر معمولی اور غیر متوقع حالات کے لیے تیار ہو جائیں تو بے لگام خوابوں سے بھی آگے عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں۔ لیکن ایلا اس سب کے لیے ذرہ برابر تیار نہ تھی جو ہوا: عزیز اے ظہارا اُس سے ملنے بوسٹن چلا آیا۔

وہ اتوار کی شام تھی۔ رابن سٹین خاندان رات کے کھانے کے لیے میز پر ابھی بیٹھا ہی تھا جب ایلا کی توجہ اس کے سیل فون پر ایک ٹیکسٹ میسج نے کھینچی۔ یہ فرض کرتے کہ فیوژن کوکنگ کلب میں سے کسی نے میسج کیا ہوگا، اُس نے فوراً نہیں پڑھا۔ اس کی بجائے وہ رات کا خصوصی کھانا میز پر سجانے لگی، بھُنی بطخ کے ساتھ تلے ہوئے آلو اور پیاز کے ساتھ بھورے چاول۔ جب اُس نے بطخ میز پر سجائی تو ہر کوئی اچھل ہی تو پڑا۔ حتیٰ کہ جینٹ کی بھی اشتہا جاگ اٹھی، جو کہ سکاٹ کو اُس کی نئی گرل فرینڈ کے ساتھ دیکھ کر اور یہ جان کر کہ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی، بہت مایوس تھی۔

اچھی وائن اور معمول کی اِدھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ وہ لمبا ڈنر تھا۔ ایلا میز پر ہر گفتگو میں شامل رہی۔ اپنے شوہر سے اُس نے بالکنی کو نیا شوخ نیلا رنگ کرنے کا مشورہ کیا، جینٹ کے ساتھ اُس نے کالج کے مصروف شیڈول پر بات کی، اور جڑواں بچوں سے اس نے نئی ڈی وی ڈیز لانے کی بات کی، سمیت تازہ ترین Pirates of the Caribbean کے۔ کھانے کے بعد ڈش واشر میں جوٹھے برتن لگانے اور سب کو چاکلیٹ ڈیزرٹ پیش کرنے کے بعد ہی اسے اپنے سیل فون پر پیغامات پڑھنے کا خیال آسکا۔

''ہیلو ایلا، میں سمتھ سونین میگزین کی اسائنمنٹ کے سلسلے میں بوسٹن میں ہوں۔ ابھی جہاز سے اترا ہی ہوں۔ کیا تم مجھ سے ملنا چاہو گی؟ میں اوڈیکس ہوٹل میں مقیم ہوں اور مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ عزیز۔''

ایلا نے فون پرے رکھ دیا اور ڈیزرٹ کے لیے میز پر آگئی۔ وہ ذرا سراسیمہ تھی۔

''میسج آیا تھا؟'' ڈیوڈ نے پلیٹ پر جھکا اپنا سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مشیل کا میسج تھا۔'' ایلا نے لمحے بھر کی بھی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا۔

اپنے کوفت زدہ چہرے کا رخ پھیرتے، ڈیوڈ نے اپنا منہ صاف کیا اور پھر بڑی آہستگی اور نفاست سے نیپکن کو چوکور تہ کرنے لگا۔ ''خوب۔'' تہ کر چکنے کے بعد وہ بولا۔

ایلا جانتی تھی کہ اُس کے شوہر کو اس کی بات کا یقین نہ تھا، ذرہ برابر بھی نہیں، اور پھر بھی اُس نے اپنی بات پر قائم رہنے کا سوچا، اپنے شوہر کو قائل کرنے یا بچوں کو دھوکہ دینے کی خاطر نہیں بلکہ اپنے لیے، اپنے گھر سے عزیز کے ہوٹل کی جانب ایک قدم بڑھانے کو ممکن کرنے کی خاطر۔ سو ہر لفظ کو تولتے ہوئے اس نے کہا، ''اُس نے یہ بتانے کے لیے میسج کیا ہے کہ اگلے سال کی کیٹلاگ پر بات کے لیے کل صبح ایجنسی کی میٹنگ ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں شریک ہوں۔''

''اچھا، پھر تو تمھیں جانا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے ڈیوڈ کی آنکھوں میں چمک ابھری جو اشارہ تھا کہ وہ بھی اس کھیل میں شامل ہو چکا تھا۔ ''کیوں نہ ہم صبح ساتھ ہی چلیں؟ بلکہ میں اپنی چند ایک اپائنٹمنٹ کا وقت تبدیل کر سکتا ہوں۔''

ایلا نے اپنے شوہر کو بدحواسی سے دیکھا۔ وہ کیا کرنے کی کوشش کر رہا تھا؟ کیا وہ بچوں کے سامنے کوئی تماشا چاہتا تھا؟

''یہ تو اچھا ہوگا۔'' اُس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا، ''لیکن پھر ہمیں صبح سات بجے سے پہلے گھر سے نکلنا ہوگا۔ مشیل کہتی ہے کہ وہ باقی سب کی آمد سے پہلے مجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہے۔''

''اوہ، پھر تو بھول ہی جائیں۔'' یہ جانتے ہوئے کہ اُس کے ڈیڈی کو صبح سویرے اُٹھنا کس قدر ناپسند تھا، اورلی نے بیچ میں دخل دیا۔ ''ڈیڈی کبھی صبح سویرے نہیں اُٹھ سکتے!''

اب ایلا اور ڈیوڈ نے، اپنے بچوں کے سروں کے اوپر ایک دوسرے سے برابری پر نظریں ملاتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں ہی دوسرے فریق کی پہل کے منتظر تھے۔

''یہ سچ ہے۔'' ڈیوڈ نے آخرکار اتفاق کیا۔

ایلا نے سکون کا سانس لیتے سر ہلایا۔ اگرچہ اُسے اپنی ہٹ دھرمی پر ذرا شرمندگی سی محسوس ہوئی کیوں کہ اُسی لمحے اُس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا تھا، زیادہ بے باک خیال۔

''ہاں، صبح سویرے کا وقت ہے۔'' اُس نے کہا، ''میں ابھی کیوں نہ چلی جاؤں؟''

کل صبح بوسٹن جانے اور عزیز کے ساتھ ناشتہ کرنے کا تصور ہی اُس کے دل کی دھڑکن بڑھانے کو کافی تھا۔ تاہم وہ عزیز سے ابھی ملنا چاہتی تھی، کل کی بجائے ابھی۔ کل جو اُسے اچانک ہی بہت دُور محسوس ہونے لگا تھا۔ اُس کے گھر سے بوسٹن کا فاصلہ کم وبیش دو گھنٹے کا تھا، لیکن اُسے پرواہ نہ تھی۔ وہ

ایمسٹرڈیم سے اُس کی خاطر وہاں پہنچا تھا۔ وہ اس کی خاطر دو گھنٹے کی ڈرائیو تو کر ہی سکتی تھی۔

''میں آج رات دس بجے سے پہلے بوسٹن پہنچ سکتی ہوں۔ اور کل صبح میں ایجنسی میں وقت سے اتنی پہلے پہنچ سکوں گی کہ میٹنگ سے پہلے مشیل سے مل سکوں۔''

ڈیوڈ کے چہرے پر کرب کا سایہ سا لہرایا۔ کچھ کہنے میں اُسے جیسے زمانے لگ گئے تھے۔ اس طویل لمحے میں، اُس کی آنکھیں ایک ایسے شخص کی آنکھیں تھیں جس میں اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے پاس جانے سے روکنے کی ہمت بچی تھی نہ ہی جذبات۔

''میں آج رات ڈرائیو کر کے بوسٹن جاؤں گی اور رات ہمارے اپارٹمنٹ میں ٹھہروں گی۔'' ایلا نے کہا، بہ ظاہر اپنے بچوں سے لیکن حقیقت میں ڈیوڈ سے۔ یہ اُس کا اپنے شوہر کو یقین دلانے کا انداز تھا کہ وہ جسے بھی ملنے جا رہی تھی، اُس کے ساتھ اُس کا کوئی جسمانی ربط نہ ہوگا۔

ڈیوڈ اپنے ہاتھ میں وائن کا گلاس تھامے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتے وہ ایلا کو دیکھ کر گویا یقین دہانی کو مسکرایا اور کچھ اشتیاق سے بولا۔''ٹھیک ہے ہنی، اگر تم یہی چاہتی ہو تو پھر تمہیں ابھی جانا چاہیے۔''

''لیکن مام، میرا خیال تھا کہ آپ آج میتھس کے ہوم ورک میں میری مدد کریں گی۔'' ایوی نے اعتراض کیا۔

ایلا کو اپنا چہرہ جلتا محسوس ہوا۔''میں جانتی ہوں، ڈیئر۔ ہم یہ کام کل کیوں نہ کر لیں؟''

''اوہ، انہیں جانے دو۔'' اورلی اپنے بھائی کی جانب مڑی اور اسے تنگ کرنے کو بولی، ''تمہیں سارا وقت ماما سے چپکے رہنے کی ضرورت نہیں۔ تم بڑے کب ہو گے؟''

ایوی کی پیشانی پر بل پڑ گئے لیکن اس نے مزید کچھ نہ کہا، اورلی اس کی حمایتی تھی، جینٹ کو کسی صورت کوئی پرواہ نہ تھی۔ یوں ایلا نے اپنا سیل فون اٹھایا اور تیزی سے اوپر چلی گئی۔ اپنے بیڈروم کا دروازہ بند کرتے ہی، اُس نے خود کو بستر پر گرایا اور عزیز کو ٹیکسٹ میسج بھیجا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم یہاں ہو۔ میں دو گھنٹے میں اونکس میں ہوں گی۔''

اُس نے بڑھتی ہوئی گھبراہٹ سے اپنے فون کو گھورا اور میسج جاتے دیکھتی رہی۔ وہ کیا کر رہی تھی؟ لیکن سوچنے کا وقت بالکل نہ تھا۔ اگر آج رات پر اسے پچھتاوا ہونا تھا، جو اُسے شک تھا کہ ہو گا ہی، تو وہ بعد میں پچھتا سکتی تھی۔ اب ضروری تھا کہ وہ جلدی کرتی۔ اُسے نہانے، بال سکھانے، دانت صاف کرنے، لباس منتخب کرنے، اسے اتار کر دوسرا اور پھر تیسرا پہننے، بال بنانے، تھوڑا میک اپ کرنے، وہ چھوٹے ایئر رنگز تلاش کرنے جو اس کی نانی روتھ نے اسے اٹھارھویں سالگرہ پر تحفہ دیئے تھے اور پھر دوبارہ لباس بدلنے میں بیس منٹ لگے تھے۔

گہری سانس بھرتے، اُس نے پرفیوم لگایا۔ Calvin Klein کا Eternity۔ پرفیوم کی بوتل

عرصے سے باتھ روم کی الماری میں منتظر تھی۔ ڈیوڈ کو کبھی بھی پرفیوم پسند نہ تھے۔ وہ کہتا تھا کہ عورتوں سے عورتوں کی اپنی خوشبو آنی چاہیے، ونیلا یا دار چینی کی نہیں۔ لیکن شاید یورپی مردوں کا خیال مختلف ہو، ایلا نے سوچا۔ کیا یورپ میں پرفیوم کو بڑی اونچی شے نہیں سمجھا جاتا؟

فارغ ہونے کے بعد، اس نے آئینے میں نظر آتی عورت کے عکس کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ اُس نے ایلا کو بتایا کیوں نہیں کہ وہ آرہا تھا؟ اگر اُسے علم ہوتا تو وہ ہیئر ڈریسر کے پاس جاتی، مینی کیور اور فیشل کرواتی، اور شاید نیا ہیئر سٹائل ہی بنوا لیتی۔ کیا ہوا گر وہ عزیز کو پسند نہ آئے؟ کیا ہوا گر اُن کی کیمسٹری نہ ملی اور اُسے اتنی دور بوسٹن آنے پر پچھتاوا ہوا؟

یکایک وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ وہ اپنا حلیہ بدلنا کیوں چاہتی تھی؟ اُن کی کیمسٹری ملے یا نہیں، اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ اس آدمی کے ساتھ کوئی بھی مہم جوئی عارضی ہے۔ اُس کا خاندان ہے۔ اُس کی اپنی زندگی ہے۔ اُس کا ماضی یہیں ہے اور اُس کا مستقبل بھی۔ ایسے غیر متوقع منظر ناموں میں گم ہونے پر خود سے خفا، اُس نے اپنے ذہن کے کواڑ بند کر لیے جو ہمیشہ آسان ثابت ہوتا تھا۔

پونے آٹھ بجے، ایلا نے اپنے بچوں کو بوسہ دے کر شب بخیر کہا اور گھر سے نکل آئی۔ ڈیوڈ کہیں دکھائی نہ دیا۔

بوسٹن والے اپارٹمنٹ کی چابیاں اپنے ہاتھ میں چھنکاتے اپنی کار کی طرف بڑھتے، اُس کا دماغ ابھی تک سکتے کی کیفیت میں تھا، لیکن اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

حصہ پنجم

غیب

اشیا جو اپنی عدم موجودگی میں موجود ہیں



سلطان ولد

قونیہ، جولائی 1246ء

بہ مشکل سانس لیتے اور دشواری سے سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے، میرے والد میرے کمرے میں آئے، وہ اُس شخص کا اب سایہ ہی لگ رہے تھے جو وہ کبھی ہوا کرتے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے نیچے سوجن اور سیاہ بدشگون حلقے تھے، یوں جیسے وہ رات بھر جاگتے رہے ہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا، یہ تھی کہ اُن کی ڈاڑھی سفید ہو چکی تھی۔

''میرے بیٹے، میری مدد کرو۔'' انہوں نے ایسی آواز میں کہا، جو اُن کی نہ لگتی تھی۔

میں دوڑ کر اُن کے قریب گیا اور اُن کا بازو تھام لیا۔ ''کچھ بھی بابا، آپ بس حکم کریں۔''

وہ چند لمحے خاموش رہے، یوں جیسے اپنی کہی جانے والی بات کے بوجھ تلے کچلے جا رہے ہوں۔ ''شمس چلے گئے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔''

مختصر ترین لمحے کو میں الجھن اور ایک عجیب طرح کے سکون میں گھر گیا، لیکن اس پر میں نے کچھ نہ کہا۔ اگرچہ یہ بات افسردگی اور حیرانی بھری تھی، لیکن مجھے یہ بھی خیال آیا کہ ہو سکتا تھا اِسی میں بہتری تھی۔ کیا زندگی اب آسان اور پُرسکون نہ ہو جائے گی؟ میرے والد کے گزشتہ عرصے میں کئی دشمن بن گئے تھے، اور یہ سب شمس تبریز کے باعث ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ حالات ویسے ہی ہو جائیں جیسے اُن کے آمد سے پہلے تھے۔ کیا علاؤ الدین کا کہنا ٹھیک ہو سکتا تھا؟ کیا ہم سب شمس تبریز کے بغیر ہی اچھے نہ تھے؟

''مت بھولو کہ میرے نزدیک اُن کی کیا اہمیت ہے۔'' بابا نے یوں کہا جیسے میرے خیالات کو پڑھ لیا ہو۔ ''وہ اور میں ایک ہیں۔ بالکل جیسے چاند کا ایک رُخ روشن اور دوسرا تاریک ہوتا ہے۔ شمس میرا غیر مطیع سرکش رخ ہیں۔''

شرمندہ ہوتے ہوئے میں نے سر ہلا دیا۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ میرے والد کو مزید کچھ کہنا نہ پڑا۔ میں نے ان کی نگاہوں میں اس قدر دکھ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ منہ میں میری زبان جیسے بوجھل ہو گئی۔

کچھ دیر تو میں کچھ بھی نہ بول پایا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم شمس تبریز کو ڈھونڈو... یعنی اگر وہ تلاش کیے جانا چاہتے ہیں تو۔ انہیں واپس لے آؤ۔ اُنہیں بتاؤ میرا دل کس قدر کرب میں ہے۔'' میرے والد کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

''اُنہیں بتاؤ کہ اُن کی جدائی میرے لیے جان لیوا ہے۔''

میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں شمس تبریز کو ڈھونڈ لاؤں گا۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر تشکر کے عالم میں ایسے دبایا کہ مجھے اپنی نگاہیں ان سے پھیرنی پڑیں، کیوں کہ میں نہ چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں میرے تذبذب کو پڑھ لیں۔

☼

پورا ہفتہ میں نے اس امید میں قونیہ کی گلیاں چھانتے گزارا کہ کہیں سے شمس تبریز کے نقوشِ قدم کا کوئی سراغ مل جائے۔ اب تک شہر بھر کو اُن کی گم شدگی کا علم ہو چکا تھا اور ہر کوئی اندازے لگا رہا تھا کہ وہ کہاں ہوں گے۔ میں ایک کوڑھی گداگر سے ملا جسے شمس تبریز سے بہت عقیدت تھی۔ اُس نے مجھے کئی مایوس اور بدنصیب لوگوں کا پتہ بتایا جن کی سرگرداں درویش نے مدد کی تھی۔ مجھے بھی معلوم نہ تھا کہ شمس تبریز سے اتنے لوگ محبت کرتے تھے کیوں کہ وہ ایسے لوگ تھے جو اب تک میرے نزدیک غیر مرئی تھے۔

ایک شام میں تھکا ہارا چکرایا ہوا گھر واپس آیا تو کیرا میرے لیے گلاب کی خوشبو سے بھری چاولوں کی کھیر کا پیالہ لے آئی۔ وہ میرے قریب بیٹھ کر مجھے کھاتے دیکھنے لگی، اُس کی مسکراہٹ کے گرد روحانی کرب کا ایک ہالہ سا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گزشتہ ایک برس میں اس کی عمر کتنی بڑھ گئی تھی۔

''میں نے سنا کہ تم شمس تبریز کو واپس لانے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں گئے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''افواہیں ہیں کہ ہو سکتا ہے وہ دمشق چلے گئے ہوں۔ لیکن میں نے لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا ہے کہ وہ اصفہان، قاہرہ یا اپنی جائے پیدائش تبریز میں سے کہیں چلے گئے ہیں۔ ہمیں ان سب جگہوں پر انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ میں دمشق جاؤں گا اور بابا کے کچھ دوسرے شاگرد باقی تین شہروں کو روانہ ہوں گے۔''

اُس کے چہرے سے ایک سنجیدہ سا تاثر گزرا، اور وہ جیسے بہ آوازِ بلند سوچتے زیرِ لب بولی،

''مولانا شعر کہنے لگے ہیں۔ بہت خوب صورت اشعار۔ شمس تبریز کی جدائی انہیں شاعر بنا رہی ہے۔''

اپنی نگاہ ایرانی قالین کی طرف جھکاتے، اُس کے رخسار نم ہو گئے اور منہ بسورتے ہوئے اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور پھر اس نے یہ شعر پڑھا:

''میں نے الوہی حُسن و جمال بھرا چہرہ لیے بادشاہ کو دیکھا،
وہ جو چشمِ فلک اور شمس ہے۔''

اب فضا میں کچھ ایسا تھا جو لمحہ بھر پہلے وہاں موجود نہ تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ کیرا اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔ کوئی اس کا چہرہ ہی دیکھ کر جان سکتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو کرب کے عالم میں دیکھ کر کس قدر تکلیف میں تھی۔ وہ اُنہیں دوبارہ مسکراتے دیکھنے کی خاطر جو کچھ بھی اس کے بس میں ہوتا، کرنے کو تیار تھی۔ اور پھر وہ اتنی ہی پُرسکون، تقریباً مسرور بھی تھی کہ آخر اُس نے شمس تبریز سے چھٹکارا پا لیا تھا۔

''کیا ہو اگر میں اُنہیں تلاش نہ کر پاؤں؟'' میں نے خود کو کہتے سنا۔

''پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔ ہم پہلے ہی کی طرح رہتے رہیں گے۔'' اُس نے جواب دیا، اُس کی آنکھوں میں امید کی چمک لہرائی۔

اُس لمحے، میں پوری وضاحت سے اور بغیر کسی شک و شبے کے سمجھ گیا کہ اس کا مخفی اشارہ کیا تھا۔ مجھے دمشق جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں اگلے روز ہی قونیہ سے روانہ ہوتا، کچھ عرصہ اِدھر اُدھر گھومتا، راہ گزر کنارے کسی سرائے میں قیام کرتا اور چند ہفتے بعد یہ دکھاوا کرتے واپس لوٹ آتا کہ میں شمس تبریز کو ہر جگہ تلاش کر آیا تھا۔ میرے والد میری بات کا بھروسا کریں گے، اور یہ موضوع ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ شاید یہی بہترین ہو، نہ صرف کیرا اور علاؤالدین کے لیے، جنہیں ہمیشہ شمس تبریز پر شبہ رہا تھا، بلکہ میرے والد کے شاگردوں اور مریدوں کے لیے، اور حتیٰ کہ میرے لیے بھی۔

''کیرا۔'' میں نے کہا، ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

اور یہ عورت جس نے میرے والد سے شادی کے لیے اسلام قبول کیا تھا، جو میرے بھائی اور میری بہت ہی اچھی ماں رہی تھی اور جو اپنے شوہر سے اس قدر محبت رکھتی تھی کہ وہ نظمیں اُسے ازبر تھیں جو اس کا شوہر کسی اور کے لیے لکھتا تھا، اس نے مجھے رنجیدہ نگاہوں سے دیکھا لیکن کچھ نہ بولی۔ اچانک ہی اُس کے پاس کہنے کو کوئی الفاظ نہ رہے تھے۔

جواب مجھے خود ہی تلاش کرنا تھا۔

رومی

قونیہ، اگست 1246ء

بیاباں بن چکی ہے دنیا... شمس سے محروم... جب سے شمس تبریز گئے ہیں، یہ شہر اداس اور سرد مقام بن گیا ہے اور میری روح خالی ہو چکی ہے۔ میں شب بھر سو نہیں پاتا اور دن کو میں اِدھر اُدھر سرگرداں رہتا ہوں۔ میں یہاں ہوں مگر یہیں نہیں ہوں... لوگوں کے درمیان ایک بے روح آسیب۔ میں خود کو لوگوں پر حیران اور خفا ہونے سے روک نہیں پاتا۔ وہ اپنی زندگیاں ایسے کیسے جی سکتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں؟ شمس تبریز کے بغیر زندگی پہلے جیسی کیسے ہو سکتی ہے؟

روزانہ، طلوع سے غروبِ آفتاب تک، میں کتب خانے میں تنہا بیٹھے شمس تبریز کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ مجھے یاد ہے، ایک بار کسی قدر بے درد لہجے میں انہوں نے مجھے بتایا تھا: ''کسی روز آپ صدائے عشق بنیں گے۔''

مجھے اس کا علم تو نہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ آج کل خاموشی مجھے بہت تکلیف دہ لگنے لگی ہے۔ الفاظ مجھے میرے دل کی تاریکی میں روزن فراہم کرتے ہیں۔ یہی تو شمس تبریز چاہتے تھے، ہے ناں؟ مجھے شاعر بنانا چاہتے تھے!

زندگی کاملیت کا نام ہے۔ ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے، چاہے کتنا ہی بڑا یا چھوٹا ہو اور ہر تکلیف جو ہم اٹھاتے ہیں، سب اُس مشیت خداوندی کا کوئی پہلو ہے، جو اپنے انجام کو پہنچ کر رہتی ہے۔ جدوجہد انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ اسی لیے قرآن میں فرمایا گیا:

''جن لوگوں نے ہمارے راستے میں جدوجہد کی، ہم ان کو ضرور اپنے رستوں پر چلائیں گے۔'' (سورہ عنکبوت، آیت 69) خدا کی حکمت و منصوبے میں اتفاق نام کی کوئی شے نہیں۔ اور تقریباً دو برس پہلے اُس روز سرِ راہ شمس تبریز سے میری ملاقات اتفاقیہ نہ تھی۔

''میں ہوا سے اڑتا آپ کے پاس اتفاق سے نہیں پہنچا۔'' شمس تبریز نے کہا تھا۔

اور پھر اُنہوں نے مجھے ایک قصہ سنایا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک صوفی شیخ اس قدر باعلم تھے کہ لوگ کہتے تھے کہ ان میں روح مسیح پھونکی گئی تھی۔ اُن کا صرف ایک ہی مرید تھا اور جس سے بھی انہیں نوازا گیا تھا، وہ اس پر خوش تھے۔ لیکن اُن کے مرید کی سوچ مختلف تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ ہر کوئی اس کے مرشد کی طاقتوں پر حیرت زدہ ہو، وہ ملتجی رہتا کہ مرشد اپنے پیروکاروں کی تعداد بڑھائیں۔

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر مرشد راضی ہو گئے۔ ''اگر تمہیں اس سے خوشی ملتی ہے، تو جو تم کہو، میں کروں گا۔''

ایک روز وہ بازار گئے۔ ایک دکان پر، پرندوں کی شکل کی مٹھائی رکھی تھی۔ شیخ کے اُن پر پھونک مارتے ہی، وہ پرندے زندہ ہو کر ہوا میں اُڑ گئے۔ شہر کے لوگ بالکل لاجواب ہو کر اُن کی تحسین میں اُن کی گرد جمع ہو گئے۔ اُس روز کے بعد، شہر کا ہر شخص اس شیخ کی تعریف و تحسین کرنے لگا۔ جلد ہی اُن کے گرد پیروکاروں اور عقیدت مندوں کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ پرانا مرید اب اُن سے مل بھی نہ پاتا تھا۔

''اوہ شیخ، میں غلطی پر تھا۔ پرانے ایام ہی بہتر تھے۔'' مرید نے افسردگی سے آہ بھری۔

''کچھ کیجئے۔ ان سب کو بھگا دیجئے خدارا۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر اسی میں تمہاری خوشی ہے تو میں اُن سب کو بھگا دوں گا۔''

اگلے دن اپنے وعظ کے دوران، شیخ کی ریاح خارج ہو گئی۔ اُن کے پیروکار ششدر رہ گئے۔ ایک ایک کر کے وہ مڑے اور باہر نکلتے چلے گئے۔ صرف ان کا پرانا مرید باقی رہ گیا۔

''تم بھی دوسروں کی طرح چلے کیوں نہ گئے؟'' شیخ نے پوچھا۔

اور مرید نے جواب دیا، ''میں پہلی ہوا چلنے پر آپ کے پاس نہیں آیا تھا، نہ ہی دوسری کے باعث چھوڑ کر جاؤں گا۔''

☼

شمس تبریز نے جو کچھ بھی کیا، میری تکمیل کی خاطر کیا۔ شہر کے لوگ یہ کبھی نہیں سمجھ پائے۔ شمس تبریز نے جانتے بوجھتے افواہوں کے شعلوں کو ہوا دی، آسانی سے مشتعل ہونے والوں کو چھیڑا اور ایسے الفاظ ادا کیے جو عام کانوں کو کفر محسوس ہوئے، جو لوگوں کو صدمہ پہنچاتے اور اشتعال دلاتے، حتیٰ کہ ان کو بھی جو ان سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے میری ساری کتابیں آب برد کر دیں، مجھے مجبور کیا کہ وہ سب فراموش کر دوں جو میں جانتا تھا۔ اگرچہ سب نے سن رکھا تھا کہ وہ شیوخ اور علما کو تنقید کا نشانہ بناتے تھے، کم ہی لوگ واقف تھے کہ وہ خود تفسیر کرنے کے کتنے قابل تھے۔ شمس تبریز کو کیمیا، فلکیات، علم نجوم، الٰہیات، فلسفہ اور منطق کا گہرا علم تھا، لیکن وہ اپنا علم بے خبر آنکھوں سے مخفی رکھتے تھے۔ وہ اگرچہ ایک فقیہہ تھے، وہ ظاہر یوں کرتے جیسے فقیر ہوں۔

انہوں نے ہمارے دروازے ایک طوائف کے لیے کھولے اور ہمیں اس کے ساتھ کھانا بانٹنے پر مجبور کیا۔ اُنہوں نے مجھے مے خانے بھیجا اور شرابیوں سے بات کرنے پر میری حوصلہ افزائی کی۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے اُس مسجد کے سامنے بھیک منگوائی جہاں میں وعظ دیا کرتا تھا، یہ کہ میں خود کو کوڑھی گداگر کی جگہ رکھ کر دیکھوں۔ پہلے تو اُنہوں نے مجھے میرے عقیدت مندوں سے دُور کیا، پھر حکمران اشرافیہ سے، انہوں نے مجھے عام لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا عادی بنایا۔ اُن کی بدولت مجھے ان لوگوں کو جاننے کا موقع ملا، دوسری صورت میں جن سے میرا ملنا کبھی نہ ہوتا۔ اُن کے خیال میں، بندے اور خدا کے درمیان موجود ہر بت کو گرانا لازم ہے، بشمول شہرت، دولت، رتبہ، حتیٰ کہ مذہب کے بتوں کو، شمس تبریز نے وہ سب زنجیریں کاٹ ڈالیں جو مجھے اُس زندگی سے جوڑے ہوئے تھیں، جس سے میں شناسا تھا۔ اُنہوں نے جہاں کہیں کوئی ذہنی حد بندی یا کوئی تعصب دیکھا، اُس کا بڑی بہادری سے سامنا اور مقابلہ کیا۔

اُن کے لیے میں آزمائشوں اور امتحانات، حالتوں اور مراحل سے گزرا، جن میں سے ہر کسی نے مجھے اپنے انتہائی وفادار پیروکاروں کی نگاہوں میں بھی ابتر بنا ڈالا۔ پہلے میرے بہت سے عقیدت مند تھے؛ اب مجھے سامعین کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک کے بعد ایک ضرب لگا کر، شمس تبریز میری نیک نامی کا بت توڑنے میں کامیاب رہے۔ اُن کے سبب مجھے دیوانگی کی قدر ہوئی اور میں نے تنہائی، بے بسی، تہمت، خلوت نشینی اور آخر میں شکستہ دلی کے ذائقے کو جانا۔

''جو کچھ بھی تمہیں منافع بخش لگے، اس سے دور بھاگو!
زہر پیو اور آبِ حیات کو پرے کر دو!
تحفظ کو ترک کر دو اور وحشت انگیز مقامات پر رہو!
اپنی نیک نامی کو جھٹک دو، بے عزت اور بے حیا بن جاؤ!''

آخر میں، کیا ہم سب ہی آزمائشوں سے نہیں گزرتے؟ ہر روز، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ، خدا ہم سے پوچھتا ہے، کیا تمہیں وہ عہدِ الست یاد ہے جو ہم نے تمہیں اس جہان میں بھیجنے سے قبل کیا تھا؟ کیا تم میرے خزانے کے انکشاف میں اپنے کردار کو سمجھتے ہو؟

بیشتر اوقات، ہم ایسے سوالات کے جواب دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ بہت دہشت انگیز ہوتے ہیں۔ لیکن خدا صابر ہے۔ وہ بار بار پوچھتا ہے۔

اور اگر یہ دردِ دل بھی کسی آزمائش کا حصہ ہے تو میری واحد آرزو یہ ہے کہ میں اس کے آخر میں شمس کو پاؤں۔ میری کتابیں، خطبے، خاندان، دولت یا نام... میں اُن کا چہرہ صرف ایک بار اور دیکھنے کی خاطر کچھ بھی اور سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں۔

اگلے روز کیرا نے کہا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی شاعر ہوتا جا رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے شعرا کو ایسا پسند کبھی نہیں کیا، مجھے یہ سن کر حیرت نہ ہوئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اُس کی کہی بات پر اعتراض

کرتا، لیکن اب نہیں۔

میرے منہ سے بلا ارادہ اور بے اختیار مصرعے ادا ہوتے ہیں اور اُنہیں سن کر کوئی بھی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ میں بلاشبہ شاعر ہو گیا ہوں۔ زبان کا سلطان! لیکن جہاں تک میں سچ بیان کرسکتا ہوں، یہ نظمیں میری نہیں۔ میں ان حروف کی محض ایک سواری ہوں جو میرے منہ میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ کسی قلم کی طرح جو وہی الفاظ لکھتا ہے جنہیں تحریر کرنے کا اسے حکم دیا جاتا ہے یا اُس بانسری کی طرح جس سے وہی دھن نکلتی ہے جو اس میں پھونکی جاتی ہے، میں بھی بس اپنا کردار نبھا رہا ہوں۔

''تبریز کے حیرت انگیز شمس! کہاں ہو تم؟''

شمس

دمشق، اپریل 1247ء

بہار دمشق میں اپنے جوبن پر تھی اور قونیہ سے میری رخصتی کو دس مہینے ہو چکے تھے، جب سلطان ولد نے مجھے تلاش کر لیا۔ نیلے آسمان تلے، میں فرانسس نامی عیسائی راہب کے ہمراہ شطرنج کھیل رہا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جس کا اندرونی توازن بہ آسانی ڈگمگاتا نہ تھا، ایک شخص جو تسلیم و رضا کے معانی سے واقف تھا۔ اور چوں کہ اسلام کا مطلب ہے باطنی سکون جو تسلیم و رضا سے ملتا ہے، میرے نزدیک فرانسس ان لوگوں سے کہیں زیادہ مسلمان تھا جو ایسا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ چالیس اصولوں میں سے ایک ہے:

''راضی بہ رضا رہنے کا مطلب کمزور یا غیر متحرک ہونا نہیں۔ یہ تقدیر پرستی پر منتج ہوتا ہے نہ ہی مشروط اطاعت پر۔ یہ بالکل برعکس ہے۔ اصل طاقت تسلیم و رضا میں ہی ہے... وہ طاقت جو ہمارے اپنے اندر سے اٹھتی ہے۔ زندگی کے الوہی جوہر کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے بلاتشویش ابدی سکون سے رہتے ہیں، چاہے ارد گرد کی پوری دنیا ایک کے بعد ایک شورش سے گزر رہی ہو۔''

میں نے اپنے وزیر کو آگے بڑھایا تاکہ فرانسس کا بادشاہ اپنی جگہ بدلے۔ تیزی سے اور بہادرانہ فیصلے کے ساتھ، اُس نے رُخ کو حرکت دی۔ مجھے شبہ سا ہونے لگا تھا کہ میں یہ بازی ہار جاؤں گا جب میں نے نگاہ اٹھائی اور سلطان ولد کو اپنے سامنے کھڑے پایا۔

''تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' میں نے کہا، ''سو آخر کار تم نے میری تلاش کا فیصلہ کر ہی لیا۔''

اُس نے ایک پشیمان مسکراہٹ سے مجھے دیکھا۔ پھر وہ یہ جان کر حیران اور افسردہ ہو گیا کہ مجھے اُس کی اندرونی کشمکش کی خبر تھی۔ لیکن چوں کہ وہ ایک راست گو شخص تھا، اُس نے سچائی سے انکار نہیں کیا۔

''میں نے آپ کو ڈھونڈنے کی بجائے کچھ وقت اِدھر اُدھر گھومتے گزارا۔ لیکن کچھ عرصے بعد

میں مزید ایسا نہ کر پایا۔ میں اپنے والد سے مزید جھوٹ بولنے کا متحمل نہ ہو سکا۔ میں دمشق آ گیا اور آپ کی تلاش شروع کی، لیکن آپ کا ملنا آسان نہ تھا۔''

''تم ایک ایمان دار آدمی اور اچھے بیٹے ہو۔'' میں نے کہا، ''کسی روز جلد ہی تم اپنے والد کے اچھے رفیق ثابت ہو گے۔''

سلطان ولد نے رنجیدگی سے اپنا سر جھٹکا۔ ''آپ واحد رفیق ہیں جس کی انہیں ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ میرے ہمراہ قونیہ واپس چلیں۔ میرے والد کو آپ کی ضرورت ہے۔''

اس دعوت کا سن کر میرے ذہن میں کئی باتیں آئیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی پہلے واضح نہ تھی۔ ایسی جگہ واپسی کے خیال پر جہاں واضح طور پر میں ایک ناپسندیدہ شخص تھا، میرے نفس کا ردعمل خوف بھرا تھا۔

اس کی مت سنو۔ تم اپنا کام مکمل کر چکے۔ تمہیں قونیہ واپس جانے کی ضرورت نہیں۔ یاد کرو کہ بابا زمان نے تمہیں کیا بتایا تھا۔ یہ بے حد خطرناک ہے۔ اگر تم دوبارہ اُس شہر گئے تو پھر کبھی زندہ واپس نہ لوٹ سکو گے۔

میں دنیا کا سفر کرتے رہنا، نئے لوگوں سے ملنا اور نئے شہر دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے دمشق بھی پسند آیا تھا اور اگلے موسم سرما تک میں بہ آسانی یہاں ٹھہر سکتا تھا۔ کسی نئی جگہ کے سفر سے اکثر اوقات انسان کی روح میں تنہائی اور اُداسی کا ایک خوف انگیز احساس بیدار ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی ہمراہی میں، میں اپنی تنہائی پر مطمئن اور قانع تھا۔

تاہم میں بہ خوبی واقف تھا کہ میرا دل قونیہ میں تھا۔ مجھے مولانا رومی کی یاد اس قدر ستاتی تھی کہ ان کا نام پکارنا بھی میرے لیے باعث کرب تھا۔ آخر کار اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ میں کس شہر میں رہوں، اگر مولانا رومی میرے ساتھ نہ تھے؟ وہ جہاں کہیں تھے، وہی میرا قبلہ تھا۔

میں نے شطرنج کی بساط پر اپنے بادشاہ کو آگے بڑھایا۔ اپنی شہ مات کو دیکھ کر فرانسس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مگر زندگی کی طرح شطرنج میں بھی، کچھ چالیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ جیت کی خاطر چلتے ہیں اور کچھ ایسی چالیں ہوتی ہیں جو آپ صرف اس خاطر چلتے ہیں کہ وہی کرنا درست ہوتا ہے۔

''خدارا، میرے ساتھ چلیے۔'' سلطان ولد نے میرے خیالوں کا سلسلہ منقطع کرتے التجا کی۔ ''جو لوگ آپ کے متعلق افواہیں پھیلاتے تھے اور آپ سے بدسلوکی کرتے تھے، وہ انتہائی شرمندہ ہیں۔ اس مرتبہ سب کچھ بہتر ہو گا، میرا وعدہ ہے۔''

میرے بچے، تم ایسے وعدے نہیں کر سکتے، کوئی بھی نہیں کر سکتا! میں اُسے بتانا چاہتا تھا۔

لیکن اس کی بجائے میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا، ''میں ایک اور مرتبہ دمشق کا غروب آفتاب دیکھنا چاہوں گا۔ کل ہم قونیہ کے لیے روانہ ہو سکتے ہیں۔''

''واقعی؟ آپ کا شکریہ!'' سلطان ولد کا چہرہ طمانیت سے لو دے اٹھا۔ ''آپ نہیں جانتے اس سے میرے بابا کو کس قدر مسرت ہو گی۔''

پھر میں فرانسس کی طرف مڑا، جو صبر سے منتظر تھا کہ میں کھیل کی طرف واپس آؤں۔ میری مکمل توجہ پا کر، اُس کے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''خبردار، میرے دوست۔'' اُس نے فاتحانہ لہجے میں کہا، ''شہ مات۔''

کمیا

قونیہ، مئی 1247ء

بے ریا نگاہ میں پُراسراریت اور اپنے رویے میں ایسی اجنبیت لیے، جو اُن میں پہلے کبھی نہ تھی، شمس تبریز میری زندگی میں واپس لوٹ آئے۔ لگتا تھا کہ وہ بہت بدل گئے تھے۔ اُن کے بال اتنے لمبے ہو چکے تھے کہ آنکھوں میں پڑتے، اُن کی رنگت دمشق کی دھوپ میں سنولا گئی تھی، وہ دیکھنے میں زیادہ نوجوان اور وجیہہ ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ اور بھی تھا، کچھ ایسی تبدیلی جو میری فہم میں نہ آ رہی تھی۔ اُن کی ہمیشہ جیسی روشن اور بے فکر سیاہ آنکھوں میں، اب نئی قسم کی چمک تھی۔ میں خود کو یہ شبہ کرنے سے روک نہ پائی کہ وہ ایسے شخص کی نگاہیں تھیں جو زندگی میں سب کچھ دیکھ چکا ہو اور اسے مزید کوئی جستجو نہ رہی ہو۔

لیکن میرا خیال ہے کہ مولانا رومی کے اندر اس سے کہیں گہری تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ شمس تبریز واپس آ جائیں تو اُن کی سب پریشانیاں تحلیل ہو جائیں گی، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ جس روز شمس تبریز واپس آئے، مولانا رومی نے شہر کی فصیل سے باہر پھولوں کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ لیکن جب اوّلین دنوں خوشی ذرا ماند پڑی تو مولانا رومی پہلے سے زیادہ مضطرب اور خلوت گزیں دکھائی دیے۔ میرا خیال ہے کہ میں سبب جانتی ہوں۔ شمس تبریز کو ایک بار کھو دینے کے بعد، اُنھیں دوبارہ کھونے کا خدشہ ہے۔ میں اس بات کو کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر سمجھ سکتی ہوں، کیوں کہ میں بھی اُنھیں کھونے سے خائف ہوں۔

واحد انسان جس سے میں اپنے احساسات بانٹ سکتی ہوں، وہ ہے گوہر، مولانا رومی کی مرحوم بیوی۔ خیر، تکنیکی طور پر وہ انسان نہیں، لیکن میں اُسے بھوت بھی نہیں کہہ سکتی۔ اُن بھوت یا آسیب سے کم خواب ناک اور اجنبی، جن سے میں واقف رہی ہوں، جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں، گوہر میرے اطراف پانی کے سست رَو بہاؤ کی طرح حرکت کرتی ہے۔ اگرچہ ہم ہر موضوع پر باتیں کرتے رہے تھے، لیکن کچھ عرصے سے ہمارے درمیان صرف ایک ہی موضوع ہے: شمس تبریز۔

''مولانا رومی بہت پریشان نظر آتے ہیں۔ کاش میں اُن کی کوئی مدد کر سکتی۔'' آج میں نے گوہر سے کہا۔

''شاید تم مدد کر ہی سکتی ہو۔ آج کل اُن کے دماغ پر کوئی بات حاوی ہے، لیکن ابھی تک انہوں نے اس بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔'' گوہر نے پُراسراریت سے کہا۔

''کیا بات؟'' میں نے پوچھا۔

''مولانا رومی کا خیال ہے اگر شمس تبریز شادی کر لیں تو شہر کے لوگوں کی مخالفت میں کمی آجائے گی۔ افواہیں کم ہو جائیں گی اور شمس تبریز کو یہاں سے پھر کہیں نہیں جانا پڑے گا۔''

میرا دل لحظہ بھر کو رک گیا۔ شمس تبریز کی شادی ہو رہی تھی! مگر کس کے ساتھ؟

گوہر نے مجھے ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگی، ''مولانا رومی سوچ رہے ہیں کہ کیا تم شمس تبریز سے شادی کرنا چاہو گی۔''

میں حیران و ششدر رہ گئی۔ ایسا نہ تھا کہ شادی کا خیال کوئی پہلی بار میرے ذہن میں آیا تھا۔ اب پندرہ سال کی عمر میں میں جانتی تھی کہ میں شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی، لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ لڑکیاں شادی کے بعد ہمیشہ کے لیے بدل جاتی ہیں۔ اُن کی نگاہ بدل جاتی ہے اور وہ نیا رویہ سیکھ لیتی ہیں، اس حد تک کہ لوگ اُن سے مختلف طور پر برتاؤ کرنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ ننھے بچے بھی کسی شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لڑکی میں فرق بتا سکتے ہیں۔

گوہر نرمی سے مسکرائی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ جان گئی تھی کہ مجھے شادی سے گھبراہٹ ہو رہی تھی، شمس تبریز سے شادی پر نہیں۔

☼

اگلے روز سہ پہر میں مولانا رومی سے ملنے گئی تو اُنہیں ''تہافت التہافت'' کے مطالعے میں گم پایا۔

''بتاؤ، کمیا۔'' اُنہوں نے محبت سے کہا، ''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''جب میرے بابا مجھے آپ کے پاس لائے تھے تو آپ نے انہیں کہا تھا کہ کوئی لڑکی اتنی اچھی طالب علم نہیں بن سکتی جتنا کہ کوئی لڑکا، کیوں کہ اسے شادی کرنا اور بچے پالنا ہوتے ہیں، کیا آپ کو یاد ہے؟''

''بالکل، مجھے یاد ہے۔'' مولانا رومی نے اپنی بادامی آنکھوں میں تجسس بھرے جواب دیا۔

''اُس روز میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ میں کبھی بھی شادی نہیں کروں گی تاکہ میں ہمیشہ آپ کی شاگرد رہوں۔'' میں نے کہا۔ میری آواز اس بات کے بوجھ تلے لرز رہی تھی جو میں کہنے جا رہی تھی۔

''لیکن شاید ایسا ممکن ہے کہ شادی ہو جائے اور مجھے یہ گھر بھی نہ چھوڑنا پڑے۔ میرا مطلب ہے، اگر میری

شادی کسی ایسے سے ہو جائے جو یہیں رہتا ہو..."

"کیا تم مجھے یہ بتا رہی ہو کہ تم علاؤالدین سے شادی کرنا چاہتی ہو؟" مولانا رومی نے پوچھا۔

"علاؤالدین؟" میں نے حیرت کے عالم میں دہرایا۔ لیکن اُنہیں یہ خیال بھی کیسے آیا کہ میں علاؤالدین سے شادی کرنا چاہتی تھی؟ وہ میرے لیے بھائی جیسا تھا۔

مولانا رومی نے یقیناً میری حیرانی بھانپ لی ہوگی۔ "کچھ عرصہ پہلے علاؤالدین میرے پاس آیا اور اس نے تمہارا ہاتھ مجھ سے مانگا تھا۔" اُنہوں نے بتایا۔

میں نے گہری سانس بھری۔ میں جانتی تھی کہ مناسب نہ تھا کہ کوئی لڑکی ایسے معاملات میں زیادہ سوال کرتی، لیکن میں مزید جاننے کے لیے بے چین تھی۔ "اور آپ نے کیا کہا، آفندی؟"

"میں نے اُسے بتایا کہ مجھے پہلے تم سے پوچھنا ہوگا۔" مولانا رومی نے جواب دیا۔

"آفندی..." میں نے بتدریج دھیمے پڑتے لہجے میں کہا، "میں یہ بتانے آئی ہوں کہ میں شمس تبریز سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

مولانا رومی نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ "کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے؟"

"یہ کئی طرح سے بہتر ہوگا۔" میں نے کہا۔ میرے اندر مزید کچھ کہنے کی ضرورت اور ضرورت سے زیادہ بولنے کے پچھتاوے میں ایک کشمکش جاری تھی۔ "شمس تبریز ہمارے خاندان کا حصہ بن جائیں گے اور اُنہیں دوبارہ یہاں سے کہیں جانا نہیں پڑے گا۔"

"تو کیا تم اس وجہ سے اُن سے شادی کرنا چاہتی ہو؟ یہاں قیام میں ان کی مدد کی خاطر؟" مولانا رومی نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے کہا، "میرا مطلب ہے، ہاں، لیکن صرف یہی بات نہیں... میرا ماننا ہے کہ شمس تبریز میرا نصیب ہیں۔"

میں کسی کے سامنے بس اسی قدر اعتراف کر سکتی تھی کہ میں شمس تبریز سے محبت کرتی تھی۔

☼

شادی کی خبر سب سے پہلے کیرا نے سنی۔ ششدر خاموشی میں ایک شکستہ دل مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اس خبر کا خیر مقدم کیا۔ لیکن جیسے ہی ہم گھر میں اکیلے رہ گئے، وہ مجھ سے سوالات پوچھنے لگی۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ایسا ہی چاہتی ہو؟ تم صرف مولانا رومی کی مدد کی خاطر ایسا نہیں کر رہی، ہے ناں؟" اُس نے کہا، "تم اتنی کم عمر ہو! تمہارا نہیں خیال کہ تمہیں اپنے کسی ہم عمر سے شادی کرنی چاہیے؟"

"شمس تبریز کہتے ہیں، محبت میں حدیں دھندلا جاتی ہیں۔" میں نے اُسے بتایا۔

کیرا نے بآوازِ بلند آہ بھری۔ "میری بچی، کاش یہ سب اتنا ہی سادہ ہوتا۔" اُس نے اپنے بالوں کی لٹ سر پوش میں اڑستے تبصرہ کیا۔ "شمس سرگرداں درویش ہے، ایک سرکش انسان۔ اُس جیسے مرد

خانگی زندگی کے عادی نہیں ہوتے اور وہ کبھی اچھے شوہر ثابت نہیں ہوتے۔"

"کوئی بات نہیں، وہ بدل سکتے ہیں۔" میں نے مضبوط لہجے میں گویا بات ختم کی۔ "میں اُنہیں اتنی محبت اور مسرتیں دوں گی کہ اُنہیں بدلنا ہی ہوگا۔ وہ ایک اچھے شوہر اور باپ بننا سیکھ جائیں گے۔"

یہ ہماری گفتگو کا اختتام تھا۔ میرے چہرے پر کیرا نے جو بھی دیکھا ہو، اُس کے پاس مزید کوئی اعتراضات نہ بچے تھے۔

وفورِ مسرت سے اور پُرعزم محسوس کرتے ہوئے اُس شب میں بڑے سکون سے سوئی۔ مجھے علم نہ تھا کہ میں ایسی سب سے عام اور انتہائی تکلیف رساں غلطی کرنے جارہی تھی جو ہر زمانے میں عورتیں کرتی آئی ہیں: اپنی سادہ لوحی میں یہ خیال کر لینا کہ اپنی محبت سے وہ اُن مردوں کو تبدیل کر سکتی ہیں جن سے وہ محبت کرتی ہوں۔

کیرا

قونیہ، مئی 1247ء

بات کرنا اور محبت جیسے گہرے اور نازک موضوع پر بات کرنا، یوں ہے جیسے طوفانی ہوا کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنا۔ آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ طوفانی ہوا کیا تباہی لانے کو ہے، لیکن اس کی شدت کو کم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ پھر میں نے، کمیا سے مزید کوئی سوال نہ کیا، اس لیے نہیں کہ میں اس کے جوابات پر قائل ہو گئی تھی بلکہ اس لیے کہ مجھے اُس کی آنکھوں میں محبت گزیدہ عورت دکھائی دے گئی تھی۔ میں نے اس شادی پر مزید سوال اٹھانا بند کر دیا، اسے زندگی کی عجیب چیزوں کی طرح قبول کرتے ہوئے جن پر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔

ماہِ رمضان تیزی اور مصروفیت سے گزر گیا، مجھے اس معاملے پر دوبارہ سوچنے کا وقت نہ ملا۔ عید اتوار کے روز آئی۔ اس کے چار روز بعد ہم نے کمیا کو شمس تبریز سے بیاہ دیا۔

شادی سے ایک روز قبل شام، کچھ ایسا ہوا جس نے میرا سارا مزاج ہی بدل دیا۔ میں باورچی خانے میں اکیلی بیٹھی گندھا آٹا اور بیلن لیے مہمانوں کے لیے روٹیاں بنا رہی تھی۔ اچانک، بغیر سوچے کہ میں کیا کر رہی ہوں، میں گندھا آٹا لے کر اُس سے ایک شبیہ بنانے لگی۔ میں نے مقدس مریمؑ کا چھوٹا سا مجسمہ بنایا۔ میری مقدس ماں مریمؑ۔ چاقو کی مدد سے، میں نے لمبا لبادہ اور چہرہ تراشا، پُرسکون اور شفیق چہرہ۔ میں اس سب میں اس قدر مگن تھی کہ مجھے بالکل احساس نہ ہوا کہ میرے عقب میں کوئی آ کھڑا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے جو تم بنا رہی ہو، کیرا؟''

میرے سینے میں میرا دل جیسے اُچھل پڑا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجھے شمس تبریز دروازے میں کھڑے استفہامیہ نگاہوں سے خود کو دیکھتے ملے۔ مجھے آٹے کو چھپانے کا خیال آیا، لیکن دیر ہو چکی تھی۔ شمس تبریز طشت کے قریب چلے آئے اور آٹے سے بنی شبیہ دیکھنے لگے۔

''کیا یہ مریمؑ ہیں؟'' اُنہوں نے پوچھا اور میرے کوئی جواب نہ دینے پر وہ چمکتے چہرے کے ساتھ میری جانب مڑے۔ ''یہ بہت خوب صورت ہیں۔ کیا تمہیں ان کی یاد ستاتی ہے؟''

''میں عرصہ قبل اسلام قبول کر چکی ہوں۔ میں ایک مسلمان عورت ہوں۔'' میں نے روکھے پن سے جواب دیا۔

لیکن شمس تبریز نے اپنی بات یوں جاری رکھی جیسے اُنہوں نے سنا ہی نہ ہو۔ ''شاید تم سوچتی ہو کہ اسلام میں مریمؑ جیسی کوئی خاتون شخصیت کیوں نہیں۔ یقیناً حضرت عائشہؓ ہیں، اور بے شک حضرت فاطمہؓ ہیں، لیکن تم سوچ سکتی ہو کہ یہ ایک سی بات نہیں۔''

نہ جانتے ہوئے کہ کیا کہوں، مجھے بے چینی محسوس ہوئی۔

''کیا میں تمہیں ایک قصہ سنا سکتا ہوں؟'' شمس تبریز نے پوچھا۔

اور پھر یہ تھا جو انہوں نے مجھے بتایا:

ایک دفعہ چار مسافر محو سفر تھے، ایک یونانی، ایک عرب، ایک ایرانی اور ایک ترک۔ کسی چھوٹے سے قصبے پہنچنے پر انہوں نے کچھ کھانے کو خریدنے کا فیصلہ کیا۔ رقم چوں کہ کم تھی سو ان کے پاس انتخاب زیادہ نہ تھا۔ ہر ایک نے کہا کہ اس کے دماغ میں دنیا کے بہترین کھانا تھا۔ جب پوچھا گیا کہ کیا، تو ایرانی بولا، ''انگور۔'' یونانی نے کہا، ''سٹے فلیون۔'' عرب کہنے لگا، ''عنب'' اور ترک بولا، ''اُزوم۔'' ایک دوسرے کی زبان سے اجنبی ہونے کے باعث وہ آپس میں تکرار کرنے لگے۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ زیادہ برہم اور تلخ ہوتے ہوئے وہ آپس میں جھگڑتے رہے، یہاں تک کہ اتفاق سے قریب سے گزرتے ایک درویش نے مداخلت کی۔ جمع شدہ رقم سے درویش انگور خرید لایا۔ پھر اُس نے انگوروں کو ایک برتن میں ڈال کر کچلا۔ اس نے رس مسافروں کو پلا دیا اور چھلکے پھینک دیئے کیوں کہ اہم شے پھل کا ست یا جوہر تھا، اس کی بیرونی یا ظاہری صورت نہیں۔

''عیسائی، یہودی اور مسلمان اُن مسافروں کی طرح ہیں۔ جہاں لوگ ظاہری صورت پر جھگڑتے ہیں، صوفی درویش کو اصل جوہر کی طلب ہوتی ہے۔'' شمس تبریز نے مجھے ایسی مسکراہٹ سے دیکھتے کہا جو اس جوش وخروش کا اظہار تھی کہ جس سے متاثر نہ ہونا مشکل تھا۔

''میں یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی سبب نہیں کہ تم مقدس مریمؑ کی کمی محسوس کرو کیوں کہ تمہیں اُنہیں چھوڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کسی مسلمان عورت کی حیثیت سے، تم اب بھی خود کو اُن سے منسوب محسوس کر سکتی ہو۔''

''میں... میرا نہیں خیال کہ یہ ٹھیک ہوگا۔'' میں ہکلا سی گئی۔

''میں نہیں دیکھتا کہ آخر کیوں نہیں۔ مذاہب دریاؤں کی مانند ہیں: وہ سب ایک ہی سمندر کی جانب بہتے ہیں۔ مقدس مریمؑ دردمندی، رحم، شفقت اور غیر مشروط محبت کی علامت ہیں۔ وہ انفرادی بھی

ہیں اور آفاقی بھی۔ ایک مسلمان عورت کی حیثیت سے بھی، تم اُن سے عقیدت رکھ سکتی ہو اور حتیٰ کہ اپنی بیٹی کو مریم نام دے سکتی ہو۔''

''میری کوئی بیٹی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہو جائے گی۔''

''کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں؟''

''میں یہ جانتا ہوں۔''

مجھے یہ الفاظ سن کر جوش بھری خوشی ہوئی، لیکن زیادہ دیر نہ گزری کہ یہ جوش ایک اور احساس سے زائل ہو گیا: احساسِ یکجہتی۔ طمانیت اور ہم آہنگی کے ایک غیر معمولی لمحے کو بانٹتے، ہم نے مقدس مریم کی اُس شبیہ کو دیکھا۔ شمس تبریز کے لیے میرا دل نرم پڑ گیا اور اُن کی ہمارے گھر آمد کے بعد سے پہلی مرتبہ، میں وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہوئی، جو مولانا رومی کو اُن میں دکھائی دیا تھا: ایک کشادہ دل آدمی۔

پھر بھی، مجھے اس بات میں شبہ تھا کہ وہ، کمیا کے لیے اچھے شوہر ثابت ہو سکیں گے۔

ایلا

بوسٹن، 29 جون 2008ء

جب تک ایلا ہوٹل پہنچی، وہ اس قدر تناؤ میں تھی کہ ٹھیک سے کچھ بھی سوچ نہ سکی۔ لابی میں جاپانی سیاحوں کا ایک گروپ جمع تھا، وہ سب اپنی عمر کی آٹھویں دہائی میں تھے اور سب کے بالوں کا انداز ایک سا تھا۔ دیواروں سے لگی تصویروں کا جائزہ لیتے کہ اسے اپنے آس پاس لوگوں کی آنکھوں میں دیکھنا نہ پڑے، وہ لابی سے گزری۔ لیکن اُس کے تجسس کو اُس کی بزدلی کو ہرانے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اور جس لمحے اُس کی نگاہ ملاقاتیوں کے گوشے کی طرف اٹھی، اُسے وہ خود کو دیکھتا ہوا نظر آیا۔

وہ خاکی قمیص اور کاڈرائے کا گہرے رنگ کا ٹراؤزر پہنے ہوئے تھا اور اس کی شیو دو روز کی بڑھی ہوئی تھی جو ایلا نے سوچا کہ اُسے زیادہ پُرکشش بنا رہی تھی۔ اُس کے سرخی مائل بھورے گھنگھرالے بال اُس کی سبز آنکھوں میں پڑ رہے تھے، اسے بہ یک وقت با اعتماد اور شریر سا دکھاتے ہوئے لگتے تھے۔ دبلا پتلا، کم وزن، وہ مہنگے سوٹوں میں ملبوس ڈیوڈ سے بہت مختلف دکھائی دیا۔ اُس کا لہجہ دیہاتی سکاٹش تھا، جو ایلا کو دلکش لگا۔ وہ اُسے دیکھ کر حقیقت میں خوش اور پُرجوش ہوتے ہولے سے مسکرا دیا۔ اور ایلا خود اپنے آپ سے یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی کہ اُس کے ساتھ کافی کا ایک کپ پینے میں حرج ہی کیا تھا۔

بعد میں، ایلا کو یاد نہ رہتا کہ کافی کا وہ ایک کپ کئی کپ میں کیسے بدلا، یا یہ کہ اُن کی گفتگو اتنی جلدی بے تکلف کیسے ہوئی، یا کیسے اُس نے ایلا کا ہاتھ تھام کر اُس کی انگلیوں کی پوروں کو بوسہ دیا، بالکل جیسے وہ یہ نہ بتا سکے گی کہ اُس نے عزیز کو روکنے کو کچھ کیا کیوں نہیں۔ کچھ دیر کے بعد کچھ بھی فرق پڑنا ختم ہو گیا، جب تک کہ وہ بولتا رہا اور وہ اچٹتی نگاہ سے اُس کے رخسار پر ہونٹوں کے قریب پڑتے ڈمپل کو دیکھتے یہ سوچتی رہی کہ وہاں بوسہ دینا کیسا محسوس ہوگا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ ہوٹل میں ایسے شخص کے ساتھ تھی جس کے بارے وہ کچھ نہ جانتی تھی، ماسوائے چند ای میلز اور فون کالز اور ایک ناول کے جو اُس نے تحریر کیا تھا۔

''سو تم یہاں سمتھ سونین میگزین کے کام کے سلسلے میں آئے ہو؟'' ایلا نے پوچھا۔

''دراصل، میں یہاں تمہارے لیے آیا ہوں۔'' عزیز نے جواب دیا، ''تمہارا خط پڑھنے کے بعد، میں یہاں آ کر تم سے ملنا چاہتا تھا۔''

اب بھی، اس تیز شاہراہ پر باہر نکلنے کے تمام ممکنہ راستے کھلے تھے۔ ایک خاص لمحے تک، یوں ظاہر کرنا ممکن تھا کہ سب بس دوستانہ تھا... ای میلز، فون کالز، حتیٰ کہ اُن کی نگاہیں بھی۔ قدرے فلرٹ بھری اور چنچل، شاید... لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ وہ لکیر کھینچ سکتی تھی۔ یعنی اُس سے پہلے جب اُس نے پوچھا، ''ایلا، کیا تم میرے ہمراہ میرے کمرے میں چلنا پسند کرو گی؟''

اگر وہ دونوں یہ کھیل رہے تھے تو تبھی تھا کہ وہ کھیل سنجیدہ ہو گیا۔ اُس کے سوال نے سب کچھ بے حد حقیقی بنا دیا، یوں جیسے نقاب ہٹ گیا ہو اور سچ، عریاں سچ جو شروع سے ہی موجود تھا، اب اُن کے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ ایلا کو اپنے پیٹ میں اینٹھن سی محسوس ہوئی، ایک اٹھتی ہوئی بے آرامی جسے اُس نے گھبراہٹ کے طور پر پہچانا، مگر اُس نے عزیز کی بات کو رَد بھی نہ کیا۔ یہ اُس کی زندگی کا انتہائی اضطراری فیصلہ تھا جو اُس نے کبھی کیا، تاہم اُسی لمحے اسے یہ بھی محسوس ہوا جیسے اُس کے لیے فیصلہ پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔ اُسے اس فیصلے کو بس قبول کرنا تھا۔

☼

کمرا نمبر 608 سیاہ، سرخ، سرمئی اور بھورے رنگوں میں بہت خوبی سے سجایا گیا تھا۔ وہ گرم اور کشادہ تھا۔ ایلا نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخری بار وہ ہوٹل میں کب ٹھہری تھی۔ اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ عرصہ پہلے مونٹریال کے ایک ٹرپ کی یاد اُس کے ذہن میں ابھری۔ اس کے بعد، وہ اپنی ہر تعطیلات رہوڈ آئی لینڈ پر اپنے گھر ہی گزارتے تھے اور اُس کے پاس ایسی جگہ قیام کی کوئی وجہ نہ تھی جہاں روزانہ تولیے بدلے جاتے اور ناشتہ دوسرے تیار کرتے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں قیام یوں تھا جیسے کسی دوسرے ملک میں ہونا۔ اور شاید وہ تھی بھی۔ اُسے پہلے ہی ایسی سبک سی آزادی کا احساس ہوا، جو کوئی صرف ایسے شہر میں محسوس کر سکتا تھا جہاں ہر کوئی بالکل اجنبی ہو۔

لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کی گھبراہٹ عود کر آئی۔ آرائش چاہے کتنی ہی خوش ذوق تھی اور کمرا چاہے کتنا ہی کشادہ تھا، کنگ سائز بیڈ کمرے کے عین وسط میں تھا۔ اس کے برابر کھڑا ہونا اُسے عجیب اور خطاوار سا لگا۔ وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچتے اندرونی سوالات کی کشمکش کا شکار ہونے لگی۔ کیا اب وہ ہم وصل ہوں گے؟ ہونا چاہیے؟ اگر ایسا ہوا تو وہ یہاں سے واپسی پر اپنے شوہر سے نگاہ کیسے ملا پائے گی؟ لیکن ڈیوڈ کو تو، اپنے بے شمار معاشقوں کے باوجود، اس سے نظر ملانے میں کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی، ہے ناں؟ اور عزیز اُس کے بدن کے بارے کیا سوچے گا؟ کیا ہو اگر وہ عزیز کو پسند نہ آئے؟ کیا اسے اس وقت اپنے بچوں کا نہیں سوچنا چاہیے؟ وہ سو گئے ہوں گے یا اس وقت جاگتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہے ہوں

گے؟ اگر انہیں معلوم ہوا کہ وہ کیا کرنے والی ہے تو کیا وہ اُسے کبھی معاف کر پائیں گے؟

اُس کی بے چینی محسوس کرتے عزیز نے اُس کا ہاتھ تھاما اور اُسے بیڈ سے دور ایک گوشے میں رکھی کرسی تک لے آیا۔

''ہش۔'' اُس نے سرگوشی کی، ''تمہارے دماغ میں خیالوں کا بڑا ہجوم ہے۔ بہت ساری آوازیں، شور۔''

''کاش ہم پہلے ملے ہوتے۔'' ایلا نے خود کو کہتے سنا۔

''زندگی میں کوئی جلدی یا تاخیر نہیں ہوتی۔'' عزیز نے کہا، ''ہر کام اپنے درست وقت پر ہوتا ہے۔''

''کیا تمہیں واقعی اس بات کا یقین ہے؟''

وہ مسکرایا اور بالوں کی لٹ اپنی آنکھوں سے پرے ہٹائی۔ پھر اُس نے سوٹ کیس کھولا اور وہ غالیچہ نکالا جو اس نے گوئٹے مالا سے خریدا تھا اور ایک چھوٹا ڈبہ جس میں فیروزی اور سرخ مونگے کے موتیوں میں نقرئی رقصاں درویش والا ایک نیکلس تھا۔

ایلا نے عزیز کو وہ ہار اُسے پہنانے دیا۔ جہاں جہاں اُس کی انگلیوں نے اُسے چھوا، اُسے وہاں حدت محسوس ہوئی۔ ''کیا تم مجھ سے محبت کر سکتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تم سے پہلے ہی محبت کرتا ہوں۔'' عزیز مسکرا دیا۔

''لیکن تم مجھے جانتے تک نہیں!''

''محبت کرنے کے لیے جاننے کی ضرورت نہیں۔''

ایلا نے آہ بھری۔ ''یہ دیوانگی ہے۔''

عزیز گھوم کر اُس کے عقب میں آیا اور اُس کے بالوں میں لگی پن کھینچ کر اُس کے بال کھول دیئے۔ پھر اس نے اُسے نرمی سے بیڈ پر لٹا دیا۔ آہستگی سے، نرمی سے اور بڑھتے دائروں کی صورت وہ اپنی ہتھیلیاں اُس کے پیروں سے اس کے ٹخنوں اور وہاں سے اس کے پیٹ کی طرف لایا۔ اس تمام عرصے میں وہ زیرِ لب کچھ پڑھتا رہا تھا جو ایلا کو کسی خفیہ قدیم منتر جیسا لگا۔ پھر اچانک وہ سمجھ گئی۔ وہ دعا مانگ رہا تھا۔ جب اس کے ہاتھ اس کے بدن کے ہر حصے کو چھو رہے تھے، اس کی آنکھیں سختی سے بند رہیں اور اُس کے ہونٹ ایلا کے لیے دعا کرتے رہے۔ یہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا روحانی تجربہ تھا۔ اور اگرچہ وہ اپنے لباس میں ملبوس رہی اور عزیز بھی، وہ ایسا ہیجان خیز ترین احساس تھا جو اس نے کبھی محسوس کیا ہو۔

یک دم اسے اپنی ہتھیلیوں، اپنی کہنیوں، اپنے شانوں، اپنے سارے بدن میں ایک عجیب توانائی کے ساتھ سنسنی دوڑتی محسوس ہوئی۔ وہ ایک بے پناہ چاہت کے غلبے تلے تھی، یوں جیسے وہ گرم لہر در لہر پانیوں پر تیر رہی ہو، جہاں وہ بس اتنا کر سکتی تھی کہ سر جھکا دے اور مسکرا دے۔ اُس نے عزیز کے

گرد کوئی زندہ موجودگی محسوس ہوئی اور پھر اپنے گرد، یوں جیسے وہ دونوں کسی روشنی میں نہا گئے ہوں۔

اب اُس نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جیسے بغیر کسی سہارے کے کسی سرکش دریا کے تیز بہاؤ میں تیر رہی تھی۔ اس کے آخر میں کوئی آبشار ہو سکتی تھی، وہ بس اتنا جانتی تھی، لیکن چاہے وہ رک بھی سکتی، اسے یقین نہ تھا کہ وہ رکنا چاہتی بھی تھی یا نہیں۔

عزیز کے لمس پر ایلا کو اپنے بدن میں حدت جاگتی محسوس ہوئی۔ اسے اپنے جسم کے متعلق عدم تحفظ سا محسوس ہوا، اس کا بدن جو تین بچوں کی پیدائش کے بعد ان برسوں میں پہلے جیسا نہ رہا تھا، لیکن یہ اضطراب آیا اور گزر گیا۔ خوش طبع اور خود کو تقریباً محفوظ محسوس کرتے اس پر مسرت کا احساس چھا گیا۔ اور اسی طرح اُسے ادراک ہوا کہ وہ اس آدمی سے محبت کر سکتی تھی۔ وہ اُسے بے پناہ محبت کر سکتی تھی۔

اسی کیفیت میں اُس نے عزیز کے گرد اپنی بانہیں ڈال دیں اور اسے اپنی جانب کھینچا۔ لیکن عزیز نے یکدم اپنی آنکھیں کھولیں، ایلا کی ناک پر بوسہ دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔

''تم مجھے چاہتے نہیں؟'' اپنی آواز کی کمزوری پر حیرت زدہ، ایلا نے پوچھا۔

''میں ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتا جو بعد میں تمہیں ناخوش کر دے۔''

اُس کے وجود کے نصف حصے نے رونا چاہا اور باقی نصف حصہ مسرور ہو گیا۔ ایک عجیب سی ہلکی پھلکی سی کیفیت نے اُسے گرفت میں لے لیا۔ وہ بالکل الجھی ہوئی تھی، لیکن اسے حیرت تھی کہ اُسے یوں الجھنا بھی ٹھیک محسوس ہوا۔

رات کے ڈیڑھ بجے ایلا نے بوسٹن میں اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بیڈ پر سونے کی بجائے، لیدر کے کاؤچ پر دراز ہو گئی۔ اس لیے نہیں کہ وہ جانتی تھی کہ اُس کا شوہر وہاں دوسری عورتوں کو لاتا رہتا تھا بلکہ اس لیے کہ اُسے یوں ہی اچھا لگ رہا تھا، یوں جیسے یہ گھر کسی ہوٹل کے کمرے سے زیادہ اُس کی ملکیت نہ تھا، یوں جیسے وہ یہاں مہمان تھی اور اُس کی اصل ذات کہیں اور منتظر تھی۔

شمس

قونیہ، مئی 1247ء

بے انتہا حسین دلہن، تم رونا مت
اپنی ماں سے وداع ہو، بابا کو الوداع کہو
کل تم پرندوں کو چہچہاتے سنو گی
اگرچہ سب کچھ پہلے جیسا کبھی نہ ہوگا...

ہماری شادی کی رات، میں چپکے سے باہر صحن میں نکل آیا اور کچھ دیر وہاں بیٹھا گھر سے اٹھتی کئی دوسری آوازوں کے ساتھ ایک پرانے اناطولی گیت کی صدا سنتا رہا۔ ہنسی، موسیقی، اِدھر اُدھر کی باتیں۔ خواتین کی طرف گانے والیاں گاتی بجاتی رہیں۔ میں وہاں کھڑا بیک وقت سوچتا اور گنگناتا، کانپتا اور مبہوت محسوس کرتا رہا۔ میں نے گیت کے بولوں پر غور کیا۔ عورتیں شادی کی رات ہمیشہ اداسی بھرے گیت ہی کیوں گاتی تھیں؟ صوفیا موت کو شادی سے ملاتے اور اپنی موت کے دن کا جشن خدا سے وصل کے طور پر مناتے۔ عورتیں بھی، اگرچہ بالکل مختلف وجوہات کی بنا پر، شادی کو موت سے ملاتیں۔ چاہے شادی خوشی سے ہی ہو رہی ہوتی، اداسی کی کوئی لہر اُن پر چھا جاتی۔ شادی کے ہر جشن پر اُس دوشیزہ کا ماتم ہوتا، جسے جلد ہی بیوی اور پھر ماں بن جانا تھا۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد، میں گھر میں آیا اور ایک خاموش گوشے میں مراقبہ کیا۔ پھر میں اس کمرے میں چلا آیا جہاں کیمیا میری منتظر تھی۔ میں نے اسے سنہری دھاگوں سے تزئین شدہ سفید لباس پہنے بستر پر بیٹھے پایا، اُس کے بالوں کی چوٹیاں بنا کر اُنہیں موتیوں سے سجایا گیا تھا۔ اُس کے تاثرات دیکھنا ناممکن تھا کیوں کہ اُس کا چہرہ موٹے سرخ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ کھڑکی کے پاس ٹمٹماتی شمع کے سوا کمرے میں کوئی روشنی نہ تھی۔ دیوار پر آویزاں آئینے کو مخملیں کپڑے سے ڈھانپا گیا تھا، کیوں کہ شادی کی رات دلہن کا آئینے میں اپنا عکس دیکھنا بدشگونی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے بستر کے سرہانے ایک انار

اور چاقو رکھا تھا تا کہ ہم پھل کھا سکیں اور اس کے دانوں کی تعداد کے برابر ہمارے بچے ہوں۔

کیرا نے مجھے مقامی رسوم کے بارے میں بتایا تھا، یہ یاد دلایا تھا کہ مجھے دلہن کا نقاب اٹھاتے وقت اسے طلائی سکوں کا ہار تحفے میں دینا تھا۔ لیکن میرے پاس زندگی میں طلائی سکے کبھی بھی نہ رہے تھے اور میں اپنی دلہن کا استقبال کسی سے سکے قرض لے کر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے، کیما کا نقاب اٹھاتے ہوئے میں نے اُسے کچھوے کے خول سے بنا کنگھا پیش کیا اور اُسے بوسہ دیا۔ وہ مسکرا دی۔ لمحے بھر کو مجھے اتنی شرم آئی جیسے کوئی ننھا بچہ شرماتا ہے۔

''تم بہت حسین ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ شرم سے سرخ پڑ گئی۔ لیکن پھر اس نے اپنے کندھے اچکائے، اپنی پوری کوشش کی کہ وہ اس سے زیادہ پرسکون اور سمجھدار دکھائی دے، جتنی وہ ہو سکتی تھی۔

''میں اب آپ کی بیوی ہوں۔'' وہ کہنے لگی۔

پھر اُس نے فرش پر بچھے خوب صورت قالین کی طرف اشارہ کیا، جو اُس نے اپنے جہیز کے طور پر بہت محنت سے خود تیار کیا تھا۔ رنگین اور شوخ۔ اسے دیکھتے ہی میں جان گیا کہ قالین کی ہر گرہ اور ہر نمونہ میرے متعلق تھا۔ کیما قالین نہیں اپنے خوابوں کو بنتی رہی تھی۔

میں نے اُسے دوبارہ بوسہ دیا۔ اُس کے لبوں کی گرمی نے میرے جذبات کو جگا دیا۔ اُس سے چنبیلی اور جنگلی پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اُس کے پہلو میں دراز ہوتے ہوئے، میں نے اُس کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا اور اس کے گداز بدن کا لمس محسوس کیا۔ میں اُس کے اندر کھو جانا چاہتا تھا۔ اُس نے خود کو یوں میرے سپرد کر دیا، جیسے گلاب کی کلی بارش میں کھل جاتی ہے۔

میں پرے ہٹ گیا۔ ''مجھے معاف کر دو، کیما، میں یہ سب نہیں کر سکتا۔''

ساکت اور حیران، سانس لینا بھی بھول کر، اس نے مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں مایوسی کی شدت کو برداشت کرنا دشوار تھا۔ میں اپنے پیروں پر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے جانا ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''آپ ابھی نہیں جا سکتے۔'' کیما نے ایسی آواز میں کہا جو بالکل بھی اس کی نہ لگتی تھی۔ ''لوگ کیا کہیں گے، اگر ابھی آپ کمرے سے چلے گئے؟ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ شادی اپنی تکمیل کو نہیں پہنچی۔ اور وہ سمجھیں گے کہ ایسا میری وجہ سے ہوا۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے گویا خود کلامی کرتے زیرِ لب کہا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

اپنی نگاہ پھیرتے، وہ کچھ ناقابلِ فہم سا بڑبڑائی اور پھر اس نے دھیرے سے کہا، ''لوگ سمجھیں گے کہ میں باکرہ نہ تھی۔ مجھے ذلت سے جینا پڑے گا۔''

معاشرہ اپنے افراد پر ایسے مضحکہ خیز اصول نافذ کرتا تھا، اس پر میرا خون کھول اٹھا۔ غیرت کے ان قوانین کا اس ہم آہنگی سے کوئی لینا دینا نہ تھا جو خدا نے تخلیق کی تھی بلکہ اس کا تعلق اُس نظام سے تھا جو انسان برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

''یہ احمقانہ بات ہے۔ لوگوں کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔'' میں نے اعتراض کیا، لیکن میں جانتا تھا کہ رکمیا ٹھیک کہہ رہی تھی۔

میں نے انار کے ساتھ رکھا چاقو جھپٹ کر اٹھالیا۔ میں نے رکمیا کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھی، آہستگی سے جس کی جگہ ایسے شخص کے تاثرات نے لے لی جس نے ایک افسردہ صورتِ حال کو بھانپ کر قبول کرلیا ہو۔ میں نے اپنی بائیں ہتھیلی پر بغیر ہچکچائے زخم لگایا۔ میرے خون کے قطرے بستر کی چادر پر گہرے قرمزی داغ چھوڑ گئے۔

''انہیں یہ چادر دے دینا۔ یہ اُن کے منہ بند کر دے گی اور تمہارا نام صاف اور بے داغ رہے گا، جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔''

''رُکیے، برائے مہربانی! مت جائیے۔'' رکمیا نے استدعا کی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، لیکن نہ جانتے ہوئے کہ اب کیا کرے، اُس نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی، ''میں اب آپ کی بیوی ہوں۔''

اُس لمحے میں سمجھ گیا کہ اُس سے شادی کر کے میں کس قدر بڑی خطا کر چکا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ میں رات کی تاریکی میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے جیسے شخص کو شادی کبھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ازدواجی ذمے داریاں نبھانا میری فطرت میں ہی نہ تھا۔ میں نے صراحت سے یہ جان لیا۔ لیکن وہ اس علم کی قیمت تھی، جس نے مجھے افسردہ کر دیا۔

میرا شدت سے جی چاہا کہ ہر شے سے دور بھاگ جاؤں، نہ صرف اِس گھر، اِس شادی اور اِس شہر سے، بلکہ اِس جسم سے بھی جو مجھے بخشا گیا تھا۔ تاہم اگلی صبح مولانا رومی کو دیکھنے کے خیال نے مجھے وہیں باندھے رکھا۔ میں اُنہیں دوبارہ چھوڑ کر نہ جا سکا۔

میں پھنس چکا تھا۔

علاؤالدین

قونیہ، مئی 1247ء

بالجبر ایسا فیصلہ کر کے بھی میں خاموش رہا، اگرچہ میں جانتا تھا بعد میں مجھے اس پر تاسف ہوگا۔ میں نے کھل کر اس شادی پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ لیکن جس روز، کمیا کی شادی شمس تبریز سے ہونا تھی، میں ایسے شدید درد کے ساتھ نیند سے بیدار ہوا جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ میں بستر پر اُٹھ بیٹھا اور کسی ڈوبتے شخص کی طرح ہانپنے لگا اور پھر اپنی خودترسی پر اپنے آپ سے خفا ہو کر میں نے بار بار اپنے چہرے پر طمانچے رسید کیے۔ ایک گھٹی ہوئی سانس میرے ہونٹوں سے آزاد ہوئی۔ اور یہی وہ آواز تھی جس پر مجھے ادراک ہوا کہ میں اب اپنے والد کا بیٹا نہ رہا تھا۔

میری کوئی ماں نہ تھی۔ نہ کوئی باپ۔ نہ کوئی بھائی۔ اور کوئی، کمیا نہیں۔ میں اس دنیا میں بالکل تنہا تھا۔ میرے دل میں اپنے والد کا جو احترام بچا تھا، رات بھر میں وہ بھی ختم ہو گیا۔ کمیا اُن کے لیے بیٹی جیسی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اُنہیں اُس کی پرواہ تھی۔ لیکن بہ ظاہر جس واحد شخص کی انہیں پرواہ تھی، وہ تھا شمس تبریز۔ وہ، کمیا کی شادی اُس جیسے شخص سے کیسے کر سکتے ہیں؟ کوئی بھی دیکھ سکتا تھا کہ شمس بہت برا شوہر ثابت ہوتا۔ میں نے جتنا اس بارے میں سوچا، اتنا ہی واضح ہوتا گیا کہ صرف شمس تبریز کو تحفظ دینے کی خاطر، میرے والد نے، کمیا کی خوشی قربان کر دی تھی... اور اس کے ساتھ میری بھی۔

میں نے سارا دن شادی کی تیاریاں دیکھتے ہوئے انہی سوچوں میں الجھتے ہوئے گزارا۔ گھر کو سجایا گیا تھا اور جس کمرے میں نئے شادی شدہ جوڑے کو سونا تھا، وہاں سے بدروحیں بھگانے کو اسے عرق گلاب سے دھویا گیا تھا۔ لیکن وہ سب سے بڑی بدروح کو بھول ہی گئے! وہ شمس تبریز کو کیسے بھگاتے؟

سہ پہر تک میں یہ سب مزید نہ جھیل پایا۔ اس تقریب کا حصہ نہ بننے پر پُرعزم، جو میرے لیے صرف باعث اذیت تھی، میں نے دروازے کا رخ کیا۔

''علاؤالدین، ٹھہرو! تم کہاں جا رہے ہو؟'' پیچھے سے میرے بھائی کی بلند اور تیز آواز آئی۔

''میں آج شب ارشاد کے گھر ٹھہروں گا۔'' میں نے اُس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

''دیوانے ہو گئے ہو؟ تم شادی کے لیے رک کیوں نہیں سکتے؟ اگر بابا نے سنا تو انہیں دکھ ہوگا۔''

میں اپنے اندر غصہ ابلتے محسوس کر سکتا تھا۔ ''ان دلوں کے بارے کیا خیال ہے جو بابا توڑ رہے ہیں؟''

''تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟''

''تمہیں سمجھ نہیں آئی؟ بابا نے اس شادی کا انتظام صرف شمس تبریز کو خوش کرنے کی خاطر اور اس لیے کیا ہے کہ وہ دوبارہ نہ بھاگ جائے! انہوں نے کمیا کو چاندی کے طشت میں اُسے پیش کر دیا۔''

میرے بھائی نے رنجیدہ دکھائی دیتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچے۔ ''میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو، مگر تم غلطی پر ہو۔ تم اسے زبردستی کی شادی سمجھتے ہو۔'' اُس نے کہا، ''جب کہ کمیا تھی جو شمس تبریز سے شادی کرنا چاہتی تھی۔''

''یوں جیسے اُسے اِس معاملے میں انتخاب کا حق تھا۔'' میں نے تڑخ کر جواب دیا۔

''اوہ، خدایا! تم سمجھتے کیوں نہیں؟'' میرے بھائی نے اپنے دونوں ہاتھ یوں اٹھاتے ہوئے بے ساختہ کہا جیسے خدا سے مدد طلب کر رہا ہو۔ ''وہ شمس تبریز کی محبت میں گرفتار ہے۔''

''دوبارہ ایسا مت کہنا۔ یہ سچ نہیں ہے۔'' میری آواز پگھلتی برف کی مانند چیخ گئی۔

''میرے برادر'' سلطان ولد نے کہا، ''برائے مہربانی اپنے جذبات کا پردہ اپنی آنکھوں پر مت ڈالو۔ تمہیں حسد ہو رہا ہے۔ لیکن حسد کو بھی تعمیری طور پر کسی بڑے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ عدم یقین بھی مثبت ہو سکتا ہے۔ یہ اصولوں میں سے ایک ہے۔ اصول نمبر پینتیس: اس دنیا میں، ہم مماثلت یا یکسانیت سے نہیں بلکہ کھلے تضاد کے باعث آگے بڑھتے ہیں۔ اور اس کائنات کے متضاد ہم میں سے ہر ایک کے اندر موجود ہیں۔ اس لیے کسی مومن کو خود اپنے اندر بسے کافر سے ملنا چاہیے۔ اور کسی کافر کو اپنے اندر موجود خاموش مومن کو پہچاننا چاہیے۔ جب تک کہ کوئی انسانِ کامل کے مقام تک پہنچے، تب تک ایمان ایک بتدریج عمل ہے اور اس سفر میں اس کے بظاہر متضاد کا ہونا لازم ہے: عدم یقین۔''

یہ میرے لیے آخری تنکا تھا۔

''اِدھر دیکھو، میں ان جذباتی صوفیانہ باتوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ اس کے ساتھ، مجھے تمہاری بات کیوں سننا چاہیے؟ یہ سب تمہاری غلطی ہے! تم شمس تبریز کو دمشق ہی چھوڑ آتے۔ تم اُسے واپس لائے ہی کیوں؟ اگر حالات خراب ہوئے اور مجھے یقین ہے کہ خراب ہوں گے ہی، تو ذمہ دار تم ہی ہو گے۔''

میرے بھائی نے ایسے تاثر کے ساتھ منہ بھینچا جو خوف کی حد کو پہنچ رہا تھا۔ اس لمحے مجھے ہماری زندگیوں میں پہلی بار ادراک ہوا کہ وہ مجھ سے اور اُس سب سے خائف تھا جو میں کرنے کے قابل تھا۔ وہ

بے تکا لیکن عجیب طور پر تسلی آمیز احساس تھا۔

ارشاد کے گھر جاتے ہوئے میں نے بدبودار ذیلی گلیوں کا انتخاب کیا تا کہ کوئی بھی مجھے روتے نہ دیکھ سکتا۔ اس دوران میں ایک ہی بات سوچ سکا: شمس تبریز اور کمیا ایک دوسرے کے قریب تھے۔ شمس کے اپنے بدصورت کھردرے ہاتھوں سے، کمیا کی دودھیا جلد کو چھونے کا تصور ہی میرے نزدیک نفرت انگیز تھا۔ میرے پیٹ میں گرہیں سی پڑ گئیں۔

میں جانتا تھا کہ حد پار کی جا چکی تھی۔ کسی کو کچھ کرنا چاہیے تھا۔

کِمیا

قونیہ، دسمبر 1247ء

بیوی اور شوہر... ہمیں ہونا تو یہی چاہیے تھا۔ ہماری شادی ہوئے سات ماہ ہو چکے ہیں۔ اس سارے عرصے میں وہ ایک بار بھی شوہر کی حیثیت سے میرے قریب نہیں آئے۔ میں جس شدت سے لوگوں سے یہ حقیقت چھپانے کی کوشش میں ہوں، اتنا ہی مجھے شبہ ہے کہ وہ باخبر ہیں۔ بعض اوقات مجھے خدشہ ہونے لگتا ہے کہ میری ذلت میرے چہرے پر عیاں ہے۔ میری پیشانی پر لکھی تحریر کی طرح، یہ پہلی شے ہے جو مجھے دیکھنے والوں کو نظر آتی ہے۔ گلی میں ہمسائیوں سے بات کرتے، باغ میں کام کرتے یا بازار میں پھیری فروشوں سے مول تول کرتے، لوگوں حتیٰ کہ اجنبیوں کو بھی، ایک ہی نگاہ میں معلوم ہو جاتا ہے کہ میں شادی شدہ مگر ابھی تک باکرہ ہوں۔

ایسا نہیں ہے کہ شمس تبریز کبھی میرے کمرے میں آتے ہی نہیں۔ وہ آتے ہیں۔ جس شام بھی وہ میرے پاس آنا چاہیں، وہ پہلے اجازت لیتے ہیں۔ اور ہر مرتبہ میں ایک ہی جواب دیتی ہوں۔

''بالکل، آجائیے۔'' میں کہتی ہوں، ''آپ میرے شوہر ہیں۔''

پھر سارا دن میں اپنی سانس روکے، یہ امید اور دعا کرتے، ان کی منتظر رہتی ہوں کہ اس بار ہماری تکمیل ہو جائے گی۔ لیکن جب وہ بالآخر میرے دروازے پر دستک دیتے تو وہ بس بیٹھ کر باتیں ہی کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ بیٹھ کر کتابیں پڑھنا بھی انہیں پسند ہے۔ ہم نے لیلیٰ و مجنوں، فرہاد و شیریں، یوسف زلیخا، گلاب و عندلیب... ان عشاق کی داستانیں پڑھیں جنہوں نے باوجود ناموافق حالات کے ایک دوسرے سے محبت کی۔ ان داستانوں کے مرکزی کرداروں کی مضبوطی اور عزم کے باوجود، مجھے یہ کہانیاں مایوس کن لگیں۔ شاید اس لیے کہ اپنے اندر گہرائی میں میں یہ بات جانتی تھی کہ میں ایسی محبت کا ذائقہ کبھی نہ چکھ پاؤں گی۔

جب کتابوں کا مطالعہ نہ کرتے تو شمس تبریز سرگرداں یا قلندری صوفیوں کے چالیس اصولوں

کی باتیں کرتے... مذہب عشق کے بنیادی اصول۔ ایک بار جب وہ کسی اصول کی وضاحت کر رہے تھے، اُنہوں نے اپنا سر میری آغوش میں رکھ دیا۔ اُنہوں نے آہستگی سے اپنی آنکھیں موند لیں اور اُن کی آواز دھیمی ہو کر سرگوشی میں ڈھل گئی، وہ سو گئے۔ میری انگلیاں اُن کے لمبے بالوں کو سہلانے لگیں اور میرے لبوں نے اُن کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ وہ لمحہ لگتا تھا جیسے ابد تک پھیل گیا، پھر اُنہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ مجھے اپنی طرف جھکاتے انہوں نے نرمی سے مجھے بوسہ دیا۔ وہ ہمارے درمیان فرحت بخش ترین لمحہ تھا۔ لیکن بس اتنا ہی تھا۔ آج تک ان کا جسم میرے لیے اُنجان براعظم کی طرح ہے، اور میرا اُن کے لیے۔

ان سات مہینوں میں، میں بھی کئی مرتبہ ان کے کمرے میں گئی۔ لیکن ہر بار میں بغیر اطلاع ہی جاتی ہوں، میرا دل بے چینی سے سکڑ جاتا ہے کیوں کہ میں کبھی نہیں بتا سکتی کہ وہ میرا خیر مقدم کیسے کریں گے۔ شمس تبریز کے مزاج کی پیش گوئی بھی ممکن نہیں۔ کبھی کبھار وہ اتنے گرم جوش اور محبت بھرے ہوتے ہیں کہ میں اپنا سارا دکھ درد بھول جاتی ہوں، لیکن پھر بعض اوقات وہ بہت تند خو ہو جاتے ہیں۔ ایک بار اُنہوں نے یہ کہتے زور سے دروازہ مجھ پر بند کر دیا کہ وہ تنہائی چاہتے تھے۔ میں نے سیکھ لیا ہے کہ برہم نہ ہوں، بالکل جیسے میں یہ سمجھ چکی ہوں کہ جب وہ گہرے مراقبے میں ہوں تو مخل نہ ہوں۔

شادی کے بعد کئی مہینے میں نے دوسروں سے زیادہ اپنے سامنے دکھاوا کیا کہ میں مطمئن تھی۔ میں نے خود کو مجبور کیا کہ میں شمس تبریز کو شوہر کے سوا کچھ بھی سمجھوں: دوست، ساتھی، معلم، رفیق، حتیٰ کہ بیٹا بھی۔ دن کے مطابق، ان کے مزاج کے مطابق، میں انہیں ایک یا دوسرا کردار دیتی اور اپنے تخیل میں انہیں مختلف لباس اور روپ دیتی۔

اور کچھ عرصہ تو اس سے فائدہ ہوا بھی۔ کسی توقع کے بغیر، میں اُن سے گفتگو کی منتظر رہنے لگی۔ مجھے بے حد مسرت ہوتی کہ جب وہ میرے خیالات کی تعریف کرتے اور مزید تخلیقی پن سے سوچنے کو میری حوصلہ افزائی کرتے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور وقت کے ساتھ میں نے جانا کہ میں بھی انہیں کچھ سکھا سکتی تھی جیسا کہ خانگی زندگی کی خوشیاں، جن کا ذائقہ اُنہوں نے پہلے کبھی نہ چکھا تھا۔ آج تک میرا خیال ہے کہ میں اُنہیں اس طرح ہنسا سکتی ہوں، جیسے اور کوئی نہیں ہنسا سکتا۔

لیکن یہ سب کافی نہ تھا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، میں اپنے ذہن کو اس سوچ سے آزاد نہیں کروا سکی کہ وہ مجھ سے محبت نہ کرتے تھے۔ مجھے کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ مجھے پسند کرتے تھے اور میرا بھلا چاہتے تھے۔ لیکن یہ پسند محبت کے قریب تک نہ تھی۔ یہ اتنا رنج بھرا خیال تھا جو مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا، میرے روح و بدن کو کتر رہا تھا۔ میں اپنے اردگرد لوگوں سے، دوستوں اور ہمسایوں سب سے، بالکل لاتعلق سی ہو گئی۔ اب میں اپنے کمرے میں رہنے اور مُردہ لوگوں سے بات کرنے کو ترجیح دیتی۔ زندہ لوگوں کے برعکس، مُردے کسی کے متعلق رائے قائم نہیں کرتے، فیصلے نہیں سناتے۔

مُردوں کے علاوہ، میری واحد دوست گُلِ صحرا تھی۔

ہم دونوں ہی عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنا چاہتی تھیں اور یوں گہری دوست بن گئی تھیں۔ وہ اب صوفی ہے۔ وہ قحبہ خانے کو پیچھے چھوڑ کر خلوت گزیں ہو چکی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اُسے بتایا تھا کہ حوصلے اور عزم کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے پر مجھے اس پر رشک آتا تھا۔

اُس نے اپنا سر ہلایا اور کہنے لگی، ''لیکن میں نے زندگی نئے سرے سے شروع نہیں کی۔ میں نے بس یہ کیا کہ موت سے پہلے مرگئی۔''

☼

آج بالکل مختلف وجہ کی بنا پر میں گُلِ صحرا سے ملنے گئی۔ میں نے اپنا اطمینان قائم رکھتے ہوئے اُس سے سکون سے بات کرنے کا سوچا تھا، لیکن اندر داخل ہوتے ہی میں سسکیاں بھرنے لگی۔

''کِمیا، کیا تم ٹھیک ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''میرا خیال ہے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''یقیناً۔'' اُس نے کہا، ''میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں؟''

''شمس تبریز کی بات ہے... وہ میرے قریب تک نہیں آتے... میرا مطلب ہے، اُس طرح سے نہیں۔'' میں بات کرتے ہکلائی لیکن کسی طور میں نے اپنا جملہ مکمل کر ہی لیا۔ ''میں خود کو اُن کے لیے پُرکشش بنانا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے یہ سب سکھاؤ۔''

گُلِ صحرا نے گہری سانس بھری، تقریباً ایک آہ۔ ''میں نے حلف اٹھایا تھا، کِمیا۔'' وہ پریشان سے لہجے میں بولی، ''میں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پاک اور خالص رہوں گی اور کبھی اس بارے میں سوچوں گی بھی نہیں کہ کوئی عورت کسی مرد کو کیسے خوش کرسکتی ہے۔''

''لیکن تم اپنا عہد نہیں توڑو گی۔ تم تو صرف میری مدد ہی کرو گی۔'' میں نے التجا کی، ''وہ میں ہوں جسے یہ سیکھنا ہے کہ شمس تبریز کو کیسے خوش کروں۔''

''شمس تبریز صاحبِ بصیرت شخص ہیں۔'' گُلِ صحرا نے اپنی آواز دھیمی کرتے کہا، یوں جیسے وہ خائف ہو کہ کوئی اور سن نہ لے۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ ان تک پہنچنے کا یہ طریقہ صحیح ہے۔''

''مگر وہ ایک مرد بھی تو ہیں، ہے ناں؟'' میں نے دلیل دی۔ ''کیا تمام مرد آدمؑ کے بیٹے اور اپنی جبلت سے مجبور نہیں؟ صاحبِ بصیرت ہوں یا نہ ہوں، ہم سب کو جسم تو بخشا گیا ہے۔ حتیٰ کہ شمس تبریز کا بھی ایک جسم ہے، ہے ناں؟''

''ہاں، لیکن...'' گُلِ صحرا نے اپنی تسبیح تھام لی اور دانے گرانے لگی۔ اُس کا سر تفکر کے عالم میں ایک طرف کو ذرا جھکا ہوا تھا۔

''اوہ، خدارا۔'' میں نے استدعا کی، ''صرف تم ہی ہو جسے میں شریکِ راز کر سکتی ہوں۔ سات مہینے ہو چکے ہیں۔ ہر صبح میں اپنے سینے پر ایک سا بوجھ لیے بیدار ہوتی ہوں، ہر شب میں روتے روتے سوتی ہوں۔ میں اس طرح نہیں جی سکتی۔ مجھے اپنے شوہر کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے!''

گلِ صحرا نے کچھ نہ کہا۔ میں نے اپنا سرپوش اتارا، اس کا سر تھاما اور اسے اپنی جانب دیکھنے پر مجبور کیا۔ میں نے کہا، ''مجھے سچ بتاؤ۔ کیا میں اس قدر بدصورت ہوں؟''

''بالکل نہیں، رکمیا۔ تم ایک حسین لڑکی ہو۔''

''پھر میری مدد کرو۔ مجھے مرد کے دل میں اترنے کا طریقہ سکھاؤ۔'' میں نے اصرار کیا۔

''مرد کے دل کا رستہ کبھی کبھار عورت کو خود اُس سے دور لے جاتا ہے، میری پیاری۔'' گلِ صحرا نے بدشگونی سے کہا۔

''مجھے پرواہ نہیں۔'' میں نے کہا، ''یہ جہاں بھی لے جائے، میں جانے کو تیار ہوں۔''

طوائف، گلِ صحرا

قونیہ، دسمبر 1247ء

بہتے آنسوؤں میں وہ مدد کے لیے التجا کرتی رہی، اس کا چہرہ سوج گیا اور ہانپتے ہوئے اس کا سینہ اوپر نیچے ہوتا رہا، یہاں تک کہ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی مدد کو تیار تھی۔ اسے تسلی دیتے ہوئے بھی، اپنے دل میں مَیں جانتی تھی کہ یہ سب بے فائدہ تھا، میں جانتی تھی کہ مجھے اس کے مطالبوں کے سامنے ہارنا نہیں چاہیے تھا۔ ابھی بھی میں حیران ہوں کہ میں اس متوقع المیے کو سمجھ کیوں نہ پائی؟ احساسِ جرم میں گھری میں بار بار خود سے پوچھتی ہوں، میں اتنی سادہ لوح کیسے ہو سکتی تھی اور کیوں کر میں نے نہیں دیکھا کہ حالات ایسا دردناک موڑ لے سکتے ہیں؟

لیکن جس روز وہ مدد مانگنے میرے پاس آئی تھی، کوئی صورت نہ تھی کہ میں اسے خالی ہاتھ لوٹا دیتی۔

''مجھے سکھاؤ، برائے مہربانی۔'' اس نے مجھ سے التجا کی، وہ ہاتھ اپنی گود میں رکھے بیٹھی تھی، اس تمیزدار لڑکی کی طرح جیسے اس کی پرورش کی گئی تھی۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے اس کے پاس امید کی کوئی وجہ نہ رہی ہو اور پھر بھی وہ پُرامید ہو۔

اس میں کیا برائی ہو سکتی تھی؟ میرا دل اُس کی محبت میں ڈگمگایا اور میں نے سوچا۔ خدارا، وہ جسے لبھانا چاہتی تھی، وہ اُس کا شوہر ہی تو تھا۔ کوئی اجنبی نہیں! اس کا صرف ایک مقصد تھا: محبت۔ بھلا اس کا نتیجہ غلط کیسے نکل سکتا تھا؟ اس کا عشق پُرشدت ہو سکتا ہے، لیکن جائز و حلال تھا، ہے ناں؟ حلال عشق!

مجھے اپنے اندر کہیں کوئی جال محسوس تو ہوا، لیکن چوں کہ یہ سارا معاملہ خدا ہی کا تھا، مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی۔ یوں میں نے، کیمیا کی مدد کا فیصلہ کیا، یہ دیہاتی لڑکی جس کے نزدیک سجنا سنورنا بس یہ تھا کہ ہاتھوں پر حنا لگا لی جاتی۔

میں نے اُسے سکھایا کہ خود کو مزید پُرکشش اور خوب صورت کیسے بنایا جائے۔ وہ بہت ذہین

طالبہ تھی، سیکھنے کی شوقین۔ میں نے اُسے سکھایا کہ خوشبودار غسل کرے، خوشبودار تیل اور روغن سے جلد کو نرم و نازک بنائے، اور شہد اور دودھ کا لیپ کرے۔ بالوں کی چوٹیوں میں گوندھنے کو عنبریں موتی اسے دیئے تاکہ اس کے بال دیر پا شیریں خوشبو میں بسے رہیں۔ اسطرخودوس (لیونڈر)، بابونہ، اکلیل کوہستانی، جنگلی پودینہ، سوسن، مروا اور زیتون کا تیل... میں نے اُسے ان سب کا استعمال سمجھایا اور بتایا کہ رات کو کون سی لوبان سلگائے۔ پھر میں نے اُسے اپنے دانتوں کو سفید کرنا، ہاتھ اور پیروں کے ناخنوں کو حنا سے رنگنا، آنکھوں میں اور بھنوؤں پر کاجل لگانا، ہونٹوں اور رخساروں کو سرخ کرنا سکھایا۔ میں نے بتایا کہ کیسے وہ اپنے بالوں کو ریشمی اور چمک دار بنائے اور اپنے بدن کی گداز دلکشی کو بڑھانے کو کیا کرے۔ ہم ساتھ بازار کی ایک دکان پر گئے، جسے میں اپنے ماضی کے حوالے سے جانتی تھی۔ وہاں سے ہم نے ایسے ریشمی لباس اور ریشمی زیریں لباس خریدے، جنہیں اُس نے پہلے کبھی دیکھا نہ ہی چھوا تھا۔

پھر میں نے اُسے مرد کے سامنے رقص کرنا اور اس جسم کو استعمال کرنا سکھایا جو خدا کی عطا تھا۔

دو ہفتوں کی محنت کے بعد، وہ تیار تھی۔

اُس سہ پہر میں نے، کمیا کو شمس تبریز کے لیے یوں تیار کیا، جیسے کوئی گڈریا قربانی کی بھیڑ تیار کرتا ہے۔ پہلے اُس نے گرم پانی سے غسل کیا، اپنی جلد کو صابن سے رگڑا اور اپنے بالوں میں خوشبودار تیل ڈالا۔ پھر میں نے اُسے وہ لباس پہننے میں مدد دی جو کوئی عورت صرف اپنے شوہر کے لیے ہی پہن سکتی تھی، اور اُس کے لیے بھی زندگی میں صرف ایک دو بار ہی۔ میں نے اُس کے لیے سرخ لبادے اور سنبل کے پھولوں سے سجے ایسے گلابی پیرہن کا انتخاب کیا جس میں اس کا بدن نمایاں ہوتا۔ آخر میں مَیں نے اُس کے چہرے پر روغن لگایا۔ اُس کے ماتھے پر میں نے موتیوں کا جھومر سجایا۔ وہ اس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی کہ میں اُس سے اپنی نظریں نہ ہٹا پائی۔

اس سب تیاری کے بعد، کمیا مزید کوئی ناتجربہ کار، شرمیلی لڑکی دکھائی نہ دے رہی تھی بلکہ آتشِ عشق میں فروزاں کوئی عورت نظر آتی تھی۔ ایسی عورت جو اپنے محبوب کی خاطر کوئی بھی بے باک قدم اٹھانے کو تیار ہو، اور اگر ضروری ہوا تو ہر قیمت چکانے کو تیار ہو۔ اُس کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے قرآن پاک کی زلیخا اور حضرت یوسفؑ سے متعلق آیت یاد آ گئی۔

کمیا کی طرح، زلیخا بھی، ایک ایسے شخص کی چاہت میں گرفتار ہو گئی تھی جو اس کی تحریک کا کوئی جواب نہ دیتا تھا۔ جب شہر کی عورتوں نے اُس کے خلاف افواہیں پھیلانا شروع کیں تو زلیخا نے اُن سب کو دعوت پر مدعو کیا۔ ''اور اس نے پھل تراشنے کو ہر ایک کو ایک ایک چھری دی اور یوسفؑ سے کہا کہ ان کے سامنے آؤ۔ جب عورتوں نے اُن کو دیکھا تو اُن کا رعبِ حُسن ان پر ایسا چھا گیا کہ پھل تراشتے ہوئے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بے ساختہ بول اٹھیں، اللہ پاک ہے، یہ کوئی بشر نہیں، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔''

(سورۃ یوسف، آیت 31)

حضرت یوسفؑ کے لیے ایسی چاہت پر کون زلیخا کو الزام دے سکتا تھا؟

☼

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' دروازے سے باہر قدم رکھنے کو تیار، کمیا نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالنے سے پہلے بے تابی سے پوچھا۔

''تم بے حد نازک اور حسین لگ رہی ہو۔'' میں نے کہا، ''تمہارا شوہر نہ صرف آج تم سے وصل چاہے گا بلکہ وہ کل بھی تمہارے پاس واپس آئے گا۔''

کمیا اس قدر شرمائی کہ اُس کے گال گلگوں ہو گئے۔ میں ہنس دی اور ذرا توقف کے بعد وہ بھی اس ہنسی میں شریک ہو گئی، اُس کی ہنسی مجھے سورج کی دھوپ کی طرح گرما رہی تھی۔

میں نے جو کہا تھا، اس سے میری مراد تھی کہ مجھے بھرزوسا تھا کہ وہ شمس تبریز کو اپنی طرف مائل کرنے میں اسی طرح کامیاب رہے گی، جیسے رَس بھرا پھول شہد کی مکھی کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ تاہم اُس کے دروازہ کھولنے سے پہلے جب ہماری نگاہیں ملیں، تو میں نے اُس کی نگاہ میں بے یقینی کا شائبہ پایا۔ اچانک میرے معدے میں بَل سا پڑا، تقریباً پیش آگہی کہ کچھ برا رونما ہونے کو تھا۔

لیکن میں نے اُسے روکا نہیں۔ مجھے بہتر طور پر معلوم ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اس کے رونما ہونے کا علم ہونا چاہیے تھا۔ جب تک میں زندہ ہوں، میں خود کو کبھی معاف نہ کروں گی۔

کِمیا

قونیہ، دسمبر 1247ء

بے باک، تند وتیز اور ذہین، شمس تبریز محبت کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ لیکن ایک شے ہے جس سے وہ بالکل ناواقف ہیں: یک طرفہ محبت کا کرب۔

جس شام گُلِ صحرا نے مجھے تیار کیا، میں ایسے جوش اور شوخ چشمی سے معمور تھی جو مجھے علم نہ تھا کہ مجھ میں موجود تھی۔ میرے بدن پر ریشمی لبادے کی سرسراہٹ، مجھ سے اٹھتی خوشبو، میری زبان پر گلاب کی پتیوں کا ذائقہ... اس سب سے مجھے عجیب سا احساس مگر غیر معمولی طور پر بہادری محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے شیشے میں اپنا عکس دکھائی دیا۔ میرا بدن فربہ تھا نہ ہی دودھیا، اور میرا سینہ اتنا فراخ نہ تھا جیسا میں چاہتی، لیکن پھر بھی میرا خیال تھا کہ میں خوب صورت لگ رہی تھی۔

میں نے گھر میں سب کے سوجانے تک انتظار کیا۔ پھر میں نے خود کو ایک موٹی سی شال میں لپیٹا اور دبے قدموں چلتی شمس تبریز کے کمرے تک پہنچی۔

''کِمیا، مجھے تمہاری آمد کی توقع نہ تھی۔'' اُنہوں نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔

''مجھے آپ سے ملنا تھا۔'' میں نے کہا اور ان کے مجھے بلانے کا انتظار کیے بغیر اندر داخل ہوگئی۔ ''کیا آپ برائے مہربانی دروازہ بند کردیں گے؟''

شمس تبریز الجھن میں نظر آئے لیکن میں نے جو کہا تھا اُنہوں نے کیا۔

جب کمرے میں ہم دونوں تنہا ہوئے، مجھے حوصلہ مجتمع کرنے میں چند لمحے لگے۔ میں نے اُن کی جانب پشت کی، اور پھر ایک جھٹکے میں اپنی شال اتاری اور لبادہ ہٹادیا۔ تقریباً فوراً ہی مجھے اپنے شوہر کی حیران نگاہوں کا بوجھ اپنی پشت پر، گردن سے پیروں تک محسوس ہوا۔ جہاں کہیں اُن کی نگاہ نے مجھے چھوا، مجھے حدت محسوس ہوئی۔ لیکن وہ حدت، چاہے وہ حقیقت تھی یا اپنے ہیجان میں میرا تصور، اس کی جگہ تیزی سے اُس سرد خاموشی نے لے لی جو کمرے میں اتر آئی تھی۔ اندیشے کے عالم میں اپنے دھڑکتے سینے کے

ساتھ میں شمس تبریز کے سامنے جنت کی ترغیب انگیز حوروں کی طرح کھڑی رہی۔

اس بوجھل خاموشی میں، ہم باہر شہر سے گزرتی غضب ناک ہوا کی سنسناہٹ کو سنتے کھڑے رہے۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تم کیا کر رہی ہو؟'' انہوں نے سرد مہری سے پوچھا۔

بولنے کے لیے مجھے خاصی کاوش کرنی پڑی، لیکن میں یہ کہنے میں کامیاب رہی، ''میں آپ کو چاہتی ہوں۔''

شمس تبریز نے میرے گرد نیم دائرے میں چکر کاٹا اور مجھے اپنی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور کرتے ہوئے میرے عین سامنے آ کھڑے ہوئے۔ میرے گھٹنے جواب دے گئے، لیکن میں نے جنبش تک نہ کی۔ اس کی بجائے میں نے ایک قدم ان کی جانب بڑھایا اور دھیرے سے ان کے ساتھ لگ گئی، اپنے بدن کی گرمی انہیں پیش کرتے ہوئے، بالکل جیسے گلِ صحرا نے مجھے سکھایا تھا۔ میں نے ان کو سہلایا اور محبت بھرے نرم الفاظ کہے۔ اُن کی مضبوط پشت پر ہاتھ پھیرتے میں نے اُن کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

یوں جیسے انہوں نے جلتے چولہے چھو لیا ہو، شمس ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئے۔ ''تم سمجھتی ہو کہ تم مجھے چاہتی ہو، لیکن تم صرف اپنی زخمی انا کی ناز برداری چاہتی ہو۔''

میں نے اپنی بانہیں اُن کی گردن میں حمائل کیں اور انہیں بوسہ دیا۔ بالکل جیسے گلِ صحرا نے مجھے بتایا تھا۔

اُن کے ہونٹوں کا ذائقہ سیاہ بیروں جیسا تھا، ترش و شیریں، لیکن جیسے ہی میں نے خیال کیا کہ مسرت کی کسی لہر نے ہمیں باہم جوڑ دیا تھا، شمس نے مجھے روک کر پرے دھکیل دیا۔

''میں تم سے ناامید ہو گیا ہوں، کمیا۔'' شمس تبریز نے کہا، ''اب کیا تم برائے مہربانی میرے کمرے سے جا سکتی ہو؟''

اُن کے الفاظ جس قدر بھی تلخ تھے، اُن کے چہرے سے کسی احساس کی پرچھائیں تک نہ گزری۔ کوئی غصہ نہ ہی کوئی ہلکی سی جھنجھلاہٹ۔ اور میں بتا نہ سکی کہ مجھے کس بات سے زیادہ دکھ پہنچا تھا: ان کے الفاظ کی چبھن سے یا پھر اُن کے چہرے کی تاریکی سے۔

مجھے اپنی زندگی میں اتنی ذلت کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اپنا لبادہ اٹھانے میں جھکی لیکن میرے ہاتھ اتنی شدت سے کانپ رہے تھے کہ اس کا نازک کپڑا میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اس کی بجائے میں نے اپنی شال اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لی۔ سسکیاں بھرتے، ہانپتے اور اب بھی نیم عریاں، میں کمرے سے باہر اور اُن سے دور بھاگی، اُن کی محبت سے دور، جو اَب میں جان گئی کہ صرف میرے تخیل میں موجود تھی۔

☼

میں نے شمس تبریز کو دوبارہ کبھی نہ دیکھا۔ اس روز کے بعد میں اپنے کمرے سے کبھی باہر نہ

نکلی۔ میں سارا وقت بستر پر لیٹے گزارتی، توانائی اور ہمت سے بڑھ کر مجھ میں باہر نکلنے کی خواہش ہی نہ تھی۔

ایک ہفتہ گزرا، پھر دوسرا، اور پھر میں نے دنوں کا شمار ہی چھوڑ دیا۔ میرے جسم سے ساری طاقت جیسے نچڑ گئی تھی، رفتہ رفتہ مائل بہ زوال۔ صرف میری ہتھیلیاں زندہ محسوس ہوتی تھیں۔ انہیں شمس تبریز کے ہاتھوں کا لمس اور اُن کی جلد کی حدت یاد تھی۔

مجھے کبھی علم نہ تھا کہ موت کی کوئی مخصوص مہک تھی۔ ایک تیز بُو، ادرک کے اچار اور شاہ بلوط کی پتوں جیسی، لیکن ضروری نہیں کہ بری۔ میں اس سے تبھی واقف ہوئی جب یہ مجھے کسی گہری نم دھند میں لپیٹے ہوئے میرے کمرے میں تیرنے لگی۔ مجھے تیز بخار رہنے لگا، میری کیفیت ہذیانی ہوگئی۔ لوگ مجھے دیکھنے آنے لگے۔ ہمسائیاں اور سہیلیاں۔ کیرا میرے بستر کے سرہانے اپنی سوجی آنکھوں اور راکھ سی رنگت کا چہرہ لیے بیٹھی رہتی۔ دوسری جانب گوہرا اپنی نرم مسکراہٹ لیے بیٹھی ہوتی۔

''خدا اُس کافر کو جہنم واصل کرے۔'' صفیہ نے کہا، ''یہ بے چاری لڑکی اپنی دل شکنی کے باعث بیمار پڑ گئی ہے۔ سب اُس کی وجہ سے ہوا!''

میں نے بولنے کی سعی کی، لیکن میرے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔

''تم ایسا کچھ کیسے کہہ سکتی ہو؟ کیا وہ خدا ہے؟'' کیرا نے مدد کرنے کی کوشش کرتے کہا، ''تم ایک فانی شخص سے ایسی طاقتیں کیسے منسوب کرسکتی ہو؟''

مگر انہوں نے کیرا کی ایک نہ سنی اور میں کسی کو قائل کرنے کی حالت میں نہ تھی۔ بہر صورت مجھے جلد ہی ادراک ہوگیا کہ میں جو کچھ بھی کہتی یا نہ کہتی، نتیجہ ایک ہی رہتا۔ وہ لوگ جو شمس تبریز کو ناپسند کرتے تھے، انہیں میری بیماری کی صورت میں اُن سے نفرت کرنے کا ایک اور عذر مل گیا، جب کہ میں اُنہیں چاہتے ہوئے بھی ناپسند نہ کرسکتی تھی۔

زیادہ دیر نہ لگی کہ میں عدم وجود میں ڈھل گئی، جہاں سب رنگ پگھل کر سفید رنگ بن گئے اور سب آوازیں ایک ابدی بھنبھناہٹ میں تحلیل ہوگئیں۔ میں مزید لوگوں کے چہروں میں امتیاز کرسکی نہ ہی کہے گئے الفاظ کو پس منظر میں دور سے سنائی دیتی گنگناہٹ سے زیادہ سن سکی۔

مجھے نہیں معلوم کہ کبھی بھی شمس تبریز میرے کمرے میں مجھے دیکھنے آئے۔ شاید وہ کبھی نہ آئے۔ شاید وہ مجھے دیکھنا چاہتے ہوں لیکن کمرے میں موجود عورتوں نے اُنہیں ایسا نہ کرنے دیا ہو۔ یا شاید وہ آئے ہی ہوں اور میرے سرہانے بیٹھے رہے ہوں، میرے لیے دیر تک نے بجائی ہو، میرا ہاتھ تھاما ہو اور میری روح کے لیے دعا کی ہو۔ میں اسی پر یقین کرنا چاہوں گی۔

بہر صورت، جو کچھ بھی ہوا ہو، اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اُن پر غصہ تھا نہ ہی اُن پر کوئی خفگی۔ میں بھلا خفا ہو بھی کیسے سکتی تھی، جب کہ میں خالص آگہی کی ندی میں رواں تھی؟

خدا اس قدر مہربان اور محبت کرنے والا تھا اور اس کے پاس ہر بات کا سبب اور وضاحت

موجود تھی۔ ہر شے کے پیچھے کارفرما محبت کا ایک مکمل نظام۔ ریشمی لباس اور خوشبودار نقاب میں ملبوس ہو کر شمس کے کمرے میں جانے کے بعد، بیمار ہونے کے دس روز بعد، میں خالص عدم وجود کے دریا میں غوطہ زن ہو گئی۔ وہاں جی بھر کر میں تیرتی رہی، آخرکار یہ جانتے ہوئے کہ قرآن پاک کا گہرا ترین مطالعہ کیسا محسوس ہوتا ہو گا... لامتناہی بحر میں ایک قطرہ۔

اور یہی بہتے پانی تھے جو مجھے بہا کر زندگی سے موت کی جانب لے گئے۔

ایلا

بوسٹن، 3 جولائی 2008ء

بوسٹن کبھی بھی اتنا دلکش اور رنگین نہ رہا تھا، ایلا نے سوچا۔ کیا اس سارے عرصے میں شہر کا حسن ان کی آنکھوں سے اوجھل رہا تھا؟ عزیز نے بوسٹن میں پانچ روز گزارے۔ ایلا اُس سے ملنے کی خاطر روزانہ نارتھمپٹن سے بوسٹن دو گھنٹے ڈرائیو کر کے آتی رہی۔ انہوں نے Little Italy میں مزے دار لنچ کیے، فائن آرٹس میوزیم کا دورہ کیا۔ بوسٹن کامن اور واٹر فرنٹ پر لمبی چہل قدمی کی۔ ایکویریم میں وہیل مچھلیاں دیکھیں۔ وہ ہاورڈ سکوئر کے چھوٹے کیفوں میں کافی پیتے رہے۔ وہ مقامی کھانوں، مراقبے کی مختلف تکنیکوں، قدیم باشندوں کے آرٹ، گوتھک ناولوں، پرندوں کے مشاہدے، باغ بانی، اعلیٰ ٹماٹر اگانے اور خوابوں کی تعبیر جیسے متنوع موضوعات پر مسلسل ایک دوسرے کی بات کاٹتے اور ایک دوسرے کے جملے مکمل کرتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ ایلا کو یاد نہ تھا کہ اُس نے کبھی کسی سے اتنی باتیں کی ہوں۔

جب وہ باہر سڑک پر ہوتے تو خیال رکھتے کہ ایک دوسرے کو چھونے سے گریز کریں، لیکن ایسا کرنا اُن کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ خفیف سی تقصیریں دلچسپ ہو گئیں اور ایلا ہاتھوں کے ہولے سے چھو جانے کی منتظر رہنے لگی۔ کسی عجیب حوصلے کے ساتھ جو اُسے معلوم نہ تھا کہ اُس کے اندر موجود تھا، ریسٹورنٹس اور سڑکوں پر ایلا، عزیز کا ہاتھ تھام لیتی، اس کا بوسہ لیتی۔ نہ صرف یہ کہ اُسے دیکھے جانے کی پرواہ نہ تھی بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے اُسے چاہ تھی کہ اُنہیں دیکھا جائے۔ متعدد بار وہ ساتھ ہوٹل واپس آئے اور ہر موقع پر وہ وصل کے بہت قریب ہوتے، لیکن انہوں نے ایک فاصلہ ہمیشہ قائم رکھا۔

جس روز عزیز کو واپس ایمسٹرڈیم پرواز کرنا تھا، اُس صبح وہ اُسی کے کمرے میں تھے۔ اُس کا سوٹ کیس ان دونوں کے درمیان کسی تکلیف دہ یاد دہانی کی طرح رکھا تھا کہ جدائی کا وقت آ چکا تھا۔

''مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔'' ایلا نے کہا، ''بہت دیر میں اس بارے میں سوچتی رہی ہوں۔''

عزیز نے ایلا کے لہجے میں اچانک تبدیلی کو پہچانتے ہوئے بھنویں اچکائیں۔ پھر اس نے

محتاط انداز میں کہا، ''کچھ ہے جو مجھے بھی تم سے کہنا ہے۔''

''ٹھیک، پہلے تم کہو۔''

''نہیں، تم پہلے بتاؤ۔''

ابھی بھی نیم مسکراتے ایلا نے یہ سوچتے اپنی نگاہ جھکالی کہ کیا کہے اور کیسے کہے۔ آخر کار اس نے کہنا شروع کیا، ''تمہارے بوسٹن آنے سے پہلے، ایک شام ڈیوڈ اور میں باہر گئے اور ہمارے درمیان لمبی بات ہوئی تھی۔ اُس نے مجھ سے تمہارے متعلق پوچھا تھا۔ بہ ظاہر اُس نے میری بے خبری میں میرے نام تمہاری ای میلز پڑھ لی تھیں۔ اس پر مجھے اُس پر بہت غصہ تو آیا لیکن میں نے سچائی سے انکار نہیں کیا۔ میرا مطلب ہے، ہمارے متعلق۔''

اب ایلا نے اس اندیشے کے ساتھ نگاہیں اٹھائیں کہ اس سب پر عزیز کا ردِعمل کیا ہوگا جو کچھ وہ آشکار کرنے جا رہی تھی۔ ''لمبی کہانی کو مختصر الفاظ میں بتاؤں تو، میں نے اپنے شوہر کو بتا دیا کہ میں کسی دوسرے شخص سے محبت کرتی ہوں۔''

باہر سڑک پر فائر ٹرکوں کے سائرن بجے جنہوں نے شہر کے معمول کے شور کو جگا دیا۔ پل بھر کے لیے ایلا کی توجہ بٹ گئی، لیکن پھر وہ اپنی بات مکمل کرنے میں کامیاب رہی۔ ''یہ دیوانگی ہی لگتی ہے، میں جانتی ہوں، لیکن میں بڑی احتیاط سے اس پر غور کرتی رہی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ایمسٹرڈیم چلنا چاہتی ہوں۔''

عزیز کھڑکی کی طرف بڑھا اور جھانک کر باہر کی افراتفری اور ہنگامہ دیکھنے لگا۔ فاصلے پر تعمیر کچھ عمارتوں میں سے ایک سے دھواں اُٹھ رہا تھا... فضا میں منڈلاتا دھوئیں کا کثیف سیاہ بادل۔ اُس نے اُس عمارت میں بسنے والوں کے لیے دل ہی دل میں دعا کی۔ پھر جب اس نے بولنا شروع کیا، تو یوں لگا جیسے شہر بھر سے مخاطب تھا۔

''میں تمہیں اپنے ساتھ بہ خوشی ایمسٹرڈیم لے جانا چاہوں گا، لیکن میں تم سے مستقبل کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ایلا نے گھبرا کر پوچھا۔

اس پر عزیز پلٹ کر واپس آیا اور اُس کے پہلو میں بیٹھا، اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھوں پر رکھا اور غائب دماغی سے اسے سہلاتے کہنے لگا، ''جب تم نے مجھے پہلی ای میل لکھی تھی، وہ میری زندگی کا عجیب ترین دور تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے تمہاری زندگی میں کوئی اور موجود ہے....؟''

''نہیں سویٹ ہارٹ، بالکل نہیں۔'' عزیز ذرا مسکرایا اور پھر وہ مسکراہٹ مدھم پڑ گئی۔ ''ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی زندگی کے تین ادوار کے بارے میں تمہیں لکھا تھا، یاد ہے؟ وہ

لفظ ''صوفی'' کے پہلے تین حروف تھے۔ تم نے کبھی مجھ سے چوتھے مرحلے کے بارے میں نہیں پوچھا اور جتنی بھی شدید کوشش میں نے بتانے کی خاطر کی ہو، میں تمہیں بتا نہیں پایا۔ حرف ''ی'' سے میرا آمنا سامنا۔ کیا تم اب اس بارے میں جاننا چاہو گی؟''

''ہاں۔'' ایلا نے کہا، اگرچہ اسے ایسی کسی بھی بات کا خدشہ تھا جو اس لمحے کو برباد کر دیتی۔

''میں بالکل سنوں گی۔''

☼

جولائی کے اُس روز ہوٹل کے کمرے میں، ایمسٹرڈیم واپسی کی فلائٹ سے چند گھنٹے پہلے، عزیز نے ایلا کو بتایا کہ کیسے 1977ء میں اپنے لیے نیا نام اختیار کر کے اور جیسا کہ اُسے امید تھی، ایک نیا نصیب پا کر، وہ صوفی بن گیا۔ تب سے اُس نے ایک پیشہ ور فوٹوگرافر کے طور پر دنیا بھر کا سفر کیا، اپنے اندر ایک سرگرداں درویش۔ چھے براعظموں میں اُس کے قریبی دوست تھے، ایسے لوگ جو اُسے اپنے خاندان کا حصہ سمجھتے تھے۔ اگرچہ اس نے دوبارہ شادی نہیں کی لیکن مشرقی یورپ میں دو یتیم بچوں کی پرورش کی ذمہ داری اٹھا رکھی تھی۔ سورج کی شکل کا لاکٹ اپنی گردن میں ہمہ وقت پہنے تاکہ وہ اسے شمس تبریز کی یاد دلاتا رہے، عزیز نے اپنی زندگی سفر و سیاحت کرتے، مطالعہ کرتے اور صوفی درویشوں کے نقوشِ قدم پر تعلیم دیتے، ہر جگہ اور ہر شے میں خدا کی نشانیاں تلاش کرتے گزاری تھی۔

پھر دو برس قبل، اُسے اپنی بیماری کا علم ہوا۔

اس کا آغاز اُس کی بغل میں ایک گلٹی سے ہوا، جس پر اُس کی توجہ بہ ظاہر خاصی دیر سے گئی تھی۔ گلٹی ایک خطرناک رسولی ثابت ہوئی، جو جلدی کینسر کی ایک مہلک قسم تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ وہ ٹھیک دکھائی نہ دیتی تھی لیکن واضح تشخیص سے پہلے انہیں کچھ ٹیسٹ ضروری کرنا تھے۔ ہفتہ بھر بعد، وہ ایک بُری خبر لائے: رسولی اُس کے اندرونی اعضا تک پھیل چکی تھی اور اب اُس کے پھیپھڑوں پر حملہ کر دیا تھا۔

اس وقت اُس کی عمر باون برس تھی۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پچپن برس کی عمر تک ہی جی پائے گا۔

ایلا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، لیکن الفاظ اس کی زبان سے نہ نکلے اور اس کا منہ خشک ہو گیا۔ اُس کے رخساروں پر دو آنسو ڈھلک آئے، جو اُس نے تیزی سے پونچھ لیے۔

عزیز بولتا رہا، اُس کا لہجہ مضبوط اور تاکید بھرا تھا۔ اس نے کہا کہ اس طرح اس کی زندگی کے ایک نئے اور کئی طرح سے زیادہ پیداواری مرحلے کا آغاز ہوا۔ ایسی کئی جگہیں ابھی باقی تھیں جو وہ زندگی میں دیکھنا چاہتا تھا اور پہلا کام اُس نے ان سب جگہوں کی سیاحت کی خاطر وسیلے کی تلاش کا کیا۔ اُس نے عالمی رابطوں سے ایمسٹرڈیم میں ایک صوفی فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی۔ ایک نوآموز نے نوازی کی حیثیت سے اُس نے صوفی موسیقاروں کے ہمراہ انڈونیشیا، پاکستان اور مصر میں کنسرٹ کیے اور حتیٰ کہ قرطبہ، سپین میں

یہودی اور مسلمان صوفیوں کے ایک گروپ کے ساتھ ایک البم بھی تیار کی۔ وہ واپس مراکش گیا اور اس خانقاہ کا دورہ کیا جہاں وہ اپنی زندگی میں پہلی بار اصلی صوفیوں سے ملا تھا۔ شیخ سمید عرصہ ہوا دنیا سے گزر چکے تھے، عزیز نے اُن کی لحد پر فاتحہ پڑھی اور اُس کی زندگی نے جو راہ اختیار کی تھی، اس پر غور وفکر کرتے مراقبہ کیا۔

''پھر میں دوبارہ ناول لکھنے لگا، جو میں ہمیشہ سے لکھنا چاہتا تھا لیکن اپنی سستی یا کم حوصلگی کے سبب اسے ہمیشہ ملتوی کرتا آیا تھا۔'' عزیز نے آنکھ مارتے ہوئے کہا، ''تم جانتی ہو، یہ ایک ایسا کام تھا جو میں ایک عرصے سے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کتاب کو ''دلکش کفر'' کا نام دیا اور امریکہ کی ایک لٹریری ایجنسی کو بھیج دیا۔ مجھے زیادہ توقعات نہ تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ میں سب امکانات کو دل سے محسوس بھی کرتا تھا۔ ہفتہ بھر بعد مجھے بوسٹن کی ایک پُراسرار خاتون کی بڑی تجسس آمیز ای میل ملی۔''

ایلا مسکرانے پر مجبور ہوگئی۔ احترام بھری دردمندی، محبت، نرمی اور کرب بھری ایک دھیمی سی مسکراہٹ۔

عزیز نے بتایا کہ اُس لمحے کے بعد سے کچھ بھی پہلے جیسا نہ رہا۔ موت کے لیے تیار ایک آدمی سے، وہ کسی ایسے شخص میں بدل گیا جو انتہائی غیر متوقع وقت پر محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ یکا یک زندگی کے وہ تمام ٹکڑے جو وہ سمجھتا تھا کہ عرصہ ہوا انہیں ان کی درست جگہوں پر رکھ چکا ہے، انہیں دوبارہ ہلانے کی ضرورت آن پڑی تھی۔ روحانیت، زندگی، خاندان، فنا، ایمان اور محبت... اس نے خود کو ان سب کے نئے معانی کے بارے میں سوچتے پایا اور وہ اب مرنا نہ چاہتا تھا۔

اپنی زندگی کے اس نئے اور حتمی مرحلے کو اس نے لفظ ''صوفی'' میں حرف ''ی'' سے ملاقات کہا۔ اور اس نے بتایا کہ یہ مرحلہ پچھلوں کی نسبت اب تک دشوار ترین ثابت ہوا تھا کیوں کہ یہ ایسے وقت سامنے آیا تھا جب اس کا خیال تھا کہ وہ اگر سب نہیں تو اپنے بیشتر داخلی تنازعات حل کر چکا تھا، ایسا وقت جب اس کا خیال تھا کہ وہ روحانی طور پر بالغ اور مکمل ہو چکا تھا۔

''تصوف میں آپ موت سے پہلے مرنا سیکھتے ہیں۔ میں ان تمام مراحل سے قدم بہ قدم گزر چکا ہوں۔ پھر جیسے ہی میں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ میں نے ان سب کو ترتیب دے چکا ہوں، تو یکا یک جانے کہاں سے یہ عورت چلی آئی۔ وہ مجھے ای میل کرتی ہے اور میں اُسے جواب دیتا ہوں۔ ہر ای میل کے بعد میں رکی سانسوں کے ساتھ اُس کے جواب کا انتظار کرتا ہوں۔ الفاظ ہمیشہ سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہوگئے ہیں۔ ساری دنیا ایک بلینک سکرین میں بدل گئی ہے، اس کی منتظر کہ اس پر کچھ تحریر کیا جائے۔ اور مجھے ادراک ہوا کہ میں اس عورت کو جاننا چاہتا ہوں۔ میرا دل اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کو چاہتا ہے۔ اچانک ہی جیسے مجھے اپنی زندگی ناکافی لگنے لگی تھی۔ مجھے ادراک ہوا کہ مجھے موت سے خوف آنے لگا تھا اور میری ذات کا ایک حصہ اُسی خدا کے سامنے بغاوت کو تیار ہوگیا جس کی عظمت وجلال کے سامنے

میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔

''مگر ہمارے پاس وقت ہوگا...'' ایلا جب کچھ بولنے کے قابل ہوئی تو اس نے کہا۔

''میرے ڈاکٹروں نے مجھے بتایا ہے کہ میرے پاس سولہ مہینے ہیں۔'' عزیز نے ہولے سے لیکن مضبوط لہجے میں کہا،'' وہ غلط ہو سکتے ہیں۔ یا وہ درست بھی ہو سکتے ہیں۔ میں جان نہیں سکتا۔ تم جانتی ہو ایلا، میں تمہیں صرف لمحہ موجود ہی دے سکتا ہوں۔ میرے پاس بس یہی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ کسی کے پاس بھی اس لمحہ موجود سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہمیں بس یوں ظاہر کرنا پسند ہے کہ ہمارے پاس اس سے زیادہ کچھ ہے۔''

ایلا نے ایک طرف جھکتے اپنے پیروں پر نظر ڈالی، یوں جیسے اُس کا کچھ حصہ نیچے گرنے کو ہو اور باقی حصہ خود کو سنبھال رہا ہو۔ وہ رونے لگی۔

''مت رو، پلیز۔ میری آرزو ہے کہ تم میرے ساتھ ایمسٹرڈیم چلو۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ آؤ مل کر دنیا دیکھیں، دور افتادہ خطے دیکھیں، اجنبی لوگوں کو جانیں اور ساتھ بیٹھ کر خدا کی تخلیق کی تحسین کریں۔''

''یہ خوب ہوگا۔'' ایلا نے کسی ایسے بچے کی طرح ناک سکتے کہا جسے اس کے رونے کے دوران کوئی شوخ رنگ کھلونا تھما دیا گیا ہو۔

عزیز کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ اُس نے ایلا سے نظریں چرا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

''لیکن میں تم سے یہ پوچھنے سے خائف تھا۔ میں تو تمہیں چھونے سے بھی خائف تھا، وصل تو ایک طرف۔ میں تم سے اپنے ساتھ چلنے اور اپنا خاندان چھوڑنے کا کیسے کہہ سکتا تھا جب کہ میرے پاس تمہیں دینے کو کوئی مستقبل نہیں؟''

اُس کے سوال پر ایلا نے لجاجت سے کہا،'' ہم اس قدر مایوس کیوں ہو رہے ہیں؟ تم اس بیماری سے لڑ سکتے ہو۔ تم میرے لیے ایسا کر سکتے ہو۔ ہمارے لیے۔''

''ہمیں ہر شے سے لڑنا ہی کیوں ہوتا ہے؟'' عزیز نے جاننا چاہا۔'' ہم ہمیشہ افراطِ زر سے، ایڈز، کینسر، بدعنوانی، دہشت گردی سے لڑنے کی بات کرتے ہیں، حتیٰ کہ اضافی وزن سے لڑنے کی بات... کیا ہم ان چیزوں سے کسی دوسری طرح نہیں نمٹ سکتے؟''

''میں صوفی نہیں ہوں۔'' ایلا نے اضطراب سے بڑبڑاتے کہا۔ اُس کی آواز کسی اور کی لگ رہی تھی، کسی نسبتاً بوڑھی عورت کی۔

اس لمحے اس کے دماغ میں کئی خیالات در آئے: اس کے باپ کی موت، اپنے کسی قریبی شخص کو خودکشی کے ہاتھوں کھو دینے کا کرب، اس کے بعد افسردگی اور پچھتاووں میں گھرے برس، مرنے والے کی ہر چھوٹی بڑی یاد سے گزرتے، یہ سوچتے کہ اگر وہ تفصیلات کہیں بدل جاتیں تو حالات کیا مختلف

ہو سکتے تھے۔

''میں جانتا ہوں تم صوفی نہیں ہو۔'' عزیز مسکرا دیا۔ ''اور تمہیں صوفی بننے کی ضرورت بھی نہیں۔ بس رومی بن جاؤ۔ میں تم سے بس یہی چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ عرصہ پہلے تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں شمس ہوں، یاد ہے؟ تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں شمس کی یاد دلاتا ہوں۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی، لیکن میں شمس تبریز نہیں بن سکتا۔ میں سمجھتا ہوں وہ مجھ سے کہیں آگے اور بلند تر تھے۔ لیکن تم رومی بن سکتی ہو۔ اگر تم محبت کو خود پر اختیار حاصل کرنے اور اسے خود کو بدلنے دو، پہلے اس کی موجودگی سے، پھر اس کی عدم موجودگی سے...''

''میں شاعر نہیں ہوں۔'' ایلا نے اس بار کہا۔

''رومی بھی شاعر نہ تھے۔ لیکن بعد میں شاعر ہو گئے۔''

''تم سمجھتے نہیں؟ میں صرف ایک گھریلو عورت ہوں، خدا کے واسطے، تین بچوں کی ماں۔'' ایلا نے گویا ہانپتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

''ہم سب وہی ہیں جو ہم ہیں۔'' عزیز نے زیر لب کہا، ''اور ہم سب کا ہی بدلنا لازم ہے۔ یہی یہاں سے وہاں تک کا سفر ہے۔ تم یہ سفر کر سکتی ہو۔ اور اگر تم اتنی بہادر ہو اور اگر میں اتنا باہمت ہوں تو آخر میں ہم ساتھ قونیہ جا سکتے ہیں۔ وہیں میں مرنا چاہتا ہوں۔''

ایلا کی سانس پھول گئی۔ ''ایسی باتیں مت کرو!''

عزیز نے لمحے بھر کو اُسے دیکھا اور پھر اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔ اُس کے چہرے پر اب ایک نیا تاثر تھا، اس کے لہجے میں ایک اجنبیت، یوں جیسے وہ تیزی سے دُور جا رہا ہو، ہوا کے رحم و کرم پر کسی خشک پتے کی طرح۔

''یا پھر۔'' اُس نے آہستگی سے کہا، ''گھر واپس چلی جاؤ، ایلا۔ اپنے بچوں کے پاس اپنے گھر واپس چلی جاؤ۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے، میری محبوب۔ تمہارا انتخاب جو بھی ہو گا، میں تمہارے فیصلے کا احترام کروں گا اور تا دمِ آخر تم سے محبت کرتا رہوں گا۔''

مدہوش سلیمان

قونیہ، مارچ 1248ء

بادہ اور خون، پسینہ اور آنسو۔ باہر کے اجنبی لوگ سمجھتے ہیں کہ شرابی یا مے نوش ست الوجود ہوتے ہیں جن کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کم ہی جانتے ہیں کہ روزانہ مے سرخ کی بڑھتی ہوئی مقدار پینے کے لیے اچھی خاصی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم دنیا بھر کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوتے ہیں۔

تھکن زدہ اور چڑچڑے پن سے میں سر میز پر رکھے اونگھ رہا اور ایک ناخوش گوار خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب میں ایک بڑا سا سیاہ بیل دکھائی دیا جو بہت غیظ و غضب کے عالم میں انجانی گلیوں میں میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں یہ جانے بغیر اُس جانور سے بچ کر بھاگا کہ میں نے اُسے اکسانے کو ایسا کیا غلط کیا تھا، دکانچوں سے ٹکراتے اور سامانِ تجارت کو گراتے، بازار کے سب پھیری فروشوں کے غصے کو ہوا دیتے ہوئے، مسلسل بھاگتے ہوئے میں ایک عام گزرگاہ میں داخل ہوا جو بند گلی ثابت ہوئی۔ اور وہاں میرا پیر فیل پیکر (میمتھ) کے انڈے پر پڑا جو کسی گھر سے بھی بڑا تھا۔ اچانک انڈا سیا جانے لگا اور اُس سے کسی پرندے کا بدصورت ترین بچہ باہر نکلا، بھیگا ہوا اور شور مچاتا ہوا بچہ۔ میں نے اُس گلی سے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر آسمان پر ماں پرندہ ظاہر ہوئی، نیچے مجھے گھورتے ہوئے جیسے اُس کے بچے کی بدصورتی کا ذمے دار میں ہی تھا۔ جیسے ہی وہ پرندہ نیچے اترنے لگا، اس کی تیز چونچ اور تیز تر پنجوں کا رخ میری طرف ہوا، میں جاگ گیا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو ادراک ہوا کہ میں کھڑکی کے برابر رکھی میز پر ہی سو گیا تھا۔ اگرچہ میرے منہ میں زنگ خوردہ ناخنوں کا سا ذائقہ تھا اور میں جام چڑھانے کو مرا جا رہا تھا، میں نے اتنی تھکن محسوس کی کہ ہل تک نہ پایا۔ سو میں نے اپنا بوجھل سر میز سے لگائے رکھا، اپنی مدہوشی میں مزید ڈوبتے اور مے خانے کی معمول کی آوازیں اور شور سنتے ہوئے۔

مجھے مکھیوں کے غول کی بھنبھناہٹ کی طرح بحث وتکرار کا ابھرتا اور ڈوبتا شور سنائی دیا۔ وہ برابر کی میز پر بیٹھے آدمیوں کا شور تھا اور اگرچہ میں نے کچھ دیر کو اس امکان پر سوچا کہ سر اٹھا کر دیکھوں کہ وہ تھے کون، مگر میں ذرا سا بھی نہ ہلا جلا۔ اور تبھی تھا کہ میں نے وہ منحوس لفظ سنا: قاتل۔

پہلے تو میں نے ان کی باتوں کو نشے میں کی گئی ہذیان گوئی سمجھ کر مسترد کر دیا۔ کوئی مے خانے میں ہر طرح کی باتیں سنتا اور وقت کے ساتھ سیکھ جاتا ہے کہ بولے گئے ہر لفظ کو سنجیدگی سے نہ لے۔ لیکن اُن کے لہجوں میں کچھ ایسی تہدید اور عدم احترام تھا کہ اُسے رَد نہ کیا جا سکتا تھا، سو میں نے اپنے کان کھڑے کیے اور سننے لگا۔ میرا منہ کھلا ہی رہ گیا جب بالآخر مجھ پر واضح ہوا کہ وہ سنجیدگی سے کیا بات کر رہے تھے۔ اور میری حیرانی مزید گہری ہو گئی جب مجھے سمجھ آئی کہ وہ قتل کسے کرنا چاہتے ہیں: شمس تبریز کو۔

ان کے میز سے اٹھتے ہی میں نے نیند میں ہونے کا دکھاوا بند کیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''ہرسٹوس، اِدھر آؤ! جلدی!۔'' میں نے گھبراہٹ کے عالم میں چلّا کر کہا۔

''اب کیا ہوا؟'' ہرسٹوس بھاگتا آیا۔ ''تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟''

لیکن میں بتا نہ پایا۔ حتیٰ کہ اُسے بھی نہیں۔ اچانک ہر کوئی مشکوک دکھائی دینے لگا تھا۔ کیا ہو اگر شمس کے خلاف اس سازباز میں زیادہ لوگ ملوث ہوں؟ مجھے اپنا منہ بند اور آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی۔

''کچھ نہیں! مجھے بھوک لگی ہے، بس۔'' میں نے کہا، ''کیا تم برائے مہربانی مجھے یخنی لا دو گے؟ اس میں خوب لہسن ڈال کر بنانا۔ مجھے ہوش وحواس بحال کرنا ہیں اپنے!''

ہرسٹوس نے استہزا سے گھورا لیکن میری متلون مزاجی کا عادی ہونے کے باعث اُس نے مجھ سے مزید سوالات نہ کیے۔ چند لمحوں میں وہ بکری کی آنتوں کی یخنی لے آیا، مصالحے دار اور بھاپ اڑاتی ہوئی جو میں نے اپنی زبان جلاتے ہوئے جلدی جلدی پی لی۔ خاصے ہوش وحواس میں آنے کے بعد میں شمس تبریز کو خبردار کرنے باہر گلی میں نکل گیا۔

پہلے میں نے رومی کے گھر قسمت آزمائی کی۔ وہ وہاں نہ تھے۔ پھر میں مسجد گیا، مدرسے، چائے خانے، تندور، حمام...... میں نے کاریگروں کی گلی میں ہر دکان اور گودام میں جھانکا۔ حتیٰ کہ میں نے کھنڈرات میں بوڑھی خانہ بدوش عورت کے خیمے تک میں دیکھا۔ اس صورت میں کہ وہ کسی درد کرتے دانت یا بُرے جادو سے چھٹکارا پانے وہاں گئے ہوں۔ میں نے انہیں ہر جگہ تلاش کیا، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ خوف مجھے کترنے لگا۔ کیا ہوگا، اگر زیادہ تاخیر ہو گئی؟ کیا ہو، اگر انہوں نے پہلے ہی شمس کو قتل کر دیا ہو؟

خاصی دیر بعد، بے خبر کہ میں اب انہیں اور کہاں تلاش کروں، جب میں بددل اور تھکن زدہ ہو کر مے خانے واپس چلا آیا، تبھی میرا اُن سے سامنا ہوا۔

''ارے سلیمان، تم سوچوں میں گم دکھائی دیتے ہو۔'' شمس تبریز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ میرے خدایا! آپ زندہ ہیں!'' میں نے بے ساختہ کہا اور انہیں بانہوں میں بھر لیا۔

جب شمس تبریز میرے بازوؤں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تو انہوں نے قدرے مسرور ہو کر مجھے گھورا۔ ''یقیناً میں زندہ ہوں! کیا میں تمہیں کوئی بھوت دکھائی دیتا ہوں؟''

میں مسکرایا مگر مسکراہٹ نے زیادہ دیر میرا ساتھ نہ دیا۔ میرا سر اس قدر دُکھ رہا تھا کہ اور کوئی وقت ہوتا تو میں چند جام چڑھاتا اور جس قدر جلد ممکن ہوتا خمار آلود ہو کر اونگھنے لگتا۔

''کیا بات ہے میرے دوست؟ سب ٹھیک ہے؟'' شمس نے شک کے عالم میں پوچھا۔

میں نے بہ مشکل تھوک نگلی۔ کیا ہو، جب میں انہیں منصوبے کے بارے میں بتاؤں تو وہ میرا یقین نہ کریں؟ کیسا ہو، اگر وہ سوچیں کہ میں مئے سرخ کے نشے میں کسی فریب خیال کا شکار ہوا تھا؟ اور شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ حتیٰ کہ خود مجھے بھی پوری طرح یقین نہ ہو سکتا تھا۔

''لوگ آپ کے قتل کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا، ''مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں۔ میں اُن کے چہرے نہیں دیکھ پایا۔ آپ جانتے ہیں، میں سو رہا تھا..... لیکن میں نے یہ خواب میں نہیں دیکھا۔ میرا مطلب ہے، میں نے خواب دیکھا تو تھا، لیکن وہ ایسا نہ تھا۔ اور میں نشے میں بھی نہیں تھا۔ خیر، میں نے چند جام چڑھائے تو تھے لیکن میں...''

شمس تبریز نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ ''پُرسکون ہو جاؤ میرے دوست۔ میں سمجھتا ہوں تمہاری بات۔''

''آپ سمجھتے ہیں؟ واقعی؟''

''ہاں۔ اب واپس مے خانے جاؤ اور میری فکر مت کرنا۔''

''نہیں، نہیں! میں کہیں نہیں جا رہا۔ اور آپ بھی کہیں نہیں جائیں گے۔'' میں نے اعتراض کیا۔ ''یہ لوگ سنجیدہ ہیں۔ آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ آپ واپس مولانا رومی کے گھر نہیں جا سکتے۔ وہ پہلی جگہ ہوگی جہاں وہ آپ کو تلاش کریں گے۔''

میری گھبراہٹ سے غافل شمس تبریز خاموش رہے۔

''سنیے درویش، میرا گھر چھوٹا اور ذرا حبس بھرا ہے۔ لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ جب تک چاہیں میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہیں۔''

''میری فکر کے لیے شکریہ۔'' شمس تبریز زیرِ لب بولے، ''لیکن خدا کی رضا کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ یہ اصولوں میں سے ایک ہے: یہ دنیا دوطرفہ عمل اور ردِعمل کے اصول پر کھڑی ہے۔ مہربانی کا قطرہ ہو یا بدی کا ذرہ، کچھ بھی رائیگاں نہیں جاتا۔ لوگوں کے منصوبوں، چالوں، دھوکے فریب یا داؤ پیچ سے خوف زدہ مت ہو۔ اگر کوئی جال بچھا رہا ہے تو یاد رکھو، خدا بھی اپنی چال چل رہا ہے۔ وہ سب سے بڑا اور بہترین منصوبہ ساز ہے۔ خدا کے علم میں آئے بغیر پتہ تک نہیں ہلتا۔ بس اس پر یقین کامل رکھو۔ خدا جو کچھ بھی کرتا

ہے، حُسن وخوبی سے کرتا ہے۔"

یہ کہہ کر شمس تبریز نے مجھے دیکھ کر ایک آنکھ میچی اور ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ میں نے انہیں کیچڑ زدہ گلی میں تیزی سے رستہ بنا کر گزرتے اور میری تنبیہ کے باوجود، مولانا رومی کے گھر کی سمت میں جاتے دیکھا۔

قاتل

سکندریہ، مارچ 1248ء

بدخصلت! احمق! میں نے کہا بھی تھا کہ میرے ہمراہ مت آئیں۔ میں نے واضح کیا تھا کہ میں ہمیشہ اکیلے کام کرتا ہوں اور مجھے گاہکوں کا میرے کاموں میں دخل دینا بالکل پسند نہیں۔ لیکن انہوں نے یہ وجہ بتاتے ہوئے اصرار کیا کہ چوں کہ درویش میں ماورائے فطرت طاقتیں ہیں، اس لیے انہیں خود اپنی آنکھوں مُردہ دیکھنا چاہتے تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' آخر میں مَیں نے ان کی بات مان لی۔'' لیکن خیال رکھنا کہ جب تک سب کام ہو نہ جائے، تم میرے قریب تک مت آؤ۔''

وہ راضی ہو گئے۔ اب وہ تین تھے۔ دو تو وہی آدمی جنہیں میں پچھلی ملاقات سے جانتا تھا اور ایک نیا لڑکا جو دوسروں جتنا ہی نوعمر اور سراسیمہ لگتا تھا۔ ان سب نے اپنے چہرے سیاہ نقاب میں چھپا رکھے تھے۔ یوں جیسے مجھے اُن کی شناخت دریافت کرنے کی پرواہ تھی!

نصف شب کے بعد میں مولانا رومی کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ میں پتھر کی دیوار کود کر صحن میں داخل ہوا اور ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ میرے گاہکوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ شمس تبریز کو ہر شب روزانہ صحن میں مراقبہ کرنے کی عادت تھی، وضو کرنے سے پہلے یا بعد میں۔ مجھے بس انتظار کرنا تھا۔

اُس تیز رات ہوا چل رہی تھی، سال کے ان دنوں کے حوالے سے غیر معمولی طور پر خنک۔ تلوار مجھے اپنی ہتھیلی میں بھاری اور سرد محسوس ہوئی، اس کے دستے پر جڑے مونگے کے دو موتی میری انگلیوں تلے کھردرے لگے۔ ضرورت پڑتی تو میں اپنے ہمراہ ایک چھوٹا نیام دار خنجر بھی لے آیا تھا۔

چاند کے گرد ہلکی نیلی کہر کا ہالہ تھا۔ دور کہیں چند شب خیز جانور بھونکے اور چلائے۔ مجھے درختوں سے چھن کر آتی ہوا کے جھونکوں میں گلابوں کی شیریں مہک محسوس ہوئی۔ عجیب طور پر اُس خوشبو نے مجھے بے چین کر دیا۔ گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی میں کوئی اچھے مزاج میں نہ تھا۔ لیکن اب وہ بدتر ہو گیا۔ وہاں

کھڑے اُس انتہائی شیریں خوشبو میں لپٹے ہوئے میں نے خود کو یہ شدید آرزو کرتے مجبور پایا کہ اس سارے منصوبے کو رہنے دوں اور اُس پُراسرار ڈراؤنی جگہ سے فوراً نکل جاؤں۔

لیکن اپنے لفظوں پر قائم رہتے ہوئے میں رکا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنا وقت گزرا تھا۔ میرے پپوٹے بوجھل ہونے لگے تھے اور میں روکنے کے باوجود جماہیاں لینے لگا تھا۔ ہوا کے اشتعال میں شدت آنے پر کسی نامعلوم وجہ سے میرے ذہن میں پرانی یادیں ابھرنے لگیں، تاریک اور پریشان کن یادیں، اُن تمام آدمیوں کی جنہیں میں نے قتل کیا تھا۔ میرے اندیشے نے مجھے حیران کر دیا۔ ماضی کو یاد کرنے پر عام طور پر مجھے گھبراہٹ نہیں ہوا کرتی تھی۔ دلگیر اور دستبردار، شاید کبھی کبھار افسردہ بھی مگر گھبرایا میں کبھی نہ تھا۔

میں نے اپنی ہمت بندھانے کو سیٹی پر چند گیت گنگنائے اور جب میں مجبور سا ہو گیا تو اپنی نگاہ گھر کے عقبی دروازے پر جمائی اور سرگوشی میں کہنے لگا، ''آؤ بھی شمس۔ مجھے اتنا انتظار مت کرواؤ۔ صحن میں نکل آؤ۔''

کوئی آواز نہیں۔ کوئی جنبش نہیں۔ کچھ نہیں۔

اچانک بارش برسنے لگی۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے صحن کی ترچھی دیواروں سے پرے دیکھ سکتا تھا۔ جلد ہی بارش میں اتنی شدت آ گئی کہ گلیاں بہتے دریا میں بدل گئیں اور میں پوری طرح بھیگ گیا۔

''لعنت ہو!'' میں نے کہا، ''لعنت! لعنت!''

میں سوچ رہا تھا کہ ایک رات کو یہ کام ملتوی کر دوں جب مجھے چھتوں اور راستوں پر برستی بارش کے شور میں ایک تیز آواز سنائی دی۔ صحن میں کوئی تھا۔

وہ شمس تبریز تھا۔ اپنے ہاتھ میں تیل کا چراغ تھامے وہ میری طرف چلا آ رہا تھا اور اُس جھاڑی سے محض چند قدم کے فاصلے پر آ ٹھہرا، جہاں میں چھپا ہوا تھا۔

''خوب صورت شب ہے آج، ہے ناں؟'' اُس نے پوچھا۔

اپنی الجھن پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے میں نے گہری سانس بھری۔ کیا اُس کے پہلو میں کوئی اور بھی موجود تھا یا وہ خود کلامی کر رہا تھا؟ کیا وہ جانتا تھا کہ میں یہاں موجود تھا؟ کیا وہ ممکنہ طور پر میری موجودگی سے آگاہ ہو سکتا تھا؟

سوالوں سے میرا دماغ ابل رہا تھا۔ تبھی مجھے ایک اور خیال آیا۔ تیز ہوا اور بارش کے باوجود اُس کے ہاتھ میں تھاما چراغ آخر کیسے روشن تھا؟ یہ سوال اپنے ذہن میں آتے ہی میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

مجھے شمس سے متعلق افواہیں یاد آ گئیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ کالے جادو میں اس قدر ماہر تھا کہ وہ کسی کے بھی کپڑوں میں دھاگا باندھ کر اور اپنے بدکلمات ادا کر کے اُسے رینگتے گدھے یا اندھی چمگادڑ

میں بدل سکتا تھا۔ اگرچہ میں نے کبھی ان احمقانہ باتوں کا یقین نہ کیا تھا اور اب بھی ایسا کرنے والا نہ تھا، جب میں کھڑا شمس کے چراغ کو تیز بارش میں ٹمٹماتے دیکھتا رہا، میں اس قدر کانپ رہا تھا کہ بے حرکت اور بے جنبش نہ رہ پایا۔

''برسوں پہلے تبریز میں میرے ایک معلم تھے۔'' شمس نے چراغ زمین پر رکھتے اور یوں اُسے میری بصارت سے پرے کرتے ہوئے کہا، ''وہی تھے جنھوں نے مجھے سکھایا کہ ہر بات ہر امر کا ایک وقت ہوتا ہے۔ یہ آخری اصولوں میں سے ایک ہے۔''

وہ کن اصولوں کی بات کر رہا تھا؟ یہ کس قسم کی اسرار بھری گفتگو تھی؟ مجھے تیزی سے فیصلہ کرنا تھا کہ مجھے جھاڑی کے پیچھے سے باہر نکلنا چاہیے یا پھر انتظار کرنا چاہیے کہ وہ میری طرف رخ سے موڑ لے... سوائے اس کے کہ اُس نے رخ کبھی نہ موڑا۔ اگر وہ میری یہاں موجودگی کے بارے جانتا تھا تو چھپنے کی کوئی تک نہ تھی۔ اگرچہ اس صورت میں کہ اُسے معلوم نہ تھا مجھے دیکھ بھال کر باہر نکلنا چاہیے تھا۔

لیکن پھر یوں جیسے میری الجھن بڑھانے کو مجھے باغ کی دیوار کے باہر کی طرف منتظر تین آدمیوں کے سایے بے چینی سے پہلو بدلتے دکھائی دیے۔ وہ ضرور اسی بات پر حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں درویش کے قتل کے لیے حرکت میں کیوں نہ آ رہا تھا۔

''یہ اصول نمبر سینتیس ہے۔'' شمس تبریز نے بات جاری رکھی، ''خدا ایک باریک بین گھڑی ساز ہے۔ اس قدر درست ہے اُس کا حکم کہ زمین پر ہر امر اپنے وقت پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ نہ لحہ بھر پہلے نہ ہی لحہ بھر تاخیر سے۔ اور بغیر کسی استثنا کے ہر کسی کے لیے یہ گھڑی بالکل درستی سے کام کرتی ہے۔ ہر کسی کے لیے محبت کا ایک مخصوص وقت ہے اور موت کا ایک وقت مقرر۔''

اُس لمحے میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ ہی سے بات کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں وہاں تھا۔ وہ صحن میں قدم دھرنے سے بھی قبل اس بات سے آگاہ تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اردگرد فضا گھٹن زدہ ہو گئی تھی۔ مزید چھپے رہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا، اور اسی طرح میں کھڑا ہوا اور جھاڑی کے پیچھے سے باہر نکل آیا۔ بارش ہر شے کو خاموشی میں لپیٹتے ہوئے یکا یک ویسے ہی تھم گئی جیسے شروع ہوئی تھی۔ ہم آمنے سامنے کھڑے ہوئے، قاتل اور مقتول اور صورت حال کی اجنبیت کے باوجود سب کچھ فطری تقریباً پُرامن محسوس ہوا۔

میں نے اپنی تلوار نکالی اور پوری قوت سے لہرائی۔ درویش نے اس قدر تیزی سے جھکائی دی، اُس کی جسامت کے آدمی سے جس کی توقع نہ تھی۔ میں دوبارہ وار کرنے والا تھا جب تاریکی میں ہلچل سی ہوئی اور چھ آدمی اچانک کہیں سے نمودار ہوئے، انھوں نے نیزوں اور بھالوں سے درویش پر حملہ کر دیا۔ بہ ظاہر لگتا تھا کہ تینوں نوجوان لڑکے اپنے دوستوں کو بھی لے آئے تھے۔ وہ لڑائی اس قدر شدید تھی کہ وہ سب زمین پر گرتے، لڑھکتے، دوبارہ قدموں پر اٹھتے اور دوبارہ گرتے، ایک کے بعد ایک ان

کے نیزے ٹوٹ رہے تھے۔

میں حیران اور مشتعل کھڑا دیکھتا رہا۔ اس سے قبل کبھی میں اُس قتل کے لیے چشم دید گواہ بن کر یوں کھڑا نہ رہا تھا جس کی مجھے ادائیگی کی گئی ہو۔ میں ان تینوں نوجوانوں کی ڈھٹائی پر اس قدر برہم تھا کہ میں بہ آسانی اُس درویش کو زندہ چھوڑ کر اُس کی بجائے ان تینوں سے برسرِ پیکار ہو سکتا تھا۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ان میں سے ایک آدمی ہذیان کے عالم میں چلّانے لگا، ''مدد! ہماری مدد کرو! گیڈرسر! یہ ہماری جان لینے والا ہے۔''

بجلی کی سی تیزی سے میں نے تلوار ایک طرف پھینکی، اپنے کمربند سے کھینچ کر خنجر نکالا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ ہم ساتوں نے درویش کو زمین پر پچھاڑ لیا اور ایک تیز وار میں مَیں نے خنجر اُس کے دل میں گاڑ دیا۔ اُس کے منہ سے صرف ایک گہری خرخراتی چیخ نکلی۔ اُس کی آواز اپنی انتہا پر ٹوٹ گئی۔ وہ دوبارہ ہلا تک نہیں، نہ ہی اُس نے سانس لی۔

ہم نے مل کر اُس کی لاش اٹھائی جو عجیب طور پر بے حد ہلکی پھلکی تھی اور اُسے کنویں میں گرا دیا۔ ہانپتے ہوئے ہم میں سے ہر ایک نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور لاش کے پانی میں گرنے کے چھپاکے کا انتظار کرنے لگے۔

وہ آواز کبھی نہ آئی۔

''آخر ہو کیا رہا ہے؟'' ایک آدمی بولا، ''کیا وہ اندر گرا نہیں؟''

''بالکل گرا ہے۔'' دوسرا بولا، ''کیسے ہو سکتا ہے کہ نہ گرا ہو؟''

وہ گھبرانے لگے تھے۔ میں بھی۔

''شاید وہ دیوار میں کسی اُبھری کھونٹی سے اٹک گیا ہو۔'' تیسرے آدمی نے خیال ظاہر کیا۔

یہ خیال ٹھیک لگتا تھا۔ اس پر وضاحت کا بوجھ ہمارے شانوں سے ہٹتا محسوس ہوا اور ہم نے خوشی خوشی ایک دوسرے کو گلے لگایا، اگرچہ ہم سب واقف تھے کہ کنویں کی دیواروں میں ایسی کوئی کھونٹی نہ تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہم کتنی دیر وہاں منتظر رہے، ایک دوسرے سے نگاہیں ملانے سے گریز کرتے رہے۔ صحن سے ہوا کا خنک جھونکا گزرا، ہمارے قدموں میں بید مجنوں کے پتلے بھورے پتے بکھیرتے ہوئے۔ اوپر آسمان پر صبح کا گہرا نیلا رنگ ہلکے نیلے رنگ میں بدلنے لگا تھا۔ ہو سکتا ہے دن چڑھنے تک ہم وہیں رکے رہتے، اگر گھر کا عقبی دروازہ نہ کھلا ہوتا اور ایک شخص باہر نہ نکلا ہوتا۔ میں نے انہیں فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ مولانا تھے۔

''آپ کہاں ہیں؟'' وہ چلّا کر بولے۔ ان کی آواز فکرمندی سے بوجھل تھی۔ ''کیا آپ یہاں ہیں، شمس؟''

اس نام کے ذکر پر ہم ساتوں اپنے قدموں پر اٹھے۔ چھے آدمی باغ کی دیواروں سے باہر کودے اور اندھیرے میں اوجھل ہو گئے۔ میں اپنے خنجر کی تلاش میں پیچھے رہ گیا جو مجھے جھاڑی کے نیچے کیچڑ میں لتھڑا مل گیا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے مزید لمحہ بھر بھی وہاں منڈلانا نہیں چاہیے تھا لیکن میں پلٹ کر دیکھنے کی خواہش پر قابو نہ پا سکا۔

اور پلٹ کر دیکھنے پر مجھے مولانا رومی صحن میں لڑکھڑا کر چلتے دکھائی دیئے اور پھر اچانک وہ بائیں جانب کنویں کی طرف مڑے، یوں جیسے کسی وجدان نے اُن کی رہنمائی کی ہو۔ وہ آگے کو جھکے، نیچے جھانکا اور لمحہ بھر وہیں کھڑے رہے۔ اُن کی نظریں کنویں کی نیم تاریکی کی عادی ہو رہی تھیں۔ پھر وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹے، اپنے گھٹنوں کے بل گرے، سینہ کوبی کرنے لگے اور ان کے حلق سے ایک دہشت خیز چیخ نکلی۔

''انہوں نے اُسے مار ڈالا! اُنہوں نے میرے شمس کو مار ڈالا!''

میں درویش کے خون سے رنگے خنجر کو پیچھے چھوڑ کر دیوار سے کودا اور یوں بھاگا جیسے زندگی میں پہلے کبھی نہ بھاگا تھا۔

ایلا

نارتھمپٹن، 12 اگست 2008ء

دھوپ بھرا اور قدرے خنک، وہ اگست کا عام سا دن تھا۔ کسی بھی دوسرے دن جیسا۔ ایلا صبح بیدار ہوئی، اُس نے اپنے شوہر اور بچوں کے لیے ناشتہ تیار کیا، انھیں کام، شطرنج کھیلنے اور ٹینس کلب جانے کے لیے نکلتے دیکھا، واپس اپنے کچن میں آئی، اپنی کک بک کھولی اور آج کے دن کے لیے مینو کا انتخاب کیا:

کریمی مشروم کے ساتھ پالک کا سوپ
مسٹرڈ مایونیز کے ساتھ Mussels، تیراگون بٹر ساس کے ساتھ سیپ مچھلی
کرین بیریز والا گارڈن سلاد، زوکینی رائس گریٹن، Rhubarb اور ونیلا کریم لیٹس پائی

اُس کو یہ کھانا بناتے ساری سہ پہر لگی۔ کام مکمل کرنے کے بعد اُس نے اپنی بہترین کراکری نکالی۔ اُس نے میز لگائی، نیپکن تہ کر کے رکھے اور پھول ترتیب دیے۔ اُس نے اوون کا ٹائم چالیس منٹ لگایا تاکہ سات بجے تک گریٹن تیار ہو۔ اُس نے کروٹن تیار کیے، سلاد کی ڈریسنگ کی، موٹی اور روغنی، بالکل جیسی ایوی کو پسند تھی۔ اُسے شمعیں جلانے کا خیال آیا لیکن دوبارہ سوچنے پر اُس نے یہ ارادہ بدل دیا۔ میز اسی طرح رہنے دینا بہتر تھا۔ کسی بے عیب تصویر کی طرح۔ اَن چھوئی۔ ساکن۔

پھر اُس نے سوٹ کیس اٹھایا جو اُس نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا اور گھر سے نکل آئی۔ باہر نکلتے ہوئے اُس نے زیرِ لب شمس تبریز کا ایک اصول بولا، ''خود سے یہ پوچھنا کبھی دیر آید نہیں ہوتا کہ 'کیا میں اس زندگی کی ڈگر بدلنے کے لیے تیار ہوں جو میں جی رہا ہوں؟ کیا میں اندر سے بدلنے کے لیے تیار ہوں؟'
اگر تمھاری زندگی کا ایک دن بھی گزشتہ دن جیسا ہو تو یقیناً یہ قابلِ رحم بات ہے۔ ہر لمحے اور ہر نئی سانس کے ساتھ، کسی کو تجدید کرنا اور تجدیدِ نو کرنا چاہیے۔ نئی زندگی میں جنم کا صرف ایک طریقہ ہے: موت سے پہلے مرنا۔''

علاؤالدین

قونیہ، اپریل 1248ء

بتدریج سرد گرم ہوتے، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اپنا ارادہ بدلتے کہ مجھے دوسروں سے کیا برتاؤ کرنا چاہیے، شمس تبریز کی وفات کے تین ہفتے بعد کہیں بالآخر مجھے یہ حوصلہ ہوسکا کہ جا کر اپنے والد سے بات کروں۔ وہ مجھے کتب خانے میں ملے، آتش دان کے قریب، کسی مجسمے کی طرح ساکت اور تنہا بیٹھے، اُن کے چہرے سے سائے سے گزر رہے تھے۔

''بابا، کیا میں آپ سے بات کرسکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

آہستگی سے، مبہم پن سے، یوں جیسے محو یادوں کے سمندر سے واپس ساحل کی جانب تیرتے ہوئے، انہوں نے مجھے دیکھا مگر بولے کچھ نہیں۔

''بابا، میں جانتا ہوں کہ آپ کا خیال ہے کہ شمس کی موت میں میرا کردار ہے لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ...''

میرے والد نے اچانک انگلی اٹھائی اور میری بات قطع کی۔ ''تمہارے اور میرے درمیان، میرے بیٹے، الفاظ خشک ہو چکے ہیں۔ مجھے تم سے کچھ نہیں سننا اور جواب میں تمہیں کچھ نہیں بتانا۔'' انہوں نے واضح کیا۔

''ایسا مت کہیے۔ مجھے وضاحت کرنے دیجئے۔'' میں نے لرزتی آواز میں التجا کی۔ ''میں خدا کی قسم کھاتا ہوں۔ وہ میں نہ تھا، میں اُن لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے یہ کیا، لیکن وہ قاتل میں نہ تھا۔''

''میرے بیٹے۔'' میرے والد نے دوبارہ بات قطع کی۔ اُن کا دکھ اب ختم ہو رہا تھا، اس کی جگہ ایک کپکپا دینے والا سکون لے رہا تھا، کسی ایسے شخص کا سا سکون جس نے بالآخر تکلیف دہ حقیقت کو قبول کرلیا ہو۔ ''تم کہتے ہو کہ وہ تم نہ تھے لیکن تمہاری سنجاف خون آلود ہے۔''

میں چونک کر اچھلا اور فوراً اپنے چغے کے کنارے دیکھے۔ کیا یہ سچ ہوسکتا تھا؟ کیا مجھ پر اُس

شام کا خون اب تک لگا تھا؟ میں نے سنجاف کا جائزہ لیا اور پھر اپنے بازوؤں کا، ہاتھوں اور ہاتھ کے ناخنوں کا۔ وہ سب صاف ستھرے دکھائی دیتے تھے۔ جب میں نے دوبارہ اپنا سر اٹھایا، بابا سے میری نگاہیں ملیں، تبھی مجھے اُس پھندے کی سمجھ آسکی جو انہوں نے میرے لیے بچھایا تھا۔

بلاارادہ اپنی سنجاف کو ٹٹول کر دیکھنے پر میں نے اپنا حال کھول دیا تھا۔

☼

یہ سچ تھا۔ میں اُس شام اُن کے ہمراہ مے خانے میں موجود تھا۔ قاتل کو یہ خبر دینے والا میں ہی تھا کہ شمس کو ہر شب صحن میں مراقبہ کرنے کی عادت تھی۔ اور اُس شب جب شمس تبریز برستی بارش میں اپنے قاتل سے بات کر رہے تھے، میں اُن چھے آدمیوں میں شامل تھا جو باغ کی دیوار پھلانگے تھے۔ اور جب ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں حملہ کر دینا چاہیے کیوں کہ واپسی کی کوئی راہ نہ تھی اور قاتل سستی دکھا رہا تھا، صحن کا راستہ میں نے ہی انہیں دکھایا تھا۔ لیکن بس یہی تھا۔ میں وہیں رکا رہا تھا۔ میں نے لڑائی میں حصہ نہ لیا تھا۔ حملہ کرنے والا بھبرس تھا، ارشاد اور باقی سب نے اُس کی مدد کی تھی۔ اور جب وہ گھبرا گئے تو باقی کام گیدڑ سر نے کیا تھا۔

بعد میں مَیں نے اُس لمحے کو اپنے دماغ میں اتنی بار گزارا کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ کون سا حصہ حقیقی ہے اور کون سا حصہ میرے تخیل کی کرشمہ سازی ہے۔ ایک یا دو مرتبہ میرے ذہن سے یہ یاد گزری کہ شمس ہمارے ہاتھوں سے نکل کر رات کی تاریکی میں اوجھل ہو گئے تھے اور یہ تصور اس قدر واضح تھا کہ میں نے اس کا تقریباً یقین کر لیا۔

اگرچہ وہ جا چکے ہیں، ہر طرف ہر جگہ اُن کے نشانات ہیں۔ رقص، شاعری، موسیقی اور وہ سب چیزیں جو میں نے خیال کیا تھا کہ ایک بار وہ چلے جائیں تو ختم ہو جائیں گی، ہماری زندگیوں میں مضبوطی سے قائم رہیں۔ میرے والد شاعر ہو چکے ہیں۔ شمس تبریز درست کہتے تھے۔ جب ایک مرتبان ٹوٹ جائے تو دوسرا بھی ٹوٹ جائے گا۔

میرے والد ہمیشہ ہی سے ایک محبت کرنے والے آدمی تھے، انہوں نے ہر مذہب کے لوگوں کو گلے لگایا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ عیسائیوں، یہودیوں حتیٰ کہ کفار پر بھی مہربان تھے۔ جب سے شمس تبریز اُن کی زندگی میں آئے، اُن کی محبت کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ اس میں معاشرے کے راندۂ درگاہ بھی شامل ہو گئے...... طوائفیں، شرابی اور بھکاری، قابل نفرین لوگ بھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ حتیٰ کہ شمس تبریز کے قاتلوں سے بھی محبت رکھ سکتے تھے۔

پھر بھی ایک شخص تھا اور ہے، جس سے وہ کبھی محبت نہ کر سکے: اُن کا بیٹا۔

سلطان ولد

قونیہ، ستمبر 1248ء

بھکاری، شرابی، طوائفیں، یتیم اور چور.... وہ اپنا سارا سونا چاندی مجرموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اُس ناگوار خوف ناک رات کے بعد سے میرے والد پہلے جیسے نہیں رہے۔ ہر کسی کا کہنا ہے کہ رنج وغم کے مارے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں۔ جب پوچھا جائے کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو وہ امرالقیس کا قصہ سناتے ہیں، شاہِ عرب جسے بے حد پسند کیا جاتا تھا، بے انتہا امیر اور وجیہہ، لیکن ایک روز غیر متوقع طور پر انہوں نے اپنی مکمل و بھرپور زندگی ترک کر دی۔ امرالقیس نے درویشی خرقہ پہنا، اپنی تمام مال ودولت چھوڑی اور تب کے بعد سے ایک سے دوسری جگہ سرگرداں رہے۔

''اپنے محبوب سے محرومی پر آپ یونہی بدل جاتے ہیں۔'' میرے والد نے کہا، ''یہ تمہاری شاہانہ ذات کو خاک میں تحلیل کر کے اندر کے درویش کو باہر لے آتا ہے۔ اب جب کہ شمس ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں، میں بھی رخصت ہو چکا ہوں۔ میں اب کوئی عالم یا مبلغ یا واعظ نہیں رہا۔ میں عدم کی تجسیم ہوں۔ یہی میری فنا ہے، یہی میری بقا۔''

اگلے روز سرخی مائل سنہری بالوں والے تاجر نے ہمارے دروازے پر دستک دی جو دنیا کے بدترین دروغ گو دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ شمس تبریز سے اُن کے بغداد کے برسوں سے واقف تھا۔ پھر اپنی آواز کو کسی رازدارانہ سرگوشی میں بدلتے ہوئے اُس نے قسم کھائی کہ شمس تبریز حیات اور بخیریت تھے۔ اُس کے مطابق، شمس تبریز، ہندوستان کے کسی آشرم میں رُوپوش مراقبہ کر رہے تھے اور ظاہر ہونے کے لیے مناسب وقت کے منتظر تھے۔

یہ سب بتاتے ہوئے اُس کے چہرے پر کسی ایمان داری کا شائبہ تک نہ تھا۔ لیکن میرے والد گویا دیوانے ہی ہوگئے۔ انہوں نے اُس شخص سے پوچھا کہ اس شان دار خوش خبری کے بدلے میں وہ کیا چاہتا تھا۔ ذرا سی بھی شرم کیے بغیر اُس تاجر نے کہا کہ اپنے لڑکپن میں وہ درویش بننا چاہتا تھا لیکن

چوں کہ زندگی اُسے کسی اور ڈگر پر لے گئی تو وہ کم سے کم مولانا رومی جیسے مشہور و معروف عالم کا کافتان پا کر بے حد خوش ہوگا۔ یہ سن کر میرے والد نے اپنا مخمل کا بیش قیمت کافتان اٹھایا اور اُسے فوراً ہی تھما دیا۔

''لیکن بابا، آپ نے اپنا بیش قیمت کافتان اُس شخص کو کیوں دیا جب کہ آپ بہ خوبی جانتے ہیں کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا؟'' میں نے اُس آدمی کے رخصت ہوتے ہی دریافت کیا۔

اس پر میرے والد نے جو کہا، وہ یہ تھا: ''تم سمجھتے ہو کہ اُس کے جھوٹ کے سامنے کافتان کی قیمت بہت زیادہ تھی؟ لیکن میرے پیارے بیٹے، تصور کرو، اگر وہ سچ کہہ رہا تھا، اگر شمس واقعی زندہ ہوتے تو اس خبر کے عوض میں اپنی زندگی دے دیتا!''

رومی

قونیہ، 31 اکتوبر 1260ء

بتدریج دکھ رنج میں بدلتا ہے، وقت کے ساتھ رنج خاموشی میں اور خاموشی تنہائی پسندی میں بدل جاتی ہے، تاریک سمندروں جیسی وسیع اور بے اَنت۔ آج اُس روز کو سولہ برس گزر چکے ہیں جب شکر فروشوں کی سرائے کے سامنے میری اور شمس کی ملاقات ہوئی تھی۔ چالیس اصولوں پر غور وفکر کرتے میں نے چالیس روز چلّہ میں گزارے۔ میں نے اُن میں سے ہر ایک کو یاد کیا اور اُس پر نظرِ ثانی کی لیکن میرے ذہن کے دُور دراز گوشوں میں صرف شمس تبریز تھے، درخشاں۔

آپ سمجھتے ہیں کہ آپ مزید زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ سوچتے ہیں کہ آپ کی روح کی روشنی بجھ چکی اور یہ کہ آپ اب ہمیشہ تاریکی میں رہیں گے۔ لیکن جب آپ کو ایسی ٹھوس تاریکی نگل لے، جب آپ کی دونوں آنکھیں دنیا سے بند ہو جائیں، تو آپ کے قلب میں تیسری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اور تبھی آپ کو ادراک ہوتا ہے کہ بصارت، باطنی علم سے تضاد رکھتی ہے۔ محبت کی آنکھ یا نگاہ سے بہتر اور تیز نگاہ کوئی آنکھ نہیں۔ رنج ایک اور موسم، ایک اور وادی، آپ کی ایک اور ذات لاتا ہے۔ اور محبوب جو کہیں دکھائی نہیں دیتا، آپ اُسے چہار سو دیکھنے لگتے ہیں۔

آپ اُسے پانی کے قطرے میں دیکھتے ہیں جو سمندر میں گرتا ہے، چاند کے طلوع ہونے پر اٹھتی موج میں یا صبح کی ہوا میں جو تازہ مہک لیے آتی ہے، آپ اُسے ریت کی رمالی نشانیوں میں دیکھتے ہیں، سورج کی دھوپ میں چمکتے خاک کے ذرّات میں، نوزائیدہ بچے کی مسکراہٹ میں یا اپنی دھڑکتی رگوں میں۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ شمس جا چکا ہے جب کہ وہ ہر کہیں ہے، ہر شے میں ہے؟

اداسی اور چاہت کی سست رَو گردش کی گہرائی میں ہر روز، ہر لمحہ میں شمس کے ہمراہ ہوں۔ میرا سینہ وہ غار ہے جہاں شمس محوِ آرام ہے۔ بالکل جیسے پہاڑ اپنے اندر بازگشت رکھتا ہے، میں اپنے اندر شمس کی صدا رکھتا ہوں۔ میں جو کبھی عالم اور مبلغ تھا، اُس کا ذرہ بھی باقی نہیں رہا۔ محبت میرے سارے عمل

اور عادتیں بدل چکی ہے۔ اس کی بجائے اس نے مجھے شاعری سے معمور کر دیا۔ اور اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میرے باطن کے سفر کے بیان کے لیے کوئی الفاظ نہیں، میں لفظوں پر یقین رکھتا ہوں۔ میں لفظوں پر ایمان رکھنے والا ہوں۔

میرے مشکل ترین ایام میں دو لوگوں نے میری مدد کی: میرا بڑا بیٹا اور صلاح الدین نامی ولی، ایک زرکوب (سونا کوٹ کر ورق بنانے والا)۔ اس کی چھوٹی سی دکان میں اُسے کام کرتے ہوئے جہاں وہ سونے کی پرتوں کو مہارت سے کوٹتا ہے، مجھے وہ شان دار فیض ملا کہ میں نے درویشوں کے رقص میں حتمی تبدیلیاں کیں۔ صلاح الدین کی دکان سے ابھرتی لے کائنات کی نبض سے مشابہ تھی، الوہی لے جس کی بات شمس تبریز نے کی اور جس کا اُنہیں بہت خیال تھا۔

کچھ عرصے میں میرے بڑے بیٹے کی شادی صلاح الدین کی بیٹی فاطمہ سے ہو جائے گی۔ ذہین اور متجسس فاطمہ مجھے کیمیا کی یاد دلاتی تھی۔ میں نے اُسے قرآن کی تعلیم دی۔ وہ مجھے اس قدر عزیز ہو گئی کہ میں اُسے اپنی دائیں آنکھ اور اُس کی بہن ہادیہ کو اپنی بائیں آنکھ کہنے لگا۔ یہ وہ بات ہے جو عزیز کیمیا عرصہ پہلے مجھ پر ثابت کر چکی تھی: یہ کہ لڑکیاں اگر بہتر نہ سہی، تو لڑکوں جیسی ہی اچھی طالبہ علم ہیں۔ میں نے خواتین کے لیے بھی سماع کا انتظام کیا اور صوفی بہنوں کو یہ روایت جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

چار سال قبل میں نے مثنوی پڑھنا شروع کی۔ پہلا برمحل مصرع مجھ پر ایک روز صبح کاذب کے وقت یکا یک اترا تھا جب میں سورج کی روشنی کو تاریکی چیرتے دیکھ رہا تھا۔ تب سے یہ نظم خود بخود جیسے اپنی ہی کسی طاقت سے میرے لبوں سے نکلتی چلی گئی۔ میں اسے تحریر نہیں کرتا۔ وہ صلاح الدین تھا جس نے اس مثنوی کو محنت سے تحریر کی صورت سپردِ قلم کیا اور میرے بیٹے نے اس کی نقول تیار کیں۔ انہی کی بدولت یہ نظمیں باقی رہیں۔ الفاظ پرندوں کی ڈاروں کی صورت مجھ پر اترتے اور اسی طرح اچانک غائب ہو جاتے ہیں، ہجرتی پرندوں کی طرح۔ میں صرف وہ ذخیرۂ آب ہوں جہاں وہ ذرا دیر رکتے اور گرم زمینوں کی طرف روانگی سے قبل تھکن اتارتے اور ستاتے ہیں۔

جب میں نظم آغاز کرتا ہوں تو مجھے پہلے سے کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہنے جا رہا ہوں۔ وہ طویل بھی ہو سکتی ہے اور مختصر بھی۔ میں اس کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں سوچتا۔ اور جب نظم مکمل ہو جاتی ہے تو میں پھر سے خاموش ہو جاتا ہوں۔ میں خاموشی میں جیتا ہوں۔ اور ''خاموش'' اُن دو تخلص میں سے ایک ہے جو میں اپنی غزلوں میں استعمال کرتا ہوں۔ دوسرا ہے، شمس تبریز۔

دنیا اس قدر تیز رفتاری سے حرکت میں ہے اور تبدیل ہو رہی ہے کہ جسے ہم انسان اپنے اختیار میں لا سکتے ہیں نہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ 1258ء میں منگولوں کے ہاتھ سقوطِ بغداد ہوا۔ واحد شہر جسے اپنی مضبوطی اور دل رُبائی پر فخر تھا اور جسے دنیا کا مرکز ہونے کا دعویٰ تھا، شکست سے دوچار ہوا۔ اِسی برس صلاح الدین کی وفات ہوئی۔ میرے درویشوں اور میں نے دمدموں اور نے کے ساتھ گلیوں سے گزرتے، مسرت سے

گاتے اور رقص کرتے ہوئے ایک بڑا جشن منایا کیوں کہ کسی ولی کو اسی طرح دفنانا چاہیے۔

1260ء میں ہارنے کی باری منگولوں کی تھی۔ مصر کے مملوکوں نے انہیں شکست دی۔ کل کے فاتح آج کے شکست خوردہ ٹھہرے۔ ہر فاتح یہی خیال کرنے کی جانب مائل ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ فتح مند رہے گا۔ ہر شکست خوردہ کو خدشہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ شکست کھاتا رہے گا۔ لیکن دونوں ایک ہی سبب سے غلط ہوتے ہیں: خدا کے سوا سب کچھ بدلتا رہتا ہے۔

صلاح الدین کی وفات کے بعد طالب علم حسام جو روحانی راستے پر بڑی تیزی اور اس قدر خوبی سے سمجھ دار ہوا تھا کہ اب اُسے ہر کوئی حسام چلیبی پکارنے لگا ہے، میری نظموں کو تحریر کرنے میں مدد کرنے لگا۔ وہ محرر ہے جسے میں نے پوری مثنوی لکھوائی۔ منکسر المزاج اور فیاض، اگر حسام سے کوئی پوچھے کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے تو وہ لمحے بھر کا انتظار بھی کیے بغیر کہتا ہے، ''میں شمس تبریز کا عاجز پیروکار ہوں۔ میں بس یہی ہوں۔''

ذرا ذرا کر کے کوئی چالیس، پچاس اور ساٹھ برس کا ہوتا ہے، ہر بڑی دہائی کے بعد وہ خود کو مزید مکمل محسوس کرتا ہے۔ آپ کو چلتے رہنا ہوتا ہے، اگرچہ پہنچنے کو کوئی منزل نہیں۔ کائنات دمادم بدل رہی ہے اور اسی طرح چاند و سورج بھی لیکن یہ ہم انسانوں کے اندر نہاں راز کے سوا کچھ نہیں جو اس ساری گردش کا سبب ہے۔ اس علم کے ساتھ ہم درویش محبت اور دل شکستگی سے رقصاں اپنی راہ بناتے رہیں گے، چاہے کوئی بھی سمجھ نہ پائے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہم فساد و انتشار یا اور کسی بڑی جنگ کے درمیان بھی یونہی رقصاں ہوں گے۔ ہم دکھ اور رنج و غم میں بھی رقص کریں گے، مسرت اور سرخوشی میں بھی، تنہا اور مل کر، پانی کے بہاؤ کی طرح ست روی اور روانی سے۔ ہم اپنے لہو میں رقص کریں گے۔ کائنات میں جو کچھ تھا اور ہے، اس کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور ٹھیک توازن ہے۔ نقطے مسلسل تبدیل ہوتے اور ایک دوسرے سے جگہ بدلتے ہیں لیکن دائرہ مکمل رہتا ہے۔ اصول نمبر انتیس: ''جزو تبدیل ہوتا ہے، ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ ہر چور جو اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے، اس کی جگہ ایک نیا چور پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر مہذب و نفیس کی جگہ نیا مہذب اور نفیس لیتا ہے۔ اس طور نہ صرف کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہتا بلکہ کچھ بھی درحقیقت مجموعی بدلتا نہیں۔

ہر صوفی جو مرتا ہے، اس کی جگہ کہیں کوئی اور صوفی جنم لیتا ہے۔''

ہمارا مذہب، مذہب عشق ہے، اور ہم سب دلوں کی زنجیر کی صورت باہم جڑے ہوئے ہیں۔ اگر اور جب کوئی کڑی ٹوٹ جاتی ہے تو کہیں اور کسی دوسری کڑی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہر شمس تبریز جو اس جہان سے گزر جائے اُس کی جگہ کسی مختلف زمانے میں، کسی مختلف نام سے کسی نئے شمس کا ظہور ہوگا۔

نام بدل جاتے ہیں، لوگ آتے اور جاتے ہیں لیکن جوہر اور روح وہی رہتے ہیں۔

ایلا

قونیہ، 7 ستمبر 2008ء

اُس کے سرہانے وہ پلاسٹک کی کرسی پر سو رہی تھی جب اچانک اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ایک غیر متوقع آواز سنی۔ کوئی تاریکی میں اَن جان سے الفاظ پکار رہا تھا۔ اُسے ادراک ہوا کہ وہ باہر سے آتی اذان کی صدا تھی۔ ایک نئے دن کا آغاز ہونے والا تھا۔ لیکن اُسے احساس سا ہوا کہ یہ کسی چیز یا انجام یا اختتام بھی ہوگا۔

کسی بھی ایسے شخص سے پوچھیے جس نے فجر کی اذان پہلی بار سنی ہو اور آپ کو ایسا ہی کچھ بتائے گا۔ یہ کہ وہ بے حد خوب صورت، ثمر آور اور پُراسرار ہے۔ اور اسی دوران اس کے بارے کچھ بھید بھرا کچھ عجیب پُراسرار سا بھی ہے۔ بالکل محبت کی طرح۔

رات کے سکوت میں یہی صدا تھی جس نے ایلا کو چونکا کر جگا دیا تھا۔ وہ تاریکی میں بار بار آنکھیں جھپکتی رہی۔ یہاں تک اُسے سمجھ آ پائی کہ کمرے کو بھرتی مردانہ آواز کھلی کھڑکیوں سے اندر آ رہی تھی۔ اُسے یہ یاد کرنے میں پورا منٹ لگا کہ وہ اب میساچوسٹس میں نہ تھی۔ یہ وہ کشادہ گھر نہ تھا جہاں وہ اپنے شوہر اور تین بچوں کے ہمراہ رہتی تھی۔ وہ سب کسی اور وقت اور زمانے سے متعلق تھے... اس قدر دُور اور مبہم وقت کہ وہ اُسے اپنا ماضی نہیں بلکہ کوئی خیالی کہانی محسوس ہوا۔

نہیں، وہ میساچوسٹس میں نہ تھی۔ اس کی بجائے وہ دنیا کے ایک بالکل مختلف خطے میں تھے، ترکی کے شہر قونیہ کے ایک ہسپتال میں۔ اور وہ شخص جس کی گہری اور متواتر سانسیں اُسے اب فجر کی اذان کے ساتھ سنائی دے رہی تھیں، وہ بیس برسوں سے اُس کا شوہر نہیں بلکہ وہ محبوب تھا، گزشتہ موسم سرما کے ایک دھوپ بھرے دن جس کی خاطر وہ اپنے شوہر کو چھوڑ آئی تھی۔

''کیا تم اپنے شوہر کو ایک ایسے شخص کے لیے چھوڑ رہی ہو جس کا کوئی مستقبل نہیں؟'' اُس کے دوستوں اور ہمسایوں نے اُس سے بار بار پوچھا تھا، ''اور تمہارے بچوں کا کیا ہوگا؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ

وہ تمہیں کبھی معاف کرسکیں گے؟''

اور یوں ایلا کو اس بات کی سمجھ آ پائی تھی کہ معاشرے کی نگاہوں میں اس سے بدتر کہ کوئی عورت کسی دوسرے مرد کے لیے اپنے شوہر کو چھوڑ دے، یہ بات تھی کہ کوئی عورت اپنے لحۂ موجود کے لیے اپنے مستقبل کو ترک کردے۔

اُس نے ٹیبل لیمپ جلایا اور اس کی دھیمی عنبریں روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا، یوں جیسے یہ یقین دہانی حاصل کرنے کو کہ جب سے وہ چند گھنٹے قبل نیند کے جہان میں اتری تھی، کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ وہ کسی ہسپتال کا ایسا مختصر ترین کمرا تھا جو اُس نے دیکھا ہو، ایسا نہیں تھا کہ اُس نے اپنی زندگی میں بہت سے ہسپتالوں کے کمرے دیکھے ہوں۔ کمرے کی بیشتر جگہ بیڈ گھیرے ہوئے تھا۔ باقی سب کچھ بیڈ کو سامنے رکھتے ہوئے رکھا گیا تھا...... لکڑی کی الماری، چوکور کافی ٹیبل، اضافی کرسی، خالی گل دان، مختلف رنگوں کی گولیوں والی بیڈ ٹرے اور اس کے برابر میں وہ کتاب جو عزیز اس سفر کے آغاز سے پڑھ رہا تھا: ''میں اور رومی۔''

وہ چار روز پہلے قونیہ پہنچے تھے، شروع کے دن انہوں نے عام سیاحوں سے مختلف طرح نہیں گزارے تھے... یادگار عمارات، عجائب گھروں اور آثار قدیمہ کی سیر، مقامی کھانے کھانا اور ہر نئی چیز چاہے وہ عام اور احمقانہ ہی کیوں نہ ہوتی، کی تصویریں لینا۔ گزشتہ روز تک سب ٹھیک تھا، جب عزیز ایک ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھاتے فرش پر گر گیا اور اُسے تیزی سے قریب ترین ہسپتال لے جانا پڑا۔ تب سے وہ اُس کے سرہانے منتظر تھی، یہ جانے بغیر منتظر کہ کیا توقع رکھے، امید کے برخلاف امید کرتی اور اسی دوران خاموشی اور شدت سے خدا سے بحث و تکرار کرتی ہوئی کہ وہ اُس محبت کو اتنی جلدی اُس سے واپس لے رہا تھا جو اُس نے اس قدر تاخیر سے اُسے عطا کی تھی۔

''مائی ڈیئر، کیا تم سو رہے ہو؟'' ایلا نے پوچھا۔ اُسے تنگ کرنے کا اُس کا ارادہ نہ تھا لیکن وہ چاہتی تھی کہ وہ جاگ جائے۔

اُس کی طرف سے کسی جواب کی بجائے اُس کی سانسوں کے لَے کی ہولی سی آواز آتی رہی، تسلسل میں کہیں کوئی کھویا ہوا اثر۔

''کیا تم جاگ گئے ہو؟'' اُس نے ایک ہی وقت میں سرگوشی کرتے اور آواز بلند کرتے پوچھا۔

''اب جاگ گیا ہوں۔'' عزیز نے ہولے سے کہا، ''کیا بات ہے، تم سو نہیں پائی؟''

''فجر کی اذان..... '' ایلا نے کہا اور یوں توقف کیا جیسے اس بات نے ساری وضاحت کردی ہو: اُس کی گرتی صحت، ایلا کا اُسے کھو دینے کا اندیشہ، اور وہ مکمل حماقت کہ جو وہ محبت تھی... سب کچھ ان تین لفظوں میں سما گیا۔

اپنی سبز آنکھیں جھپکے بنا عزیز اب سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اور سفید ڈھلی چادروں میں گھرے ہوئے اُس کا وجیہہ چہرہ افسردگی سے زرد دکھائی دیا، لیکن اُس پر کچھ طاقت در بھی تھا۔

''فجر کی نماز اہم ہے۔'' اُس نے زیرِ لب کہا، ''کیا تم جانتی ہو کہ مسلمانوں کو روزانہ پانچ بار نماز ادا کرنا ہوتی ہے، صبح کی نماز کو سب سے مقدس مگر سب سے زیادہ آزمائش بھری بھی کہا جاتا ہے؟''

''اور ایسا کیوں ہے؟''

''میرا خیال ہے اِس لیے کہ یہ ہمیں خوابوں سے بیدار کرتی ہے اور ہمیں یہ پسند نہیں۔ ہم سوتے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صبح کی اذان میں ایک مزید جملہ ادا کیا جاتا ہے جو باقی سب میں نہیں۔ اس کے مطابق، ''نماز نیند سے بہتر ہے۔''

لیکن شاید نیند ہم دونوں کے لیے بہتر ہے، ایلا نے سوچا۔ کاش کہ ہم ساتھ خوابیدہ ہو سکتے۔ اُسے کسی ایسی آسان خوابیدگی کی چاہ تھی جس میں کوئی خلل نہ ہو، سلیپنگ بیوٹی سے کم سحر انگیز نہیں، اس تکلیف سے آرام کے لیے ایک سو برس کی مکمل بے حسی۔

کچھ دیر میں اذان ہونا بند ہو گئی، اس کی بازگشت دُور ہٹتی لہروں میں پرے تیر گئی۔ آخری سُر کے مدھم پڑنے پر دنیا عجیب طور پر محفوظ محسوس ہوئی، لیکن ناقابل برداشت حد تک خاموش بھی۔ وہ ایک برس سے ساتھ تھے۔ محبت و آگہی کا ایک برس۔ بیشتر اوقات عزیز سفر میں ایلا کا ساتھ دیتے ہوئے ٹھیک ہی رہا تھا مگر گزشتہ دو ہفتوں سے اُس کی صحت واضح طور پر گرتی چلی جا رہی تھی۔

ایلا نے اُسے دوبارہ نیند میں اترتے دیکھا۔ اُس کا چہرہ اس قدر پُرسکون اِس قدر پیارا تھا۔ ایلا کا دماغ پریشانی و اضطراب سے بھر گیا۔ اُس نے گہری سانس بھری اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ برآمدوں سے گزری جہاں سب دیواروں پر سبز پینٹ کیا گیا تھا، وہاں سے ہوتے وہ وارڈز میں داخل ہوئی جہاں اُسے بوڑھے اور نوجوان، مرد اور عورتیں، مریض دکھائی دیے، کچھ رُو بہ صحت ہوتے ہوئے اور کچھ کی صحت مزید بگڑتی ہوئی تھی۔ اُس نے لوگوں کی سوالیہ نگاہوں کی پرواہ نہ کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کے سنہری بال اور نیلی آنکھیں اُس کے غیر ملکی ہونے کو عیاں کر رہے تھے۔ اُس نے پہلے کبھی خود کو اس قدر بے جگہ اور اجنبی محسوس نہ کیا تھا۔ لیکن پھر یہ بھی تھا کہ ایلا نے اتنا سفر ہی کب کیا تھا۔

چند منٹوں بعد وہ ہسپتال کے چھوٹے سے خوش گوار باغ میں فوارے کے قریب جا بیٹھی۔ فوارے کے بیچ ایک ننھے فرشتے کا مجسمہ تھا اور اُس کے قدموں میں چند نقرئی سکے چمک رہے تھے، ہر کوئی کسی کی پوشیدہ تمنا و آرزو کا حامل تھا۔ اُس نے سکے کی تلاش میں اپنی جیبیں کھنگالیں مگر وہاں اُسے کاغذ کے ایک تحریر شدہ پرزے اور آدھی Granola بار کے سوا کچھ نہ مل سکا۔ باغ میں نظر دوڑاتے ہوئے اُسے چند کنکریاں دکھائی دیں۔ ہموار، سیاہ اور چمکیلی۔ اُس نے ایک کنکری اٹھائی، آنکھیں بند کیں اور اُسے

فوارے میں اچھال دیا، اس کے لبوں پر وہ تمنا تھی جو وہ پہلے ہی جانتی تھی کہ قبول نہ ہوگی۔ کنکری فوارے کی دیوار سے ٹکرا کر اچھلی اور سنگی فرشتے کی جھولی میں جا گری۔

اگر عزیز وہاں موجود ہوتا، ایلا نے سوچا، تو وہ اسے ایک شگون کے طور پر لیتا۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ واپس آئی تو اُسے کمرے میں ڈاکٹر اور ایک نوجوان نرس سر پہ سکارف اوڑھے ملے اور چادر عزیز کے سر تک کھینچی ہوئی تھی۔

وہ دنیا سے گزر چکا تھا۔

☼

عزیز کو قونیہ میں دفنا دیا گیا، اُس کے محبوب رومی کے نقوشِ قدم پر۔

ایلا نے ہر تفصیل کا خیال کرتے تمام انتظامات دیکھے اور یہ بھروسا کرتے ہوئے کہ خدا ان معاملوں میں اُس کی مدد فرمائے گا جن سے وہ نمٹ نہ سکتی تھی۔ پہلے اُس نے قبر کی جگہ کا انتظام کیا... ایک پرانے مسلمان قبرستان میں چھپا کے ایک بڑے سے درخت تلے۔ پھر اُس نے صوفی موسیقار تلاش کیے جو نَے بجانے پر راضی ہو گئے اور عزیز کے دنیا بھر میں موجود دوستوں کو ای میل کر کے جنازے پر مدعو کیا۔ اُسے خوشی ہوئی کہ اُن میں سے کافی سارے کیپ ٹاؤن، سینٹ پیٹرز برگ، مرشد آباد اور ساؤ پالو جیسی دُور دراز جگہوں سے بھی وہاں پہنچ گئے۔ اُن میں عزیز جیسے فوٹو گرافروں کے ساتھ ساتھ، سکالرز، صحافی، لکھاری، رقاص، مجسمہ ساز، تاجر، کسان، گھریلو خواتین اور عزیز کے لے پالک بچے بھی شامل تھے۔

وہ ایک گرم جوش، مسرت بھری تقریب تھی جس میں تمام مذاہب کے لوگوں نے شرکت کی۔ انہوں نے اُس کی موت کو اُسی طرح منایا جیسا کہ وہ جانتے تھے کہ اُس کی آرزو ہوگی۔ بچے اپنی مرضی وخوشی سے کھیلتے رہے۔ ایک میکسیکن شاعر نے Pan de los muertos تقسیم کی اور عزیز کے ایک پرانے سکاٹش دوست نے گلاب کی پتیاں ان پر کسی چمکیلے رنگین کاغذوں کی طرح برسائیں، ان میں سے ہر ایک رنگین گواہی تھی کہ موت ایسی شے نہ تھی کہ جس سے خوف زدہ ہوا جائے۔ ایک مقامی کبڑے بوڑھے مسلمان نے اس سارے منظر کو دانت نکالتے اور چھیدتی طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور کہا کہ ایسا پاگلانہ جنازہ قونیہ نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا، ماسوائے صدیوں پہلے مولانا کے جنازے کے۔

جنازے کے دو روز بعد جب ایلا بالآخر تنہا ہو گئی۔ اُس نے شہر میں چہل قدمی کی، خاندانوں کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا، دکانوں میں، تاجروں کو اور کچھ بھی اُسے فروخت کرنے کے مشتاق پھیری فروشوں کو۔ لوگوں نے اپنے درمیان گریہ سے سوجی آنکھیں لیے گھومتی اس امریکی عورت کو غور سے دیکھا۔ وہ یہاں بالکل اجنبی تھی، ہر جگہ ایک مکمل اجنبی۔

ہوٹل واپس پہنچ کر اُس نے چیک آؤٹ کیا اور ایئر پورٹ کا رخ کیا۔ ایلا نے اپنی جیکٹ اتار کر Peach رنگ کا انگورا سویٹر پہن لیا۔ کسی ایسی عورت کے لیے بہت عاجزانہ اور مطیع رنگ جو دونوں میں

سے کچھ بھی بننے کی کوشش نہ کر رہی ہو، اُس نے سوچا۔ پھر اُس نے جینٹ کو فون کیا، اُس کے تین بچوں میں سے واحد جس نے اس کے فیصلے کی حمایت کی تھی کہ وہ اپنے دل کے کہے راستے پر چلے۔ اورلی اور ایوی ابھی تک اپنی ماں سے بات نہ کر رہے تھے۔

''مام! آپ کیسی ہیں؟'' جینٹ نے گرم جوشی سے بھری آواز میں پوچھا۔

ایلا اپنے سامنے خالی جگہ کی سمت جھکی اور یوں مسکرائی جیسے اُس کی بیٹی اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر اُس نے دھیمی تقریباً نا قابل سماعت آواز میں کہا، ''عزیز مر چکا ہے۔''

''اوہ مام، مجھے بے حد افسوس ہے۔''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ چھا گیا کیوں کہ دونوں سوچ رہی تھیں کہ کیا کہیں۔ اس خاموشی کو توڑنے والی جینٹ تھی۔ ''مام، کیا اب آپ گھر آ جائیں گی؟''

ایلا نے سوچا، اس کی بیٹی کے سوال میں ایک اور اَن کہا سوال موجود تھا۔ کیا وہ اپنے شوہر کے پاس نارتھیمپٹن واپس چلی جائے گی اور طلاق کے پراسس کو روک دے گی جو پہلے ہی باہمی الزامات اور خفگی کے معمے میں بدل چکا تھا؟ وہ اب کیا کرنے والی تھی؟ اُس کے پاس دولت نہ تھی اور اُس کے پاس کوئی نوکری بھی نہ تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ انگریزی پر پرائیویٹ لیکچرز دے سکتی تھی۔ کسی میگزین کے لیے کام کر سکتی تھی اور کون جانتا ہے کسی روز وہ ایک اچھی فکشن ایڈیٹر بن جائے۔

لمحے بھر کو اپنی آنکھیں بند کرتے، ایلا نے مسرت بھرے یقین اور اعتماد کے ساتھ اپنے سامنے پیش گوئی کی کہ آنے والے دن اُس کے لیے کیا لائیں گے۔ وہ پہلے کبھی یوں اپنے بل بوتے پر نہ رہی تھی اور پھر بھی عجیب تھا کہ وہ خود کو تنہا محسوس نہ کر رہی تھی۔

''میں تمہاری کمی محسوس کرتی رہی ہوں، بے بی۔'' اُس نے کہا، ''میں نے تمہارے بھائی اور بہن کی کمی بھی محسوس کی ہے۔ کیا تم مجھے ملنے آؤ گی؟''

''بالکل، میں آؤں گی ماما... ہم ملیں گے... لیکن اب آپ کیا کریں گی؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ واپس نہیں آ رہیں؟''

''میں ایمسٹرڈیم جا رہی ہوں۔'' ایلا نے کہا، ''وہاں نہر کنارے بڑے شاندار چھوٹے چھوٹے فلیٹس ہیں۔ میں ان میں سے کوئی کرائے پر لے سکتی ہوں۔ مجھے اپنی بائیکنگ بھی بہتر کرنا ہے۔ میں نہیں جانتی... میں کوئی منصوبے نہیں بناؤں گی، بس۔ میں چاہوں گی کہ میں آج کے آج جیوں، لمحۂ موجود میں۔ میں دیکھوں گی کہ میرا دل کیا کہتا ہے۔ یہ بھی اصولوں میں سے ایک ہے، ہے ناں؟''

''کون سے اصول، مام؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

ایلا کھڑکی کے قریب آئی اور آسمان پر نگاہ دوڑائی، جو تمام اطراف میں حیران کن نیلا تھا۔ وہ اپنی غیر مرئی رفتار سے گردش کرنے لگا، عدم میں تحلیل ہوتا ہوا اور اپنے اندر لامتناہی امکانات سمیٹے

ہوئے، کسی رقصاں درویش کی طرح۔

''یہ اصول نمبر چالیس ہے۔'' اُس نے آہستگی سے کہا،''محبت کے بغیر کوئی بھی زندگی کسی شمار میں نہیں۔ خود سے یہ مت پوچھو کہ تمہیں کیسی محبت کی جستجو کرنی چاہیے، روحانی یا مادی، الوہی یا دنیوی، مشرقی یا مغربی... تقسیم مزید تقسیم پر ہی منتج ہوتی ہے۔ محبت کا کوئی نام نہیں، کوئی تعریف نہیں۔ یہ جو ہے بس وہی ہے، خالص اور سادہ۔

محبت آبِ حیات ہے۔ اور محب روحِ آتش ہے!

جب آتش و آب سے محبت کرنے لگے تو کائنات مختلف طور پر محوِ گردش ہوتی، ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگتی ہے۔''

اظہارِ تشکر

ترکی میں (اردو کی طرح) دوست کے لیے دوست کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ استنبول، ایمسٹرڈیم، برلن اور لندن، ہر کہیں موجود اپنے دوستوں کی میں بے حد مقروضِ احسان ہوں۔ بہت سے لوگوں نے اپنی کہانیوں اور خاموشیوں سے مجھے اس ناول کے لیے متاثر کیا۔ میں اپنی ادبی ایجنٹ مارلی روسف (Marly Rusoff) کی بہت مشکور ہوں جسے روزِ اوّل سے میرا یقین ہے اور جو اپنی اس تیسری آنکھ سے مجھے ہمیشہ دیکھتی رہی ہے۔ ڈیئر مائیکل (Micheal Radulescu) کا اس کی مسلسل مدد اور بھروسے کے لیے اور جب کبھی مجھے ضرورت پڑی، موجود رہنے کا بہت شکریہ۔ میں اپنے ایڈیٹر پال سلواک (Paul Slovak) کی ان کی قابل قدر مدد اور باطنی دانش وحکمت کے ساتھ ساتھ ان کے ناگزیر مشوروں کے لیے ممنون ہوں، جب مسودہ استنبول اور نیو یارک کے درمیان سفر کرتا رہا۔

میں دنیا بھر کے صوفیوں کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی، جن سے میں ماضی میں ملی اور جن سے مجھے ابھی ملنا ہے، غالباً مختلف ناموں اور پاسپورٹ والے، لیکن ہمیشہ اس حیرت انگیز صلاحیت کے مالک کہ چیزوں کو دو نقطۂ نگاہ سے دیکھ سکیں، اپنے اور دوسروں کے، دونوں نقطۂ نگاہ سے۔ شکریہ پیاری زینپ، امیر، ہانڈے اور بیزا، اپنے وقت، صبر وبرداشت، دوستی اور مدد وتعاون کے لیے۔ اپنے فیاض دل اور منفرد دوستی کے لیے مرجان دیدے (Mercan Dede) کا دلی شکریہ۔

آخر میں، ایوپ اور میرے بچو، تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے مجھے ایک آوارہ گرد روح سے روشناس کیا، یہ کہ ایسا ممکن ہے کہ کسی ایک جگہ آباد ہو کر بھی آزاد رہا جا سکے۔ اس کتاب کے لیے میں اس سے زیادہ تمہاری مقروضِ احسان ہوں جتنا بیان کر سکوں۔

کتابیات

ناول تحریر کرتے ہوئے مصنفہ نے درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا:

Mathnawi by R. A. Nicholson

The Autobiography of Shams-e-Tabrizi by William Chittick

William Chittick, Coleman Barks, Camille Helminski, Kabir Helminski,

Annemarie Schimmel کی تصانیف

مولانا رومی کی نظموں کے لیے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

The Sufi Path of Love, William Chittick

State University of New York, 1983

A Year with Rumi, & The Essential Rumi, Coleman Barks

Harper Collins, 2001

The Rumi Collection, Kabir Helminski

Shambhala Publications, Boston, 2005

عمر خیام کی نظموں کے لیے Richard Le Gallienne کا ترجمہ استعمال کیا گیا۔

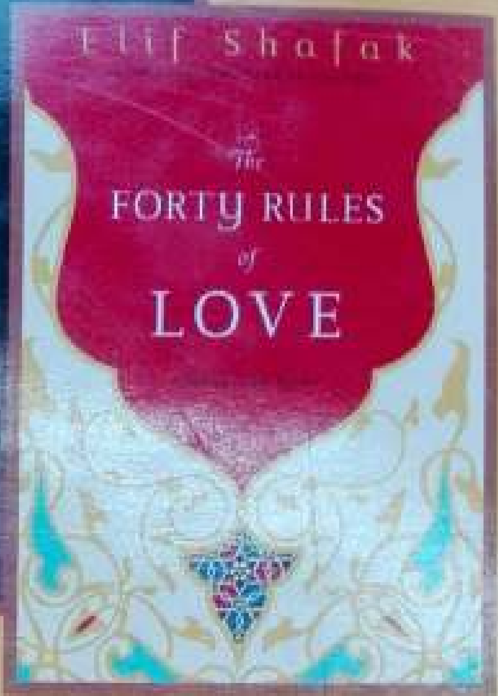
قرآن پاک کے لیے درج ذیل تراجم سے استفادہ کیا گیا:

ایم ایچ شاکر کا ترجمہ، 1993، اور احمد علی کا ترجمہ، شائع شدہ پرنسٹن یونیورسٹی پریس، 2001

✿✿✿

Scanned by CamScanner





ایلف شفق (Elif Şafak) ترکی کی مقبول عام ادیبہ ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں پیش کردہ مشرق اور مغرب کے خوبصورت امتزاج کے باعث دنیا بھر میں معروف ہیں۔ ناقدین کے مطابق، وہ ہم عصر ترکی ادب اور عالمی ادب میں ایک جداگانہ آواز ہیں۔ ان کی تحریروں کے موضوعات میں خواتین، حقوقِ نسواں، اقلیتیں، تارکینِ وطن اور ان کے مسائل، متنوع ثقافتیں، ثقافتی سیاست، تاریخ، فلسفہ اور خصوصاً صوفی ازم سرِفہرست ہیں۔

ایلف شفق کو اُن کے ناول "The Forty Rules of Love" پر عالمی سطح پر شہرت حاصل ہوئی۔ ''چالیس چراغ عشق کے'' اسی ناول کا اردو ترجمہ ہے جو ترکی زبان میں "Aşk" کے نام سے لکھا گیا تھا۔ ناول کی کہانی حقیقت اور تخیل کا امتزاج ہے اور معروف صوفی شاعر جلال الدین رومی اور درویش شمس تبریز کے گرد گھومتی ہے۔ ''چالیس چراغ عشق کے'' دو مختلف زمانوں میں دو ایسی محبتوں کا بیان ہے، جن کی بنیاد تصوف تھی۔ ناول کا مرکزی کردار امریکی ریاست میساچوسٹس میں مقیم ایک گھریلو خاتون ایلا ہے، جس کی زندگی کی ڈگر ایک صوفی درویش سے رابطے پر بدل جاتی ہے۔ ایلف شفق نے انتہاپسندی اور عدم برداشت سے بھری اس دنیا میں مولانا روم اور شمس تبریز کی صورت محبت کی آفاقیت اور انسانیت سے محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اپنے روحانی استاد اور رفیق کی یاد میں، مولانا روم نے اپنے شاہکار شعری دیوان کو ''دیوانِ شمس تبریز'' کا نام دیا۔ ان کی لازوال صوفی شاعری، مثنوی مولوی معنوی کو ''ہست قرآں در زبانِ پہلوی'' کہا جاتا ہے۔

فرخ سہیل گوئندی

http://www.elifshafak.com

ISBN 978-969-652-067-2
9 789696 520672
Jumhoori Publications

Original Urdu Edition